رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2

فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

غیر مسلم دنیا کی عالم اسلام پر یلغار......؟

حاجی محمد یونس صاحب گزشتہ دنوں شکاگو گئے تھے ان کے عزیز انہیں شکاگو کی جامع مسجد اسلامک سینٹر لے گئے جہاں امام صاحب نے حاجی یونس صاحب کو ایک نو مسلم ابو عبداللہ سے ملایا ان کی ایک سی ڈی بھی انہیں دی' جس میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ کیسے اور کیوں کر مسلمان ہوئے۔

امریکی ریاست شکاگو سے تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک پر رونق کاؤنٹی ہے اس کے مکینوں کی اکثریت یہودیوں' امریکیوں پر مشتمل ہے اس کاؤنٹی میں نو مسلم عبداللہ بھی رہتا ہے اس کی خود نوشت میں اس نے بتایا کہ وہ کیسے اور کیونکر مسلمان ہوا اور اپنے آبائی مذہب یہودیت کو چھوڑا؟ اس کے کہنے کے مطابق اس کے تیسرے نمبر کا بھائی جو امریکی فوج میں سپاہی تھا اسے پہلے افغانستان میں پھر عراق میں جنگ کے لیے پوسٹ کیا گیا جہاں اس نے پورے مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ مسلمانوں کا پوری سنگ دلی کے ساتھ صفایا کیا پھر اس کی بربریت کو دیکھتے ہوئے اسے نائیک کے عہدے پر ترقی دے کر ایک بار پھر افغانستان بھیج دیا گیا جہاں وہ اپنی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے القاعدہ اور پھر طالبان کے نشانے پر آ گیا تقریباً دس گولیاں اسے لگیں امریکی بھگوڑے فوجی اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے پھر جانے کب اور کس طرح اسے طالبان اٹھا کر لے گئے جب اسے ہوش آیا تو وہ طالبان کے ایک کیمپ میں تھا جہاں اس کا علاج کیا جا رہا تھا اس کے جسم سے تمام گولیاں آپریشن کر کے نکال دی گئی تھیں اور اسے مسلمان مجاہدین کا بارہ بوتل خون چڑھایا گیا تھا چند ماہ بعد جب وہ تندرست ہو گیا تو وہ ان مسلمان مجاہدین کے رویوں' ہمدردیوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ حیران رہ گیا اس نے مجاہدین کو بتایا بھی کہ اس نے اب تک کتنے مسلمانوں کو قتل کیا ہے اس کے باوجود انہوں نے اپنی مہمان نوازی نہ تو بند کی نہ ہی اس میں فرق آنے دیا۔ جو کچھ وہ خود کھاتے تھے وہ میرے بھائی کو بھی کھلاتے تھے۔ ایک دن جب اس نے ان لوگوں سے وہاں سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا فی الحال ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے' تم فی الحال ہماری قید یا نگرانی میں رہو گے جنگ کے خاتمے پر تمہارے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد اسے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا جہاں میرے بھائی جیسے اور کئی قیدی موجود تھے لیکن وہ سب کے سب پریشان اور حیران تھے کہ وہ کیسے لوگ ہیں جو خود اپنے سے زیادہ ان قیدیوں کا ان کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں جب کہ ان سب کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ جنگی قیدیوں زخمیوں کے ساتھ امریکی فوجیوں کا سلوک کیسا ہیبت ناک ہوتا ہے۔

میرا بھائی ان کے مثبت رویوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ ایک روز ان سے درخواست کی اور یہودیت سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اب وہ مجاہدین کے ساتھ شامل ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ کئی اور امریکی فوجی بھی مسلمان ہو کر مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں۔ میرے بھائی نے تقریباً مجاہدین کے ساتھ دو سال گزارنے کے بعد مجھے ایک طویل خط لکھ کر ساری روداد تحریر کی' میں حیران رہ گیا اس نے مجھے کئی کتابیں اسلام کے متعلق بھیجیں جن سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں' میرے اندر عقیدے کی مذہب کی جنگ چھڑ گئی بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا اور شکاگو کے مسلم علاقے میں پہنچ گیا اور وہاں کے ایک مسلم عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا' انہوں نے ہی میرا نام ابو عبداللہ تجویز کیا' میں نے اپنے پرانے مذہب یہودیت جس پر میرا خاندان کئی نسلوں سے قائم چلا آ رہا تھا اور اسلام کا ہر طرح سے موازنہ کیا' دیکھا سمجھا مجھے اسلام کے اصول و قوانین نے اس قدر قائل کیا کہ میں اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

میں حیران ہوں کہ پوری غیر مسلم دنیا مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے کیسے کیسے حربے استعمال کر رہی ہے صرف امریکی' کلیسا اربوں ڈالر سالانہ اسلام دشمنی میں خرچ کر رہا ہے اور پوری غیر مسلم دنیا کھربوں ڈالر مسلمانوں کے خلاف انہیں اپنا دست نگر بنانے کے لیے خرچ کر رہی ہے کیونکہ امریکہ اور تمام غیر مسلم دنیا نے جنگیں کر کے جنہیں صلیبی جنگ کا ٹائٹل دیا گیا ہے کر کے سبق حاصل کر چکے کہ مسلمانوں سے میدان جنگ میں جنگ نہیں جیتی جا سکتی کیونکہ تمام غیر مسلم صرف اپنی تنخواہوں کے حصول کے لیے لڑتے مرتے ہیں کہ اگر مر بھی گئے تو اس کا حکومت معقول معاوضہ ورثا کو ادا کر دے گی لیکن مسلمان جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو وہ نہ تو کسی لالچ میں آتا ہے نہ روپے پیسوں کے لیے لڑتا ہے وہ تو صرف اللہ کی رضا کے لیے جام شہادت نوش کرنے کے لیے دائمی زندگی کے حصول کے لیے لڑتا ہے اس لیے بے جگری' بے خوفی سے مارتا لڑتا چلا جاتا ہے۔

امریکہ اور اس کے حواری یہ سمجھ چکے ہیں کہ مسلمانوں سے عسکری جنگ کے ذریعے نہیں جیتا جا سکتا اس لیے اب انہوں نے گزشتہ تیس سالوں سے اپنی پالیسی تبدیل کر لی ہے اب ان کا پروگرام بغیر کسی لڑائی کے اقوام عالم کو زیر تسلط رکھنے کے لیے عسکری طریقہ کار کی جگہ زیادہ سے زیادہ نظریاتی یلغار کو موثر کر کے جیتنے کا حربہ بنا لیا ہے' یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں کو ہمیشہ کے لیے فتح کرنے کے لیے امریکہ نے افغانستان و عراق میں بھی اب اپنی عسکری جنگ کو آگے بڑھانے کے لیے صرف چار پانچ ادارے متحرک کر رکھے ہیں جن میں امریکی افواج' نیٹو افواج' ایساف' افغان آرمی' ملی اردو اور جاسوسی کے خفیہ اور ظاہر ادارے ہیں جب کہ نظریاتی یلغار کے لیے امریکہ اور اس کے اتحادیوں' حواریوں کے تقریباً چار سے پانچ ہزار غیر فوجی ادارے جنہیں انہوں نے این جی اوز (NGO) کا سنہرا نام دے رکھا ہے برسر پیکار ہیں' جو افغانستان کے مسلمانوں کو میٹھے زہر کی گولیوں سے مارنے میں مصروف ہیں کیونکہ اب امریکیوں نے یہ پالیسی کے طور پر اپنا لیا ہے کہ بغیر لڑائی لڑے مسلمانوں کو زیر کیا جائے اس طرح امریکی قوم کی جانب سے جنگوں کی مخالفت اور ردعمل سے بھی بچا جا سکتا ہے اور لڑائی کے طویل ہونے کے باعث ہونے والے جنگی اخراجات اور نقصانات سے بھی بچا جا سکتا ہے۔

امریکی تھنک ٹینکوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ جنگی جنون سراسر نقصان کا ہی سبب ہے کیونکہ اب تک جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں وہاں وہاں نقصان ہی اٹھانا پڑا' حاصل بہت کم ہوا اور تسلط تو قائم رہا ہی نہیں اور اب جدید دنیا کے حالات کے پیش نظر کہیں بھی بالجبر تا دیر تسلط یا قابض رہنا ممکن ہی نہیں رہا اس لیے اب NGO کے ذریعے برین واشنگ کے ذریعے نظریاتی قبضہ کرنے کی مہم جوئی شروع کر دی گئی ہے کیونکہ امریکی اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ انہیں ایک نہ ایک دن افغانستان' عراق سے نکلنا ہی پڑے گا اس لیے ہی وہ اپنی عسکری قوت کی جگہ غیر عسکری قوت کو بروئے کار لا رہا ہے' جو افغانستان اور عراق میں مذہبی' سیاسی' سماجی' معاشرتی' تعلیمی' اقتصادی' طبی شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ لاکھوں ڈالر روزانہ خرچ کیا جا رہا ہے جس کے باعث خود امریکہ کی اقتصادیات شدید متاثر ہو رہی ہے۔ کلیسا اپنے محفوظ فنڈ سے مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی جنگ کے لیے تمام عالم اسلام کے خلاف برسر پیکار ہے اور خوب خرچ کر رہا ہے تمام این جی او کو کروڑوں ڈالر دیئے جا رہے ہیں' جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے معصوم اور بھولے بھالے غریب افغان عراق کے مسلمانوں میں لٹا رہے ہیں تا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں انہیں حاصل ہو سکیں اور وہ اپنے مقاصد میں کامیابیاں حاصل کر سکیں اور مسلمانوں کو اسلام سے جتنا دور کیا جا سکتا ہے کر دیا جائے اور اگر کچھ نادان ڈالروں کے لالچ میں آ کر اپنا مذہب اسلام چھوڑ کر عیسائیت اپنا لیں تو کیا ہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم اسلام کو اس کلیسائی یلغار سے محفوظ و مامون رکھے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

> سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ (میری والدہ) ام فضل نے (ایک مرتبہ نماز میں) مجھے "والمرسلات عرفا" پڑھتے سنا تو کہنے لگیں کہ اے میرے بیٹے تو نے یہ سورت پڑھ کر مجھے یاد دلا دیا کہ یہی آخری سورت ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مغرب میں پڑھا کرتے تھے۔
> (بخاری: ابواب صفۃ الصلوٰۃ)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

جس وقت ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں باہر بارانِ رحمت برس رہی ہے۔ ملک کے کونے کونے میں طوفانی بارشوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور نقصانات کی خبریں آرہی ہیں کئی شہر حسب معمول سالہائے گزشتہ کی طرح سیلاب کا شکار ہیں۔ چھتیں گرنے اور کرنٹ لگنے کے واقعات میں اب تک ایک سو سے زائد افراد جاں بحق ہزاروں گھائل اور بے گھر ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے اکثریت ان واقعات کو ناگہانی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ یہ ناگہانی نہیں بلکہ متوقع اور اپنے ہاتھوں تیار کردہ حادثات ہیں۔ ہر سال بارش کے باعث جن علاقوں میں یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے اگر ہم چاہیں تو ان حادثات اور واقعات کا سدباب کر سکتے ہیں لیکن ہم اور ہمارے حکمران ان وجوہات کو دور کرنے پر تیار نہیں یوں اللہ کی رحمت زحمت ثابت ہو رہی ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق مستقبل میں کرہ ارض پر پانی کی کمی کا سامنا کرنا ہوگا اور جنگیں پانی کے حصول کے لیے ہوں گی مگر ہم ہیں کہ اپنی دھرتی پر جہاں قدرت کے سارے موسم دستیاب ہیں۔ اس پانی کو ذخیرہ کرنے پر تیار نہیں۔ بلکہ ایسے منصوبوں پر سب سیاست ہی کر رہے ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ' جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے الزام تراشی پر سب متفق ہیں کہ وہ ہم پر عذاب برپا کر رہا ہے۔ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحات کشید کر کے اس پہلو پر ضرور غور کیجیے گا کہ آج کل جو حالات ہمیں درپیش ہیں کیا اس کے ذمہ دار ہم خود نہیں......!

سیلابی بارش کے ساتھ مہنگائی کا سیلاب بھی ملک میں عروج پر ہے' پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں' ملک میں ہر چیز کے داموں میں ہوش رُبا اضافہ ہو رہا ہے اور ساتھ ہی روپے کی قدر میں روز بہ روز کمی آ رہی ہے' امریکی ڈالر کی قدر میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ رسالہ کی تیاری میں تمام سامان برآمد کیا جاتا ہے تو ہم اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آگے امریکی الیکشن بھی ہونے والے ہیں تو کاغذ و دیگر اشیاء کے نرخ میں مزید اضافے کا امکان ہے۔ ارادہ تو یہی ہے کہ قیمت میں اضافہ کر دیا جائے مگر عوام پر پہلے ہی مہنگائی کا جن براجمان ہے اس پر رسالہ کی قیمت' فی الحال قیمت میں اضافہ کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی مارکیٹ میں موجود دیگر رسائل کی قیمتوں میں صرف نئے اُفق واحد رسالہ ہے' جس کی قیمت ابھی تک 40 روپے ہے' دیکھتے ہیں کہ کب تک برداشت کر سکتے ہیں۔

نازِ سلوش دشے...... میر پور آزاد کشمیر۔ محترم عمران بھیا بعد از آداب میری تمام تر دعائیں آپ کے اور قارئین نئے افق کے لیے۔ امید ہے ماہ رمضان اور اس کے بعد ایام عید سب کے اچھے گزرے ہوں گے۔ اس بار نئے افق شاید 13 یا 14 اگست کو موصول ہو گیا تھا۔ مگر سستی کے باعث روز آج کل کرتے کرتے تبصرے کا یہ دن آنا پہنچا۔ سب باتوں سے قبل عمران بھیا آپ کو اور آپ کے ساتھ جانے والوں کو میری طرف سے عمرہ مبارک۔ (یقیناً آپ نے وہاں میری گمشدہ کہانی کے بارے میں دل سے دعا کی ہوگی)۔ اللہ پاک یہ سعادت ہر مسلمان کو عطا فرمائے آمین۔ مجھے تو ٹائٹل ہر بار کی طرح منفرد بھی لگا اور خوب بھی۔ بقول شاعر۔

کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے

مگر انعم نے تنقیدی نگاہوں سے اتنا ضرور کہا۔ "لو جی عمران بھائی نے اس بار "تالوں" کو بھی نہیں چھوڑا۔ خیر چھینا جھپٹی کے بعد میں رسالے کی حقدار ٹھہری اور موقع ملتے ہی سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ مشتاق انکل کی دستک نے دل مضمحل کر دیا کوئی امریکا اور

بھارت سے پوچھے بھئی تم کو اپنے وطن میں آرام نہیں ہے کیا؟ شاہراہ قراقرم جسے میں شاہراہ ریشم کے نام سے جانتی ہوں ان دونوں ممالک کے گلے میں پھنسی ہڈی کی مانند ہے جسے نہ وہ نگل سکتے ہیں اور نہ اگل سکتے ہیں۔ رہی بات گلگت میں خفیہ تنظیموں کی تو لیجیے ایک پراجیکٹ میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔ USAID کا نام تو یقیناً آپ سب نے سنا ہوگا۔ امریکی عوام کی طرف سے امداد۔ ایک طرف تو امریکا ڈرون حملے کر کر کے ہماری سرزمین کو خون میں رنگ رہا ہے دوسری طرف یہی امریکا یو ایس ایڈ کا سہارا لے کر پاکستانی عوام کے دل جیت رہا ہے۔ مگر ان کا رونا کیوں روئیں جب گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھانے پر آ جائے تو اندر کے لوگ کیا کریں۔ اچھا تو بات چل رہی تھی پراجیکٹ کی قریباً 7,6 ماہ قبل امریکا نے پاکستان کے ہونہار طلبہ کو اسکالرشپ کی آفر کی۔ یہ 6 ماہ پر مشتمل اسکالرشپ ایگریکلچر کے شعبے سے متعلق تھی۔ جس کے لیے 4 ہزار سے اوپر طلبہ نے حصہ لیا اور آخرکار 400 منتخب ہوئے۔ ان 400 میں سے ایک بھاری تعداد گلگت' ہنزہ وغیرہ کی تھی۔ خود ہمارے نیچے والے پورشن میں رہائش پذیر ایک گلگتی فیملی کی بیٹی جو فیصل آباد میں ایگریکلچر یونیورسٹی کی طالب علم تھی۔ 8 اگست کو پہلے 200 طلبہ کے ساتھ امریکا روانہ ہوئی۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ وہ کلچرل سیٹ پر منتخب ہوئی ہے۔ اب اس سب کا پس مردہ مقصد کیا ہوگا؟ یہ مجھ سے بہتر آپ جانتے ہو۔ میں صرف اتنا کہوں گی اگر یہی مواقع ہمیں اور ہمارے طلبہ کو پاکستان کے اندر ملیں تو ہمارے بہترین طلبہ اور بہترین ذہن باہر کیوں جائیں۔ گفتگو میں 15 رمضان المبارک اور فتح مکہ کے بارے میں پڑھا اور شرمندگی سے سر جھک گیا کہ خود کو مسلمان کہنے کے باوجود یہ علم نہیں تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے جس جس جگہ فتح مکہ کا پڑھا اس کے ساتھ 15 رمضان نہیں پڑھا۔ لیجیے پوری گفتگو میں میرا خط ندارد' آپ خود بتایئے اتنی دیر لگا کر خط لکھا جائے پھر وہ شائع بھی نہ ہو تو غصہ تو آئے گا۔ مجاہد ناز عباسی' محمد فہد' سید عبداللہ شاہد' لنگاہ فیملی اور ابن مقبول انکل آپ سب کا بے حد شکریہ۔ جو مجھ ناچیز کا خیال رکھا۔ بس آپ سب سے گزارش ہے کہ پلیز میری گمشدہ کہانی "شہر آزار" کے لیے دل سے دعا کریں کہ وہ مل جائے کیونکہ وہ شاید ڈاک کی نذر ہو گئی ہے۔ کئی تو کہتی ہے کہ اس کو بھول کر اپنے نئے پراجیکٹس پر توجہ دو۔ مگر گزشتہ دو ماہ جب سے مجھے علم ہوا ہے کہ وہ کہانی نئے افق کے دفتر سے گم ہو گئی ہے (حالانکہ وہ رجسٹری کروائی تھی) میں نے لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ دل ہی نہیں کرتا کہ کچھ لکھوں حالانکہ بہ یک وقت میں نے 5,4 ناول شروع کر رکھے تھے۔ خورشید پیرزادہ "بلاوا" ذرا مختلف انداز میں لکھی جا رہی ہے' اچھی لگی غالباً عید پران کا کوئی ڈراما بھی چلا تھا پی ٹی وی پر خوب۔ "فتنہ" ایک منفرد کہانی تھی۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس میں آئی کیو لیول کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے اتنا تو سوچ ہی سکتا ہے۔ "ڈراپ سین" ہاہاہا' جیسے کو تیسا ٹکرا ہی گیا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ "ناگہانی آفت" ناظم بخاری کی بہت الگ کہانی تھی۔ آخر وقت تک ایک تجسس سر پر سوار رہا۔ ان کی آخری لائن' ان کی کہانی ختم ہو گئی اور جب کہانی ختم ہو جائے تب پڑھنے کے لیے کچھ نہیں رہتا' نے دل لوٹ لیا ویل ڈن۔ شہنی کی "سچا خواب" بھی اعلیٰ تحریر تھی۔ پر اس بار خط کیوں نہیں لکھا۔ "ہیروئن" بہت خوب' بہت عمدہ کہانی تھی۔ بری آتما' کندن' بھائی جان' آفت رسیدہ' ستم اور گنگا کے پجاری بھی زبردست رہیں۔ اللہ حافظ۔

این شاہین...... کراچی۔ محترم عمران بھائی! فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ نے بہت پیاری حدیث پیش کی شکریہ۔ اب تو ہر بچے بچے کی زبان پر بھی صرف گانے ہی ہوتے ہیں جو کہ دکھ اور افسوس کی بات ہے اور سوائے گناہ کے جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس بار کا شمارہ 14 اگست کو ہی مل گیا تھا مگر چونکہ اعتکاف میں تھی اس لیے چاندرات کو پڑھنا شروع کیا اور عید کے دوسرے دن مکمل بھی کر لیا اور اب ہم گفتگو میں حصہ لینے بیٹھ گئے۔ خیر آپ نے بات کی فتح مکہ کے دن کی تو ہم نے تو مبارک باد دی تھی سب جاننے والوں کو اور یاد بھی دلا دی اس دن کی۔ "بازی گر" کا انتظار رہے گا پھر بھی اور اے حمید صاحب کے ناول کے لیے شکر گزار ہوں کیونکہ ان کی تمام تحریریں مجھے بے حد پسند ہیں۔ اب گفتگو کی طرف بڑھتے ہیں۔ عمران بھائی کرسی صدارت دینے کا بے حد شکریہ۔ مجاہد ناز صاحب سلام آپ نے بالکل بجا لکھا ہے کراچی کے حالات کے بارے میں' رمضان جیسے بابرکت مہینے میں جرائم کی وارداتوں کا سلسلہ نہیں رو کا گیا یہاں تک کہ 30 رمضان کو بھی وارداتیں جاری رہیں۔ قتل و غارت' لوٹ مار اور بوری بند لاشوں کے تحفے بھی دیے گئے اور بہت کچھ جانے ایسا کرنے والوں کو خوفِ خدا کیوں نہیں جو دوسروں کو خوف زدہ رکھتے ہیں۔ دعا ہی کر سکتی ہوں جو کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ اللہ پاک سب کو ہدایت دے۔ ریاض انکل! سلام اس بار آپ کی کوئی تحریر نہیں خیر تو ہے۔ فہد بھائی! اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے آمین۔ سلام پیش خدمت ہے اچھا تو نہیں کیا آپ نے مگر خیر...... ایم خان وعلیکم' عبداللہ شاہد صاحب! سلام تبصرہ خوب کیا۔ لنگاہ فیملی سلام مسنون نظم "اے اجنبی" پسند کرنے کا

شکریہ۔ عبدالمالک کیف صاحب! اپنے ہی خط میں خود کو شامل ہونے کی یاددہانی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ صدیقی صاحب! اسلام۔ شہناز آنی! اب کی بار پھر آپ غائب ہیں اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال لیجیے۔ اس عید پر آپ کی طرف آنا چاہ رہی تھی مگر کچھ تو طبیعت ناساز تھی اور اعتکاف کی مبارک باد کے لیے بھی سب کا آنا جانا لگا تھا اور سب سے بڑی بات کہ آپ کا ایڈریس ہی نہیں میرے پاس (سوچا تھا عمران بھائی سے لوں گی مگر) خیر سلام اور مبارک باد۔ جو رائٹر گفتگو میں شامل نہیں ہیں ان سب کو بھی سلام۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے صبر وشکر کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان تحریر کیے ہیں مگر دکھ تکلیف میں صبر کوئی بھی نہیں کرتا اور خوشی کے موقع پر کوئی بھی شکر نہیں کرتا شاذ ونادر ہی لوگ ہوں گے جو ایسے کرتے ہیں۔ خورشید پیرزادہ کا ناول واقعی سنسنی خیز رہا۔ راحیلہ تاج کے فتنہ کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی نجانے اس بچے نے ایسا کیوں کیا۔ اسرار احمد کی ڈراپ سین میں لیری واقعی پرفریب تھا اتنا شاطر۔ "ناگہانی آفت" ناظم بخاری کی زبردست تھی پچی میں کوئی اپنے انجام کا نہیں سوچتا کہ کب کس وقت اور کیسے موت آجائے گی اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ "سچا خواب" شہنی صاحبہ کی انتہائی سبق آموز تھی آئندہ بھی ایسی تحریریں تحریر کرکے لوگوں کی اصلاح کرتی رہیے گا۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔ گفتگو میں بھی حاضر رہنے کی کوشش کیا کریں سلام میری طرف سے اور دعاؤں کی متمنی۔ "ہیروئن" اقبال بھٹی صاحب کی اس ہیروئن کے بارے میں شاید ہی کسی نے سوچا ہو۔ "بری آتما" کا انجام خلیل جبار کی واقعی میں پسند آئی اور اگر ہم کلام پاک اسماء الحسنٰی وظائف اور اوراد سے مدد لیں تو ہمیں کسی عامل کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ آزمائی ہوئی بات ہے اور مجھ جیسی بیمار کو دوران اعتکاف اس بات کا خوب اندازہ ہو چکا ہے۔ کندن محمد ثاقب صاحب کی بے حد پسند آئی اس تحریر پر مبارک باد۔ "بھائی جان" سلمٰی غزل کی پروفیسر صاحب نے بھائی جان کو خوب اچھا جواب دیا۔ "گردش" شہناز بانو صاحبہ کی خوب گردش میں ہے۔ ایک کا سراغ تو لگ گیا تھا مگر اب یہ میڈم روزی بھی ٹپک پڑیں۔ "آفت رسیدہ" محمد سلیم محسوس کرلیا اس کو ہم نے بس۔ محمد اعظم صاحب کی "ستم" میں واقعی ستم ہوا اور آئے دن ایسے بے شمار ستم ہوتے رہتے ہیں۔ بلاخوف خدا اور پھر ایسے ستم کی وجہ سے ہی جرم اور جرم سے مجرم وجود میں آتے ہیں انتقامی کارروائی کی وجہ سے۔ روحانی مسائل بھی بہت اچھا جارہا ہے اور اس بار اسماءالحسنٰی کا سلسلہ کہاں غائب ہو گیا۔ خوشبو سخن میں فہد محمد وسیم اختر، طاہرہ جبیں، ریاض حسین، پروفیسر صاحب، عبدالمالک کیف صاحب، اسلم جاوید، ریحانہ سعیدہ اور اسماء سحر کی تحریریں پسند آئیں اور ذوق آگہی پورے کا پورا زبردست رہا اور اے حمید کے ناول کی تو بات کرچکی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ دعاؤں کی طلب گار۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور۔ عمران بھائی السلام علیکم! ستمبر 2012ء کا نئے افق عید کے دوسرے روز لیا۔ بہترین سینری سے مزین ٹائٹل عمدہ کتابت، سفید کاغذ کا استعمال، پرائز کے مواقف تھا یہ سب۔ روحانی مسائل کا حل میں آپ نے کوپن کا ذکر کیا ہے کوپن تو ماہنامہ آنچل میں شائع ہوتا ہے اس طرح نئے قارئین کوپن نئے افق میں ڈھونڈتے رہیں گے۔ واضح طور پر اشارہ دے دیا کریں کہ کوپن آنچل سے لیا جاسکتا ہے۔ اس طرح نئے قارئین مفت کی پریشانی سے بچ جاتے ہیں۔ "دستک" میں کچھ توجہ ادھر بھی کا مطالعہ کیا۔ دو صفحے کے اس مضمون نے دماغ ہلا کر رکھ دیا۔ بھارت واقعی ہمارا کھلا دشمن ہے۔ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کشمیریوں پر ظلم وستم سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن ملک ہمیں جنگ کے لیے للکار رہا ہے۔ مگر اب عیاش فطرت حکمرانوں کی غیرت مر کر بحرالکاہل کی نذر ہو چکی ہے۔ اس ملک سے ہمارے حکمرانوں کے دوستانے عشائیے، ظہرانے، تجارت سب کچھ ہو رہا ہے مگر کشمیری بھائیوں پر ظلم وستم کی طرف کوئی بات کا رخ نہیں موڑتا۔ ہمارے کرپٹ سیاست دانوں اینڈ حکمرانوں کی بھارت میں دال نہیں گلتی نہ ہی یہ دال گلتی نظر آرہی ہے۔ بھارتی حکمران دال دیگچے میں ڈال کر نیچے سے آگ کھینچ لیتے ہیں۔ نہ پانی میں ابال آئے گا نہ دال گلے گی۔ ویسے اب ہمارے حکمرانوں کے خون میں بھی ابال نہیں ہے۔ دولت، اقتدار اور عیاشی نے روز آخرت کا حساب ان کے دلوں سے محو کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مشکلات حل فرمائے آمین۔ سوائے اللہ پاک کے کسی کے پاس دنیاوی مسائل کا حل نہیں ہے۔ روز قیامت دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔ اللہ پاک کا فرمان ہے کسی پر تل برابر زیادتی نہ ہوگی۔ اللہ پاک کا نظم ونسق بہت مضبوط ہے۔ اس سے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں جو زیادہ کرپٹ ہوگا راشی ہوگا اس کا اسی تناسب سے حساب ہوگا۔ بلاشک اللہ کا عذاب بڑا ہی تکلیف دہ ہوگا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس عذاب کو جھیلنے میں کسی میں سکت طاقت نہیں۔ اللہ پاک ہمیں اپنے عذاب سے بچائے اور ایمان کی دولت سے سرفراز فرمائے آمین ثم آمین۔ کچھ لوگ خط وکتابت کے بکس نمبر پر کہانیاں بھیج دیتے ہیں وہ کہانیاں یقیناً ضائع ہوجاتی ہیں کیونکہ میں نے دو کہانیاں بکس نمبر 874 پر بھیجی تھیں۔ وہ شائع

نہیں ہوئیں برائے مہربانی اشتہار کے ذریعے آپ مصنفین کو مطلع فرمائیں کہ کہانیاں دفتر کے پتے پر بھیجی جائیں۔ اس طرح کہانیاں ضائع نہیں ہوں گی۔ دستک کے بعد آخری صفحات کی کہانی گنگا کا پجاری کی پہلی قسط پڑھی۔ اے حمید مرحوم کا لکھنے کا انداز جداگانہ ہے۔ یہ کہانی انہوں نے عمدہ پیرائے میں لکھی ہے۔ جنگل، جھیلیں، ریلوے اسٹیشن، مندر، پجاری، ڈاکو رام دلاری بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔ رام دلاری کو ڈاکوؤں کے جنگل سے اور قاسم بھائی کی بیٹی کو مندر کی کوٹھڑی سے رہائی مل چکی ہے۔ کہانی پرتجسس ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مغربی ادب سے فتنہ پڑھی۔ اینٹ سے کیلا فروش کو قتل کرنے والے بچے نے دو بلیک میلر بچوں پر دو اینٹیں گرادیں۔ چونکا دینے والا انجام تھا۔ مغربی ادب کی دوسری دونوں کہانیاں ڈراپ سین اور ہیروئن بھی لاجواب کہانیاں ہیں۔ ہیروئن دیسی کہانی ہے۔ گفتگو میں آپ کی طرف سے (عید مبارک کے ساتھ یوم آزادی مبارک) عنوان سے قرآن پاک اسی ماہ مکمل ہوا اور 15 تاریخ کو مکہ فتح ہوا۔ واقعی اس طرح کے پیغامات موبائل پر لوگ نہیں دیتے۔ لوگوں کی توجہ واہیات لطیفوں کی طرف مبذول ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے اس دفعہ بازی گر کی قسط شائع نہ کرنے کا آپ نے عندیہ دے دیا ہے خیر ان شاءاللہ اگلے ماہ سہی۔ این شاہین صاحبہ، مجاہد ناز عباسی، ریاض بٹ، محمد فہد ایم خان، سید عبداللہ شاہد، فقیر محمد بخش صابر لنگاہ، عبدالمالک کیف، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ان سب دوستوں کے طویل تبصرے خوب تھے۔ ان سب دوستوں کو عید مبارک جو گزر چکی ہے۔ خورشید پیرزادہ صاحب اچھے رائٹر ہیں۔ بلاوا میں روبن پرکاش کی نوک جھونک نے عمران سیریز ناولوں جیسا مزہ دیا۔ دونوں نے پوری کہانی یعنی قسط میں کافی تو تکار کر مظاہرہ کیا۔ اسرار میں ڈوبا ہوا یہ ناول پرتجسس ہے۔ نیرو ایک پراسرار لڑکی کا کردار ہے۔ تالاب کے پاس ویرانے میں پراسرار لڑکے کا نظر آنا۔ واپسی پر کار کی ہوا نکلنا، صبح کو تمام پہیوں میں ہوا، پراسرار بوڑھے کا ملنا۔ شروتی کا کالج جانا۔ نیرو بھی شروتی۔ کہانی اسرار کی پیچیدگیوں میں الجھی ہوئی ہے۔ گردش کی قسط نمبر 13 بھی ہنگامہ خیز رہی۔ دیسی ادب کی تمام کہانیاں لاجواب ہیں۔ سچا خواب، بری آتما، کندن، بھائی جان، آفت رسیدہ، ستم اچھی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ روحانی مسائل اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے دوسرے قارئین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس دفعہ کی تمام غزلیں خوشبو سخن میں بہترین لکھی گئی ہیں۔ ان شاءاللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔ فی امان اللہ۔

ایم خان...... لانڈھی، کراچی۔ السلام علیکم مکرمی عمران بھائی۔ میری طرف سے تمام لوگوں کو سلام اور دعائیں۔ اس مرتبہ نئے افق 14 اگست کو ہی مل گیا تھا اور عید کی وجہ سے چھٹیاں بھی تھیں تو اس بار چند کہانیاں پڑھ لیں جن میں ناظم بخاری صاحب کی ناگہانی آفت، شہنی ارشاد کی سچا خواب، اقبال بھٹی کی ہیروئن اب تک پڑھ پایا ہوں اور یہ تمام کہانیاں بہت زبردست اور بہت پیاری ہیں۔ میری طرف سے ان سب رائٹرز کو دعائیں اور مبارک باد اللہ زور قلم اور زیادہ کرے اور ہم سب کو ہدایت اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں اس بار عمران بھائی نے جو خطوط شامل کیے ان میں کرسی صدارت پر این شاہین تشریف فرما ہیں آپ کو میری طرف سے سلام اور دعائیں اور مجاہد ناز نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ کراچی کے حالات ایسے ہیں کہ ہر پل جان جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور وہ بھی بنا کسی قصور کے اور چھینا جھپٹی، موبائل اور نقدی وغیرہ چھن جانا روز کا معمول ہے اور اب تو خواتین بھی اس کام میں اس حد تک شامل ہیں کہ رمضان کے دوران شاپنگ کرنے والی خواتین اور حضرات کو مکمل طور پر لوٹ لیا یہاں تک کہ سودا سلف بھی نہیں چھوڑا گیا کسی کے پاس اور مزاحمت کے دوران ایک خاتون کو تو شوٹ کردیا گیا اس کے ہاتھ اور کان تک کاٹ لیے اللہ ہم سب کی جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت فرمائے آمین۔ اللہ حافظ

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم! ستمبر 2012ء کا شمارہ 13 اگست کو وصول پاکر دلی خوشی ہوئی۔ طاہر احمد قریشی صاحب نے اقرا میں دل کے دروازے کھول کر رکھ دیے اور معلومات کا خزانہ نصیب ہوا۔ "روحانی مسائل کا حل" دکھی دلوں کی پکار اور علاج کے سلسلہ میں ادارہ نئے افق نے شروع کرکے عوام کی ایک طرح کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلسلہ وار داستانوں میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ کی قسط نمبر 13 اور محترم اے حمید کی تحریر "گنگا کا پجاری" جس کی اول قسط پڑھنے کو ملی۔ ان دونوں تحریروں کے سلسلہ میں بس اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ان میں جہاں جادوگری ہے تیزی ہے میلان کی برقراری ہے محبت ہے تو ساتھ میں نفرت بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ ایک قسم کا سسپنس ہے کہ اب کیا ہوگا یا کیا ہونے والا ہے۔ خورشید پیرزادہ کی ناول نما تحریر "بلاوا" سنسنی خیز رہی۔ جس کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ضلع لودھراں کا شہزادہ سید ناظم بخاری اپنے ناول "ناگہانی آفت" کے ساتھ انسان کی سوچ اور فیصلہ خداوندی میں فرق چلا آرہا ہے۔ منصوبہ بنا تو لیا جاتا ہے مگر اس کو پورا کرنا خدا پاک کا کام ہے۔ کہانی میں سسپنس ہے۔ سبق آموز تحریر رہی پسند آئی۔ ناظم بخاری صاحب دلی

مبارک باد۔ اس دفعہ طاہرہ جبین تارا٬ ریاض بٹ٬ ناز سلوش ذشے٬ فریدہ گیلانی کی کوئی بھی تحریر پڑھنے کو نہ ملی حالانکہ خوشبوئے سخن میں ان میں سے کچھ چہرے ملے پر داستانوں کا رنگ ہی کچھ اور اور وہ بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب آخر میں آتا ہوں عزیز بہن بھائیوں کی بزم گفتگو کی طرف۔ گفتگو ملاپ ہے دور رہنے والوں کا۔ عید مبارک کے ساتھ یوم آزادی مبارک پڑھا جو کہ ایک سبق آموز تحریر کے رنگوں میں تھا کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے۔ وقت انہیں تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔ اے حمید صاحب کی تحریر سونے پر سہاگہ کا رنگ لیے ہوئی ہے۔ صدارتی کرسی پر براجمان صاحب زادی این شاہین صاحبہ کبھی کراچی اور کبھی منگلا ڈیم کے سفر میں آپ تو فقیر بابا کو بھول سکتی ہیں مگر فقیر بابا نہیں۔ میں نے اپنی ہر تحریر میں آپ کو عالیہ انعام الہٰی کو طاہرہ جبین تارا کو سسٹر شہناز بانو و فیملی کو صاحبزادی شبنی ارشاد صاحبہ کو یاد رکھا۔ مگر عمران احمد صاحب نے اپنی مہربانیوں کے طفیل مراسلہ کے اس حصہ کو حذف کر کے شمارہ میں شامل ہی نہیں کیا۔ میری اور میرے کنبہ کی طرف سے آپ سب کو سلام دعا اور عید مبارک کا پیغام۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم لائق صد احترام جناب عمران احمد صاحب اور نئے افق کا اسٹاف سلام مسنون اور عید مبارک۔ ماہ ستمبر کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ عید مبارک کا پیغام لیے ہوئے میرے سامنے ہے۔ دستک میں بزرگوار جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔ ویسے تو سب کافر ہی پاکستان کے دشمن ہیں مگر بھارت ان میں سر فہرست ہے۔ لیکن ہم اس بات کو سمجھ نہیں رہے ہم ہمیشہ اپنے اس ازلی دشمن سے پیار کی پینگیں بڑھانے کی بات کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ اور شعور عطا فرمائے آمین۔ اقرا٬ میں جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے احادیث کی روشنی میں صبر و رضا کی اہمیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔ اسماء الحسنیٰ بہت اچھا سلسلہ ہے اس ماہ اشاعت نہیں پلیز اسے بندمت کیجیے گا۔ گفتگو میں محترمہ این شاہین صاحبہ بہت اچھی اور پیاری باتوں کے ساتھ کرسی صدارت پر متمکن ہیں۔ این شاہین صاحبہ بہت بہت مبارک۔ مجاہد ناز عباسی صاحب عید مبارک دینے کا شکریہ۔ آپ کو اور تمام قارئین کو میری طرف سے دلی عید مبارک۔ محمد فہد بھائی یہ جمہوریت کا نظام ہمارے ملک میں قابل عمل نظام نہیں ہے۔ برادری بیس اور کلاشنکوف کے زور پر الیکشن جیتنے اور پھر ایک عرصے کے لیے ہم پر مسلط ہو جاتے اور من مانی کرتے ہیں غریبوں کے خون پر پل کر اتنے تگڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کا بال بیکا نہیں ہوتا پھر نہ انہیں خدا یاد ہوتا ہے نہ خدا کے رسول یاد ہوتے ہیں۔ خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔ جناب سید عبداللہ شاہد صاحب حسب روایت طویل مگر جاندار تبصرے کے ساتھ تشریف لائے بہت خوب شاہد بھائی۔ غزل پسند کرنے پر بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ کے مسئلہ کی تائید لازمی تھی۔ عمران صاحب ویسے تو سب لکھاریوں کا ایک جیسا خیال کرتے ہیں بس کچھ مجبوریاں آڑے آ جاتی ہوں گی۔ محترم و مکرم جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب کی ناسازی طبیعت کا پڑھ کر بہت فکر مندی ہوئی۔ رب کریم کا شکر ہے کہ اس شافی مطلق نے انہیں شفا عطا فرمائی خدائے لم یزل ہمیشہ ان پر صحت و تندرستی کے پھول برساتا رہے آمین۔ عبدالمالک کیف بھائی ہم گفتگو کے لیے چٹھی تو ہر ماہ ڈال دیتے ہیں جو سیاں جی کے نام ہوتی ہے مگر رقیب محکمہ ڈاک کبھی کبھی ہاتھ دکھا جاتا ہے۔ کیف بھائی آپ کی تجویز نہایت ہی مناسب ہے کہ ہر ماہ ناقابل اشاعت تحریروں کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے تو بہت سے لوگ انتظار کی کوفت سے بچ جائیں گے اور عمران صاحب بھی کافی حد تک بے فکر ہو جائیں گے۔ امید ہے عمران صاحب کہیں نہ کہیں سے ایک صفحہ کھرچ مرچ کر نکال لیں گے۔ محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب بھی بڑے جاندار تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ابن مقبول جاوید بھائی غزل اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طویل خطوط کی اشاعت کے بارے میں بات تو آپ نے میرے منہ سے چھین لی۔ دراصل ہم قارئین کو ہی اتنے لمبے خطوط نہیں لکھنے چاہیے عمران صاحب اس میں اگر کانٹ چھانٹ کریں گے تو خطوط میں لکھی گئی بات میں ربط نہیں رہے گا۔ آپ نے خوشبوئے سخن کا خوب مطالعہ کیا ہے اور اس پر بھرپور تبصرہ کیا ہے لوگ یا تو خوشبوئے سخن کا مطالعہ نہیں کرتے یا اس پر تبصرہ فرمانا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ شاعری کرنا نثر لکھنے سے زیادہ مشکل ہے لہٰذا سب ساتھیوں کو چاہیے کہ وہ خوشبوئے سخن کا ذوق شوق سے مطالعہ کیا کریں اور اپنے تبصروں میں اسے شامل کیا کریں۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ اس بار بھی محترمہ شہناز بانو گفتگو میں تشریف نہیں لائیں۔ انہیں باقاعدگی سے حاضری لگواتے رہنا چاہیے۔ جناب عبداللہ عاطر صاحب بھی گفتگو میں تشریف نہیں لا رہے۔ وہ واپڈا منگلا میں بطور سپرنٹنڈنگ انجینئر کام کر چکے تھے اب ان کی ترقی بطور چیف انجینئر ہو گئی ہے اور وہ تربیلہ تشریف لے گئے ہیں۔ بہت ہی خلیق ملنسار اور نیک افسر ہیں۔ اب اتنی بڑی پوسٹ پر کام کرتے فرصت بھی تو بہت کم ملتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔ خوشبوئے سخن میں عصمت اقبال عین٬ وسیم اختر٬ طاہرہ جبین تارا٬ صبیح جمال٬ میثم علی آغا٬ ناز سلوش ذشے اور سید عبداللہ شاہد کا کلام خوب

رہا۔ ذوق آگہی کا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔ محترمہ شہناز بانو کی گردش خوب جا رہی ہے۔ محترم اے حمید صاحب کی گنگا کے پجاری کی پہلی قسط بہت اچھی رہی۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال السلام علیکم! ماہ ستمبر کا شمارہ 26 اگست کو ملا۔ شاید پرچے نے ڈاک کے ڈبے (ریل گاڑی کے ڈبے) میں عید کی۔ بہرحال جونہی پرچا آیا بک اسٹال سے گھر لے آئے۔ سرورق خوب صورتی کے لحاظ سے خوب لگا بلکہ باقی رسالوں سے انفرادیت لیے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی۔ بھارت نے واقعی کبھی بھی پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ پاکستان کو اندر سے کھوکھلا اور غیر مستحکم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ آبی جارحیت بھی وہ بڑے طمطراق سے کر رہا ہے۔ خدا ہی ہمارے ملک کی حفاظت کرے آمین ثم آمین۔ اب بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف سب سے پہلا خط ہے این شاہین بہن کا٬ بہن آپ کا تبصرہ کافی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ اتنا مفصل اور خوب صورت تبصرہ تحریر کرنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔ میں مایوس تو کبھی نہیں ہوا۔ البتہ کبھی کبھی بے تاب ضرور ہو جاتا ہوں۔ جو میرے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ مجاہد ناز عباسی صاحب آپ کی باتیں دل کو دکھی کر رہی ہیں۔ انسان کا خون اتنا ارزاں بھی ہو سکتا ہے؟ مجھے جشن آزادی اور عید الفطر پر یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ محمد فہد صاحب آپ نے سرورق پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے؟ ویل ڈن بھائی واقعی لگتا ہے کہ بزم سخن بند کر دیا گیا ہے۔ وجہ تو عمران بھائی ہی بتا سکتے ہیں۔ ایم خان جی آیا نوں۔ آئندہ بھی آتے رہیے گا۔ سید عبداللہ شاہد آپ مجھے یاد رکھتے ہیں جس کے لیے یہ بندہ ناچیز ممنون اور دعا گو ہے۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب شکر ہے کہ اب آپ رو بہ صحت ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور وہ باری تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش خرم رکھے آمین۔ رسالہ لیٹ ملا اس لیے قسط وار کہانیوں کے علاوہ باقی کہانیوں پر تبصرے سے ہم محروم رہ گئے۔ خیر کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے۔ عبدالمالک کیف یاد آوری کا شکریہ۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اس بار آپ کے گلے شکوے دور کرنے کے لیے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اب تو مسکرا دیجیے۔ یہ ہوئی نا بات٬ میری کہانی محبت کی سیڑھی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ارے بھائی ایک غلطی ہو گئی این شاہین صاحبہ میری کہانی محبت کی سیڑھی کو سب کہانیوں سے منفرد کہنے کا اور پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ بہن آپ نے بھائی کا مان بڑھا دیا ہے۔ اس بار بہن شہناز بانو عالیہ انعام اور شبنی ارشاد غیر حاضر ہیں۔ فوراً حاضری لگوائیں۔ بھائیوں میں ناظم کو بھی کہا جاتا ہے کہ فوراً آ جائیں۔ ورنہ جرمانہ ہوگا۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سچ بیانیاں سب ہی بہت اچھی اور خوب صورت ہیں۔ پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں۔ فتنہ ڈراپ سین اور ہیروئن بھی پسند آئیں۔ ناظم بخاری کا ناول "ناگہانی آفت" ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو اس تاریک دور میں بھی حق کا چراغ جلائے ہوئے ہے بہت خوب بھائی ناظم بخاری۔ قسط وار کہانی گردش بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شہناز بانو کا قلم رواں دواں ہے۔ اے حمید کی "گنگا کا پجاری" کی کیا تعریف کریں٬ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اب ذرا بات ہو جائے ذوق آگہی کی۔ سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے لیکن عفان بھائی گزشتہ تین ماہ سے میرا انتخاب شائع نہیں ہو رہا۔ کیا وجہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت۔ یار زندہ صحبت باقی۔

محمد فہد...... جتوئی سلام باشد! کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ امید ہے کہ کافی خوش ہوں گے۔ سب سے پہلے تو خاکسار ادارہ کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ آخر کار ادارہ کو ہم پر ترس آ ہی گیا گو ذرا دیر سے پر آیا تو سہی۔ ارے بابا آپ لوگ پریشان مت ہوں میں بتائے دیتا ہوں۔ ادارہ کو ترس ایسے آیا کہ انہوں نے ہمارے 4 ماہ پرانے کلام کو اس بار شمارہ میں پبلشنگ کا شرف بخشا اور ساتھ ہی ہمارے محبت نامے کو (جبکہ نشتر نامے کو کٹ کر دیا گیا۔ پتا نہیں کیوں پچھلے کئی خطوط میں میرے ساتھ یہ زیادتی بار بار ہوئی۔ کئی بار میرے خطوط کو پبلش بھی نہیں کیا گیا) میں تو قارئین کو یہ کہہ کر تھک گیا ہوں کہ بھائی میری کوئی غلطی نہیں میں نے تو بھیجا یہ تو ادارہ ہی بہتر جانے کہ میرا ایڈیٹریا کالم پبلش کیوں نہیں ہوتا۔ بتائیے گا ضرور......؟ اس بار کا ٹائٹل پچھلی بار کی نسبت کافی بہتر لگا اور حیرت انگیز بات کہ اس بار شمارہ 12 اگست کو ہی مل گیا ورنہ تو کئی بار 28 تاریخ تک بھی نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے کافی دوست شکایت کرتے ہیں کہ آپ ریگولر ہی نہیں ہوتے اور پتا نہیں ہمیں کن کن خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ خیر اس میں بھی ان دوستوں کا پیار چھپا ہوتا ہے اور اس بار مجھے ادارہ سے سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ میری نظم ہی پبلش نہیں ہوئی جو

میں نے خصوصی اس ماہ کے شمارہ کے لیے بھیجی تھی۔ جس میں کہ برما میں ہونے والے مظالم اور بھارت، روس، امریکا اور اسرائیل کی مسلمانوں کے خلاف پالیسیوں اور جارحیت اور مسلم ممالک کی خاموشی کا تذکرہ زیرِ غور تھا۔ لیکن ادارہ نے پبلش نا کر کے مجھے کافی دکھی کیا خیر آگے بڑھتے ہیں۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی جناب کو خاکسار کی جانب سے تحفہ سلام محبت اور ڈھیروں دعائیں۔ باقی رہی امریکا، بھارت یا اسرائیل کے ہتھکنڈوں کی تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن سب سے بڑی حیرت اس بات پر ہے کہ مسلم ممالک ابھی تک ان یہودیوں کی چالوں کو سمجھ نہیں پائے یا جان بوجھ کر ان کا شکار بن رہے ہیں۔ پاکستانی گورنمنٹ تو ان کے لیے خود تر نوالہ بن چکی ہے حیرت ہے اس قوم پر جو ججوں کی بحالی اور دوسرے ایشوز کے لیے تو باہر نکلی لیکن ملک کی عزت بلکہ دنیائے اسلام کی عزت ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کے لیے نہیں نکلی۔ کیا ہمارے ایمان اتنے کمزور ہوگئے ہیں کہ ہم اپنی عزت تک کو محفوظ نہیں رکھ سکتے؟ ہمارے حکمران کبھی صوبوں کی تقسیم پر لڑ رہے ہیں، کبھی سوئس بینک کو خط نہیں لکھیں گے اس کے لیے ٹاک شوز میں پتا نہیں کتنا وقت ضائع کرتے ہیں وطن کی بیٹی کے لیے کبھی ان کی زبان سے کچھ نہیں نکلا کوئی اپیل نہیں نکلی۔ کہاں ہے ہمارا سپریم کورٹ ہر چھوٹی بات پر سوموٹو ایکشن لیکن اتنی بات پر کوئی جوابی کارروائی نہیں خیر۔ خیر مبارک جی آپ کو بھی یوم آزادی اور عید دونوں کے لیے۔ لیکن ہم آپ کے اس شکوہ کی تردید کرتے ہیں کیونکہ ہم نے اپنے تمام نمبرز کو فتح مکہ کی مبارک باد دی تھی۔ (مشتاق قریشی صاحب سے تصدیق فرما لیجیے گا) آپ کا نمبر نہیں تھا ورنہ آپ کو بھی ضرور مبارک باد دیتے۔ میری ادارہ سے ایک گزارش ہے کہ نا قابل اشاعت خطوط، کہانیاں، غزلیں، نظمیں اور بزم سخن کے حصہ سے بھی جو کچھ نا قابل اشاعت ہو ہر ماہ شمارے کے کسی حصہ میں یا علیحدہ صفحہ "نا قابل اشاعت" کے ٹائٹل سے بنایا جائے اور محفل کے تمام دوستوں سے بھی درخواست ہے کہ اس سلسلے میں اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ سب سے پہلے ڈیئر سسٹر این شاہین بھائی کی طرف سے سلام محبت اور کرسی صدارت پر مبارک باد اور وعلیکم السلام اجی ہمیں غائب ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

شوق سے پیتا نہیں کوئی زہر قاتل

یا تو حالات کی مجبوری یا ہوتا ہے روگ گہرا

امید ہے آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی مزید سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں پر میرے غائب ہونے کا شکوہ صرف آپ کو یا باقی محفل دوستاں کو نہیں، بلکہ کئی قارئین حضرات کو بھی ہے جو کئی بار کال اور میسج وغیرہ میں اظہار فرما چکے ہیں۔ جس کی وجہ میں شروع میں لکھ چکا ہوں۔ میری مجبوری ہو سکتی ہے۔ مجاہد ناز عباسی برادرم سلام محبت اور کیسے مزاج ہیں۔ خاکسار کو دعاؤں میں یاد رکھنے پر تہہ دل سے مشکور ہوں امید ہے رابطہ بنا رہے گا۔ محترم ریاض بٹ سلام محبت قبول فرمائیے تذکرہ کے لیے خاکسار مشکور ہے اور دل کی گہرائیوں سے آپ کا ممنون ہے اور آپ کی بات سے 110 فیصد متفق ہوں کیونکہ ہر نئی آنے والی گورنمنٹ ملک میں موجود بحران کو سدھارنے اور ختم کرنے کی بجائے صرف اس بات پر اکتفا کرتی ہے کہ یہ بحران سابقہ حکومت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ بلکہ اس بحران میں مزید اضافہ ضرور کیا جاتا ہے تا کہ کسی طرح کی کمی نہ رہے اور ہماری اپوزیشن خواہ کوئی بھی پارٹی ہو یا پارلیمنٹ اجلاس کا واک آؤٹ کر جاتی ہے یا منتخب حکومت پر کیچڑ اچھالتی رہتی ہے سچ پوچھا جائے تو تمام سیاستدان ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ صرف عوام کو بندر تماشا دکھا کر توجہ دوسری جانب مبذول کرا کے ملکی خزانوں کو انوکھے انوکھے پروپیگنڈوں کے ذریعے لوٹا جاتا ہے۔ ایم خان سلام محبت برادر اور نئے افق فیملی میں آپ کو ویلکم کہا جاتا ہے۔ امید ہے ریگولر رہو گے۔ سید عبداللہ شاہد برادرم سلام محبت قبول فرمائیے۔ یاد آوری پر خاکسار تہہ دل سے مشکور ہے۔ جہاں تک سوال ہے آپ کے شکوے کا اس کا جواب میں شروع میں دے چکا ہوں۔ 2010ء سے 2012ء تک میں ریگولر لکھ رہا ہوں۔ اب باقی پبلش نہ کرنے کی زیادتی ادارہ کی جانب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے آپ کا شکوہ غلط ہے بلکہ اس مثل کے مصداق ہے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے پلیٹ فارم پر بھی آپ کی غیر حاضری ہے اور پلیٹ فارم کے باہر بھی آپ رابطے میں نہیں ہو۔ حالانکہ میں بار ہا کہہ چکا ہوں کہ رابطہ کروا اپنا نمبر دو یا کسی سے میرا نمبر لو اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔ میرے حوصلے آج بھی اتنے ہی جوان اور تبصرے اتنے ہی جاندار ہیں جتنے شروع میں تھے بلکہ مزید نکھار ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ کیونکہ میرے ارادے مزید مضبوط ہوئے ہیں۔ بلکہ اس میں کئی دوستوں کا کردار بھی ہے۔ جنہوں نے کال کر کے میرے تبصروں کی تعریف کی۔ انکل لنگاہ بمع لنگاہ فیملی۔ صاحبزادے کی جانب سے تحفہ دعائے صحت قبول فرمائیے اور تمام لنگاہ فیملی کو خاکسار کی جانب سے سلام محبت۔ عبدالمالک کیف کیسے ہو جگر؟ سلام محبت لو جی آپ نے بھی شکوہ کر ڈالا۔ لگتا ہے محفل کے سبھی دوستوں کو مجھ سے شکوہ ہے۔ قصور آپ کا نہیں اس بار کرسی صدارت سے ہی

میرے لیے شکوے شروع ہوئے یوں پوری محفل میرے لیے محفل شکوہ بن گئی۔ میرا خیال ہے اتنا کافی ہے اور آپ بھی سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی محترم دل کی گہرائیوں سے سلام محبت و عقیدت۔ تبصرہ کی تعریف پر خاکسار آپ کا ممنون ہے اور آئے تو ہر بار ہیں پر کچھ لوگ گھر کا دروازہ ہی بند کر دیتے ہیں۔ محترمہ عصمت اقبال عین سلام محبت آپ کیوں غیر حاضر ہیں اب آپ کو کیا ہوا؟ تیار رہیے میرے بعد اگلا نمبر آپ کا ہی ہے۔ ڈیئر ناز سلوش ذشے۔ سلام محبت قبول ہو کیسی ہو جی۔ محفل کے وہ تمام دوست جو غیر حاضر ہیں جلد حاضری لگوائیں اور سب کو محمد فہد کا سلام اور ڈھیروں دعائیں اپنی بورنگ گفتگو کو انہیں لفظوں پر ختم کرتا ہوں۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد نئے افق ستمبر 2012ء کسی بے وفا لڑکی کی طرح دو بار جانے کے بعد بھی اپنے مقام پر نہ ملا۔ تیسری بار میں بھی لینے نہ گیا اور نئے افق کو پکڑنے کا پلان تیار کر لیا۔ کیونکہ جس کی محبت میں اس کے پیچھے بھاگا جائے وہ مغرور ہو کر فریب دینا شروع کر دیتے ہیں اور ناز نخرے کرتا رہتا ہے یوں کچھ ایسا چکر چلایا کہ آخر مجبور ہو کر نئے افق میرے دروازے پر چلا آیا۔ یوں اس کی محبت کا بھی اندازہ ہو گیا کہ نئے افق کے ساتھ محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ خیر جانے دیں ورنہ ہمیں کسی کی نظر لگ سکتی ہے۔ حسب معمول دستک کی کارروائی سنی جہاں ہمارے ملک کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ملکوں بھارت اور امریکا کے عزائم کے بارے میں مشتاق احمد قریشی نے ان ملکوں جنہوں نے شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اقوام متحدہ کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے اور مسلسل پاکستان کی جانب کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان کے بارے میں کیا انکشاف کیے۔ مگر جسے اللہ رکھے بھلا کون چکھے۔ گفتگو کی جان بہاراں محفل میں اپنے مبارک قدم رکھے تو مابدولت کی خوب صورت اور وجیہہ پرسنالٹی کو دیکھ کر محفل میں موجود شرکاء مس این شاہین، مجاہد ناز، ریاض بٹ، محمد فہد، ایم خان، سید عبداللہ شاہد، فقیر محمد بخش صابر اینڈ فیملی، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، جان صاحب سب آداب بجا لائے۔ سب سے پہلے این شاہین کا دکھڑا سنا۔ محترمہ این شاہین جی واقعی ہم اپنی راہ سے بھٹک گئے اور کبھی اللہ پاک نے ہمارے لیے ہمارے سدھرنے کے واسطے کیسی کیسی نشانیاں ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہیں اور دن رات کیسے کیسے عذابات ہم پر مسلط ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں۔ جیسے بجلی غائب ہو اب مچھروں کی یلغار بے سکونی گرمی کی شدت میں اضافہ اور دن کے وقت مکھیوں کی فوج یہاں تک کہ پھلوں کے درختوں پر فصلوں پر کیڑوں نے تباہی مچا رکھی ہے۔ یہ سب کیا ہے کیا ہم سب لاعلم ہیں؟ قطعاً نہیں برائیوں کو دیکھ کر انہیں روکنے کی بجائے ہم خود اس کام کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ایک کے کہنے سے کیا ہوگا۔ مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ خیر آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں اللہ رحم کرے گا آپ ہمارے علاقے سے گزریں اور بتایا نہیں آپ کو معلوم نہیں میں بھی سندھ میں پیدا ہوا ہوں اور مہمان نوازی میں گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ خیر آئندہ خیال رکھیے گا۔ تبصرہ اچھا لگا۔ مجاہد ناز نے کراچی کے حالات پر روشنی ڈالی بس دعا کیا کیجیے کہ ہمارے ملک میں انقلاب آ جائے۔ ریاض بٹ صاحب کیا حال چال ہیں۔ یونہی یاد کرتے رہا کیجیے۔ محمد فہد بھائی وعلیکم السلام کیسے مزاج ہیں بھائی فہد آپ نے سچ کہا۔ حد تو یہ ہے کہ اسلامی ملک مگر جمعہ کے خطبہ کے ٹائم بھی بجلی گم ہوتی ہے۔ حکمرانوں عوام کے صبر کا امتحان لینا بند کرو۔ ایم خان یار نام تو اردو میں رکھو بھائی۔ سید عبداللہ شاہد جی آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح مکمل تفصیل کے ساتھ شائع ہوا۔ فقیر محمد بخش اینڈ فیملی انکل جی پہلے تو میری طرف سے کیس جیتنے کی مبارک باد اور آپ کی صحت و تندرستی کے لیے دعا گو۔ عبدالمالک کیف صاحب او ہو اب تم بھی تجویز دینے کے قابل ہو گئے۔ آخری خط ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کا تھا۔ یار اجی میں تو سمجھا سارا میر الیٹر ہی شائع ہوا ہے پڑھنا شروع کیا تو پتا چلا کہ تمہارا خط بھی ہے ساتھ میں اور میں تو ہر خط میں آپ کا ذکر شریف سر عام کرتا ہوں آپ ہی کٹھور ہو کنجوس ہو یاد کرنے میں۔ تنقید کرو کسی کا دل تو نہ دکھاؤ۔ طاہر قریشی کی "اقرا" پتا چلا کہ صبر کا مقام کہاں تک ہے۔ آج کی دنیا میں بندہ دو منٹ میں ہی اکھڑ جاتا ہے۔ کہاں کا صبر کہاں کا ضبط اپنے غصے سے ہر چیز تہس نہس کرنا مشغلہ بن چکا ہے۔ خدا ہمیں صبر کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ سب سے پہلے کہانیوں میں بازی گر کو پڑھتا ہوں مگر.......؟ حسام بٹ جی یہ کیا پہلے بازی گر کی قسط لکھا کریں پھر دوسرے کام۔ اس کے بعد شہناز بانو کی گردش میں چلے گئے۔ کیا بات ہے ادی شہناز کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ پہلے کوئی اور اسے تحریر کر رہا تھا۔ اس کا کیا راز ہے۔ مگر اس میں مہوش کا بھی کوئی کردار تھا اب اسے منظر عام پر لائیں۔ دوسری بات شمروز اپنا گھر بار محبت، رشتے ناتے سب کچھ تو گنوا چکا ہے اور نواب کے ہاں اپنے آپ کو طاقتور بھی بنا لیا ہے پھر ان شرمناکیوں کی کیا ضرورت اپنا انتقام لے کر شانت ہو سکتا ہے۔ محمد ثاقب عباس کی "کندن" اچھی لگی۔ سلمیٰ غزل کی "بھائی جان" نے متاثر کیا اور یہ روحانی مسائل کا کوپن کس پیچ پر ہے۔ ناظم بخاری کا ناول "ناگہانی آفت" خوب رہا۔ ناظم بخاری بھائی اچھا

لکھتے ہیں۔ رائٹرز کو بھی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں جو کبھی کبھی منظر سے ہٹ جاتے ہیں اور کبھی تو بالکل غائب ہو جاتے ہیں جیسے محمد فاروق انجم اب تو ساحلی صاحب بھی گمشدہ لگ رہے ہیں۔ دوسری کہانیاں ابھی نہیں پڑھ سکا۔ میگزین لیٹ ملنے کی وجہ سے تبصرے سے عصمت اقبال غائب تھیں تو خوشبوئے سخن میں اپنی غزل ''کومل'' کے ساتھ موجود تھیں۔ وسیم اختر' طاہرہ جبیں تارا' ڈاکٹر واجد نگینوی' میثم علی آغا بھائی جان کیسے مزاج ہیں۔ آپ کی شاعری سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور یہ ناز سلوش ذشے کس دیس میں ہیں جو ہریالی دیکھتی رہتی ہیں۔ سید عبداللہ شاہد کی غزل بھی اچھی لگی۔ اسما سحر کی نظم ''چلتے چلتے'' نے دل کو رنجیدہ کر دیا۔ او کے اب اجازت چاہوں گا اللہ حافظ۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد السلام علیکم! خدائے مطلق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور ماہنامہ نئے افق کی تمام وحدتوں' جہتوں اور خوش رنگینیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہوں گے۔ خدائے منصف سے دعا گو ہوں کہ آپ صحت و سلامتی کے ساتھ ہمیشہ سکھ و آرام کی چھاؤں تلے محو خرام ہوں۔ آپ سدا پھولیں اور شاد و آباد رہیں آمین۔ آپ کے مجلس ادارت کے دوست و احباب جناب طاہر احمد قریشی' میرے مہربان و مخلص دوست برادر اقبال بھٹی صاحب' حافظ شبیر احمد صاحب' بھائی عفان احمد' جناب عمر اسرار صاحب اور محترمہ راحیلہ تاج صاحبہ کی خدمت میں سلام۔ آپ سب کی شبانہ روز محنت اور لگن سے رسالے کی آن بان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور نکھرتا جا رہا ہے۔ آپ سب کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہوں۔ قبلہ و محترم بابا مشتاق احمد قریشی کی خدمت میں بھی نوشتہ جاں کے ساتھ سلام عرض کرتا ہوں۔ کچھ عرصے بعد عید کی خوشی منانے اور کچھ ذاتی کام کے مقصد سے کراچی آنا ہوا پھر کام تو بہلانے ٹہلانے پر موقوف ہوا بہت افسردگی ہوئی۔ بہر حال کراچی آمد پر محترم عمران احمد صاحب آپ سے ملاقات کر کے عید کی خوشیوں کا احساس دوبالا ہو گیا۔ آپ نے ''حصار'' کو بر فہرست شائع کر کے مجھے جو عزت بخشی اس پر شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا بھی لازمی تھا۔ اس لیے نشست میں کوئی لغزش ہو گئی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔ نئی اسٹوری ''وحشی اونٹ'' کو امید ہے جلد از جلد شائع کریں گے۔ قطع برید کا آپ کو حق ہے۔ اب آتے ہیں ماہ ستمبر کے تازہ شمارے کی جانب اس مرتبہ رسالہ جلد بھجوایا ہے آپ نے بہت شکریہ جناب من۔ آپ ہر ماہ قدرتی مناظر اور مادی ارضیات کی بوقلمونیوں کو یوں رنگ آمیزی سے سرورق پر بیان کرتے ہیں کہ تجزیہ کرتا دماغ لاجواب رہ جاتا ہے۔ گفتگو کے اپنائیت سے لبریز صفحات پر پہلے آپ کی تمہید کو پڑھا۔ حسام بٹ کی بازی گر کے بارے میں اطلاع ملی کہ انہوں نے اس دفعہ چھٹی کر لی ہے امید ہے کہ وہ آئندہ جو قسط تحریر کریں گے اس میں فرحانہ کی محبت کو مختصر کر کے ہمارے ہیرو اسد اللہ کی جان بخشوائیں گے۔ اس مرتبہ محفل میں دوستوں اور ساتھیوں کی کمی کا احساس ہوا۔ آپ خطوط کم شائع کرتے ہیں۔ رسید کی صورت میں نام بھی شائع نہیں کرتے۔ پتا نہیں چلتا کہ نئے افق جو لاکھوں میں چھپتا ہے کتنے لوگ پڑھتے ہیں۔ نجانے آپ کیسے عمران احمد ہیں؟ (آپ مسکرا لیں لیکن میری کہانی کو قریبی اشاعت میں ضرور شائع کریں)۔ اس مرتبہ کراچی ہی سے این شاہین صدارتی کرسی پر براجمان نظر آئیں۔ آپ کا تبصرہ بھرپور اور جامع تھا۔ میری جانب سے مبارک باد۔ حصار کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ آپ اچھی شاعری کرتی ہیں۔ دوم بات چیت سے اسٹڈی کا پتا چلتا ہے۔ اس لیے کہانی نویسی کی جانب طبع آزمائی کیوں نہیں کرتیں؟ ذشے کو کہانی لکھنا نہیں آتا تھا مگر آج وہ نئے افق کی اچھی رائٹر مانی جاتی ہے۔ اس بارے میں کیا سوچتی ہیں جواب ضرور دینا۔ مجاہد ناز' عید مبارک کہنے کا شکریہ۔ خوابوں پر بھروسا کرنے سے انسان تلخ حقیقتوں سے غافل اور بے پروا ہو جاتا ہے۔ خواب ناک بننے سے وہ لطف و سرور سے چہکتا مہکتا ضرور ہے لیکن اپنی آزادی اور حریت کا مجرم بن جاتا ہے۔ محترم بھائی ریاض بٹ شکر ہے کہ آپ نے میری بات سے اتفاق کیا اور حصار کو پسند کیا۔ ورنہ اس ناولٹ کی اشاعت سے مسلسل لن ترانیاں سننے کو مل رہی ہیں۔ کیا یہ بات من حیث القوم ہر فرد کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ہے کہ کوئی محنت و جدوجہد سے ترقی و خوشحالی کی جانب بڑھ رہا ہے تف ہے ہم پاکستانی مسلمانوں پر' کوئی کم ذات غلط ذرائع سے یا بے ایمانی اور بددیانتی سے شارٹ کٹ استعمال کرتا ہے اور راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ تو ہم کیسے آگے بڑھ کر محبت و احترام سے اس سے مصافحہ کرتے ہیں اور اس کرپٹ دولت مند شخص کے قدموں میں بچھے جاتے ہیں۔ روپیہ پیسا اور اس کے ٹھیکے دار آپ کی محنت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ محنت رنگ تو لاتی ہے لیکن کس کے ہاتھ میں کیا رنگ ہوتا ہے اور کون آپ کی محنت کا خون کر کے اس زخم سے مسکراتا ہے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ محمد فہد ایم خان اور فقیر محمد بخش لنگاہ آپ تینوں شرکائے محفل کے خطوط اچھے اور جاندار تھے۔ ایم خان کو دوبارہ سے ویلکم کہتا ہوں۔ اس بار گفتگو میں بہن این شاہین کے علاوہ دیگر خواتین شریک نہیں ہوئیں۔ شہناز بانو آپ کے ہاں خیریت تو ہے نا دو تین ماہ سے بات چیت میں

شامل نہیں ہوئیں اور نا ہی میرے ناولٹ ''حصار'' پر رائے زنی کر کے میری رہنمائی کی۔ اس لیے خاصا ملال ہوا کیا۔ ''گردش'' کے بارے میں اپنی سوچ و فکر کا گاہے بگاہے اظہار کرتا رہتا ہوں۔ عصمت اقبال عین فرام منگلا کینٹ' تبصرہ نہیں تھا مگر شاعری میں بہت اچھا جھپ لیا ہے۔ خوشبوئے سخن میں جو خوب صورت اور کانوں میں نقرئی الفاظ سے رس گھولتی اور دل موہ لیتی غزل چھپی ہے بہت خوب بلکہ لاجواب غزل ہے۔ مبارک ہو عصمت جی ان کے علاوہ عالیہ انعام الٰہی تین چار ماہ سے گفتگو سے ندارد ہیں۔ خیر جہاں بھی ہوں خیر خیریت سے ہوں۔ شہنی ارشاد' محترمہ آپ بھی خطوط کی محفل سے غائب ہیں یہ کیا زیادتی کی بات نہیں ہے میرے ساتھ آپ کی موجودگی سے میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ پرچے پر شہنی جی کی رائے زنی سے حق دار کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ اس بات پر سوچنا اور یہ مت کہنا کہ اپنا الو سیدھا اور بھاڑ میں گئی رشیدہ۔ سمجھ رہی ہو نا محترمہ۔ دوم تم نے اس مرتبہ بھی ''سچا خواب'' لکھ کر اپنی ساکھ کو متاثر ہونے سے بچایا ہے۔ ویسے حیرت کی بات ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں پلاٹ کے بارے میں توڑ جوڑ کرنا اور واقعات کی صورت میں اسے بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس دفعہ عبدالمالک کیف مختصر تبصرے کے ساتھ نظر آئے۔ کیوں بھائی صاحب بہت جلد تھک گئے آپ؟ قلم کاری میں ابتدائے عشق سمجھا جاتا ہے کہ آپ بھرپور اور جامع خط لکھنے کے بعد مختصر تبصرے پر ستانے لگے۔ تمہاری آزاد نظم اچھی لگی۔ شاعری غزل و نظم میں بھی طبع آزمائی کرو اور ہاں نئی کہانی بھجوائی ہے یا شاعری سے دل لگا لیا۔ محترم عمران بھائی مجھے جس بات کا ڈر تھا اپنے ناول حصار شائع ہونے کے بعد وہ ڈر سچ نکلا۔ جناب ابن مقبول صدیقی کا افسوس ناک تبصرہ اور بنا لحاظ و تعلق داری کے ان کی رائے زنی۔ جناب موصوف سے دیرینہ شناسائی کی وجہ سے میں نے جو پُرخلوص جذبوں اور خیالات کا اظہار کیا تھا وہ سب اکارت گئے۔ محترم صدیقی صاحب آپ کو ایک دو مثال دے کر اس بات کو ثابت کرنا چاہیے تھا کہ میں نے عورت کے خلاف حدود سے بڑھ کر چرچا کیا ہے؟ ماں' بہن اور بیٹی کے تقدس اور مرتبے کو میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ میں نے عورت کے بھانت بھانت کے تیوروں میں سگے اور خونی رشتوں کو جس طرح نبھایا ہے میں عمران بھائی کو گواہ کر کے لکھ رہا ہوں وہ مجھے بہت اچھا جانتے ہیں۔ حصار میں تسکین ایک غیر عورت سے مل کر کبیر احمد کو جو کہ اس کا شوہر تھا۔ ذہنی دباؤ میں رکھ کر اس پر غلبہ پانے کے جنون میں مبتلا تھی۔ اس لیے اس نے تسکین کے دماغ کو درست کیا اور تہمینہ بری عورت سے اپنے گھر کو بچا لیا۔ تو جناب صدیقی صاحب اس پورے معاملے میں کہاں عورت کی شان میں مجھ سے گستاخی ہوئی؟ میری بے وفا بیوی کا جنازہ اٹھے تو پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ آپ کون سے حادثے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ جیسے پختہ کار اور سمجھ دار انسان سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی۔ مزید آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں درود ابراہیمی بھی پڑھتا ہوں اور موسیقی سے بھی لگاؤ رکھتا ہوں تو جناب میرا اخیر و شر مخض میری عاقبت کے لیے ہے۔ جس کا مجھے جواب دینا ہے۔ میں کوئی متقی پرہیز گار نفس نہیں ہوں اور نا ہی پسند کرتا ہوں کہ کوئی مجھے بہت پارسا اور نیک کہے لیکن میں بدعہدی نہیں کرتا اور بددیانتی سے حتی الامکان بچتا ہوں ان باتوں کے باوصف میں گانوں' شاعری' گیت' غزلوں' ساز و آواز' اداکاری' صداکاری ان تمام اصناف سے دلچسپی' لگاؤ اور شغف رکھتا ہوں۔ اب عمران بھائی کچھ کہانیوں پر بات کرتا چلوں۔ مغرب سے انتخاب میں جناب اقبال بھٹی کی ہیروئن پہلے نمبر اور ڈراپ سین از اسرار احمد دوسرے نمبر پر پسند آئیں۔ سچی کہانیوں میں آفت رسیدہ بھائی جان اور کندن تیسرے نمبر پر بالترتیب اچھی لگیں۔ ناظم بخاری کو آپ نے ریگولر کیا ہے خوش نصیب ہیں بخاری۔ ناگہانی آفت کو انہوں نے حسیات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ سلسلے وار ناولز میں بلاوا اور گنگا کا پجاری کی ابتدائی اقساط میں ابھی کرداروں سے تعارف ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ ناولز اسٹڈی میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گے۔ ''گردش'' میں شہناز بانو (بجیا) کے علم سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے بجیا پراٹھا کھا کر یہ ناول تحریر کر رہی ہیں۔ بہت لذیذ اور چکنا ناول ہوتا جا رہا ہے۔ مبارکباد بجیا کے لیے۔

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

(۲۴۰)

(ترجمہ (حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعزیت نامہ لکھوایا۔

بسمہ اللہ الرحمٰن الرحیم...... اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام...... میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں...... (بعدازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی اللہ تعالیٰ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا اور وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے۔ اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضا الٰہی کی نیت سے صبر کیا...... پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے اجر کو غارت کر دے۔ اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی اور یقین رکھو کہ جزع وفزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا' اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے' وہ ہو کر رہنے والا ہے بلکہ یقیناً ہو چکا ہے...... والسلام۔

(معجم کبیر ومعجم اوسط)

(تشریح) قرآن مجید میں مصائب پر صبر کرنے والے بندوں کو تین چیزوں کی بشارت دی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔............ (ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش اور عنایت ہوگی اور وہ رحمت سے نوازے جائیں گے اور وہ ہدایت یاب ہوں گے)...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعزیت نامہ میں اسی قرآنی بشارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ''اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے اس صدمہ پر صبر کیا تو تمہارے لیے اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور ہدایت کی بشارت ہے۔''

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تعزیت نامہ میں ہر اس صاحب ایمان بندے کے لیے تعزیت ونصیحت اور تسلی تشفی کا پورا سامان ہے جس کو کوئی صدمہ پہنچے' کاش اپنی مصیبتوں میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ایمان افروز تعزیت ونصیحت سے سکون حاصل کریں اور صبر وشکر کو اپنا شعار

بنائیں۔

(۲۴۱)

(ترجمہ) حضرت ابوالدرداءؓ کی بیوی ام الدرداءؓ سے روایت ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے میرے شوہر ابوالدرداء نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ بیان فرماتے تھے کہ:۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا کہ اے عیسیٰؑ! میں تمہارے بعد ایک امت پیدا کروں گا جس کی سیرت یہ ہوگی کہ جب ان کو ان کی چاہت اور خواہش کے مطابق نعمتیں ملیں گی تو وہ جذبہ شکر سے معمور ہو کر اللہ کی حمد وثنا کریں گے اور جب ان پر ناخوشگوار احوال آئیں گے تو وہ صبر سے ان کا استقبال کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کے طالب ہوں گے۔ حالانکہ ان میں (کوئی خاص درجہ کی بردباری اور دانشمندی نہ ہوگی) حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا کہ:۔ جب ان میں بردباری اور دانشمندی نہ ہوگی تو ان سے خوشحالیوں میں شکر اور مصائب پر صبر کیونکر ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں ان کو اپنے حکم اور اپنے علم سے کچھ حصہ دوں گا۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مصیبت میں مایوس اور دل شکستہ اور سراسیمہ ہو جانا اور نعمت اور خوشحالی میں مست ہو کر اپنی اصل حقیقت کو اور خدا کو بھی بھول جانا انسانوں کی عام کمزوری ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ''...... اب اگر کسی امت اور کسی گروہ کی سیرت ایسی ہو کہ وہ مصیبتوں میں صابر اور نعمتوں پر شاکر ہوں تو اللہ تعالیٰ کا اس پر خاص فضل ہے اور یہ اس کا بڑا امتیاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام صحابہ اور قرون مابعد کے صلحا مومنین کو اللہ تعالیٰ نے جو خاص روحانی صفات عطا فرمائیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو صبر وشکر کی دولت سے بہرہ ور فرمایا اور ان کے اس صبر وشکر کا سرچشمہ ان کی عقلیت اور علم کی وسعت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے اپنے علم کے کچھ ذرے ان بندوں کو عطا فرما دیئے ہیں اور یہ صبر وشکر اسی کے ثمرات ہیں۔

جس طرح اس امت کے اور بہت سے امتیازات اور خصائص کا ذکر اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سابقین سے فرمایا اسی طرح صبر وشکر میں اس کے امتیاز کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا تاکہ انہیں معلوم ہو کہ انسانوں کی روحانی تربیت اور سیرت سازی کا جو کام انہوں نے اور ان سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے کیا' اس کی تکمیل ان کے بعد آنے والے اللہ کے پیغمبر کے ذریعے ہونے والی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی امت ظہور میں آنے والی ہے جو صبر وشکر کے مقام پر فائز ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے علم سے وہ بہرہ یاب ہوگی۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

بلاؤں کا مہاراج

خورشید پیر زادہ

مافوق الفطرت واقعات' قصے کہانیاں اور ان پر بنائی جانے والی فلمیں تاریخ کے ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کہانی ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر کئی نئے موڑ لے کر آپ کو حیران کرے گی۔

نئے افق کے تجسس پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک سنسنی خیز ناول

رات کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ اس دوران وہ جانے کتنی بار دل پکڑے ہوئے روئی تھی۔ جانے کتنی ہی بار اس کا کلیجہ منہ کو آنے کو ہوا تھا۔ جانے کتنی ہی بار اپنے بابا کے بارے میں سوچ کر وہ سسک اٹھی تھی۔ اتنا تو اس کا دل بھی مان چکا تھا کہ اس کی عزت تار تار ہونے سے اب کوئی کرشمہ ہی اس کو بچا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ زندہ واپس چلی جائے' غنیمت ہے۔ جان بچانے کے لیے پرکاش کی ہر بات مان لینے کے لیے وہ خود کو تیار کر چکی تھی۔ یہی سوچ کر بار بار اس کا کلیجہ پھٹ پڑتا تھا اور آنسو رہ رہ کر اس کے گالوں پر نشان چھوڑ جاتے تھے۔ یونہی لیٹی لیٹی اپنی قسمت کو روتی شروتی نے جیسے ہی باہر سے پرکاش کی آواز سنی تو اس نے اپنے آنسو پونچھے اور آنکھیں بند کر کے دم سادھ کر سونے کا ناٹک کرنے لگی۔

پرکاش دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر آیا' اس نے شروتی کو بکھرے ہوئے بالوں میں بستر پر سوتے ہوئے پایا۔ میز پر دوپہر کا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ مڑ کر باہر نکلنے کو ہوا تو بھگوان داس دروازے پر حاضر ہوا۔

''اس نے کھانا نہیں کھایا؟'' پرکاش نے بھگوان داس سے پوچھا۔

''نہیں صاحب۔ میں نے تو آپ کے کہنے کے مطابق بڑی محنت سے بنایا تھا میم صاحب کی خاطر۔ ہی ہی ہی۔'' بھگوان داس نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

''ادھر آؤ۔'' یہ کہتے ہوئے پرکاش نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور کمرے سے دور جانے لگا۔ بھگوان داس اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔

''اس کو کچھ شک تو نہیں ہوا۔'' پرکاش نے بھگوان داس سے پوچھا۔ ''نہیں صاحب۔ ڈر کے مارے اس کی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے رٹے رٹائے ڈائیلاگ بولنے شروع کیے ہی تھے کہ اس کا برا حال ہو گیا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا صاحب۔ مجھ سے سارے ڈائیلاگ بولے نہیں گئے۔'' بھگوان داس سر جھکا کر بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ ڈر تو پوری طرح گئی ہے نا۔''

''ڈرنے کی چھوڑو صاحب۔ یہ تو مر ہی جاتی اگر تھوڑی دیر اور میں اس کے سامنے رہتا۔''

''اوکے ٹھیک ہے۔ ویسے وہ لاشوں والا کام تم نے بہت اچھا کیا تھا۔ ایک دم اصلی لگ رہی تھیں۔ گوشت کس چیز کا تھا؟'' پرکاش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہی ہی ہی۔ بکرے کا کچا گوشت تھا صاحب۔ آپ کا فون آتے ہی میں بکرا لے آیا تھا۔ اور کاٹ کر ڈال دیا تھا اندر۔''

''ویری گڈ۔ اب دوسری طرف سے جا کر وہ ربر کے پتلے بھی وہاں سے ہٹا دو اور کمرہ اچھی طرح صاف کر دو۔''

''جی اچھا صاحب۔'' بھگوان داس نے ادب سے سر جھکایا اور وہاں سے چلا گیا۔

پھر پرکاش دوبارہ کمرے کے اندر آیا اور اندر آتے ہی اس نے شروتی کو تیزی سے اپنی آنکھیں بند کرتے دیکھ لیا۔

''اچھا۔ تو اب میرے چہرے سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔'' کہتے ہوئے پرکاش بستر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شروتی ڈر کے مارے سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پرکاش کا ہر لفظ اس کو اپنے دل میں چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔

''میں صرف تین تک گنوں گا۔'' پرکاش نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ شروتی اچانک آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی اور کمرے کے سب سے دور والے کونے میں جا کر پرکاش کو گھورنے لگی۔

''بڑی سمجھ دار ہو جان من۔ اب کیا ارادہ ہے؟'' پرکاش نے بچکانہ انداز میں اس کو اور ڈرانے کی کوشش کی۔ شروتی کچھ نہیں بولی' بس چپ چاپ کسی معصوم میمنے کی طرح اس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی جیسے خود پر رحم کرنے کی بھیک مانگ رہی ہو۔ حالانکہ چہرے کے اڑے ہوئے رنگ سے صاف ظاہر تھا کہ اس کو رحم کی امید نہیں تھی۔

''زندہ رہنا چاہتی ہو۔'' پرکاش نے اسی روکھے انداز میں پوچھا۔ شروتی نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ اب تو بس زندگی بچنے کی ہی آس تھی۔ عزت کے ساتھ تو وہ کب کا سمجھوتہ کر چکی تھی۔

''شاباش۔ لیکن اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ میں جو کچھ بھی کہوں' جو کچھ بھی پوچھوں۔ اس کا فوراً جواب ملنا چاہیے۔ اگر ایک بات بھی تم نے نہیں مانی۔ یا ایک بار بھی جھوٹ بولا' تو سمجھ لینا' کمرے میں پڑی لاشوں کی طرح تمہیں بھی دوسرا موقع نہیں ملے گا۔''

''جی۔'' بڑی مشکل سے گھٹی ہوئی آواز شروتی کے گلے سے نکلی۔

''جاؤ۔ جا کر نہا لو۔ تب تک میں تمہارے لیے کپڑے نکالتا ہوں۔'' پرکاش نے شرارتی آنکھوں سے اس کو اوپر سے نیچے گھورا۔

''جی یہی ٹھیک ہیں۔'' شروتی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا تھا میں نے' اتنی جلدی بھول گئیں۔'' پرکاش نے اس کو یاد دلایا کہ اس کو پرکاش کی ہر بات ماننا پڑے گی۔

''جی۔جی۔ جاتی ہوں۔'' کانپتی آواز میں بولتی ہوئی شروتی فوراً باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ روم کے دروازے پر رک کر اس نے پرکاش کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاندار دکھائی دینے والے اس انسان کی چمڑی کے پیچھے ایک گھناؤنا جنگلی جانور چھپا ہوا ہے۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ پندرہ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور شروتی سہم گئی۔ وہ ابھی نہا ہی رہی تھی۔

''جی۔''

''نہائی نہیں ہو کیا اب تک۔'' باہر سے پرکاش کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''جی نہا لی۔'' پانی کا نل بند کرتے ہوئے شروتی نے مری سی آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو۔" پرکاش کی آواز میں تحکم تھا جسے شروتی فوراً سمجھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر اس کے برہنہ بدن پر موتیوں کی طرح دمکتی پانی کی بوندوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس آ کر ایک بار اپنے مجبور بے پردہ حسن کو مایوسی سے دیکھا اور چٹخنی کھول کر پرکاش کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"اپنے کپڑے مجھے دو۔" باہر کھڑے کھڑے ہی پرکاش نے روکھے انداز میں کہا۔

"جی ایک منٹ۔" شروتی نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے کپڑے باہر نکال کر پرکاش کو پکڑا دیئے۔

"اور۔" پرکاش ابھی کپڑوں کی گنتی سے مطمئن نہیں تھا۔

"جی کیا؟" شروتی اس کا مطلب سمجھ نہیں پائی۔

"نام لینا پڑے گا کیا؟ باقی کپڑے بھی دو۔" پرکاش نے اپنی آواز میں مزید گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

شروتی کی روح تک کانپ گئی۔ کنواری جوان لڑکیاں تو اپنے زیر جاموں کو بیش قیمت امانت کی طرح چھپا کر رکھتی ہیں۔ مگر جان بچانے کی ہلکی سی امید لیے شروتی اس کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔

"جی۔" شروتی نے کہا اور سسکتے ہوئے اپنے زیر جامے ہاتھ بڑھا کر باہر کھڑے پرکاش کو دے دیئے۔ اسے پکا یقین ہو چلا تھا کہ آج کسی بھی صورت اس کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔

"باہر آ جاؤ۔" پرکاش نے ایک بار پھر حکم دیا۔

"جی تولیہ۔"

کچھ دیر اس کے نایاب حسن کو شرمسار ہونے سے بچانے کے لیے اب تولیہ ہی واحد سہارا ہو سکتا تھا۔

"باہر آ کر لے لو۔" پرکاش نے اس کو تڑپانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اب کہنے کو شروتی کے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اور نہ ہی کچھ چھپانے کو۔ بلکتی ہوئی وہ گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھ گئی اور اپنی سسکیوں کو پرکاش کی ناراضگی سے بچانے کے لیے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" باہر اس کا انتظار کر رہے پرکاش نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

بے بس شروتی نے ہلکا سا دروازہ کھولا اور اس کی آڑ لے کر اپنا چہرہ باہر نکالا۔ پرکاش اس سے دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ اس کے کندھے پر تولیہ ٹنگا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں شروتی کے زیر جامے اور دوسرے ہاتھ میں ہلکے نیلے رنگ کا لباس تھا۔

"باہر آ کر تولیہ لے لو۔" اس بار پرکاش کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے شروتی نے آخری بار اپنے کنوارے بدن کو مایوسی سے دیکھا۔ اس کا انگ انگ اتنا پیارا تھا کہ پرکاش کی نظروں سے ہی میلا ہو جاتا۔ شروتی اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے، نظریں جھکائے ہوئے اس کے قدم اپنے آپ ہی باہر پرکاش کی طرف بڑھنے لگے۔ اب وہ پرکاش کے اتنے قریب آ چکی تھی کہ پرکاش اس کی سسکیاں محسوس کر سکتا تھا۔ شروتی نے اچانک تولیے پر جھپٹا سا مارا اور جتنا بدن ڈھک سکتی تھی، ڈھک لیا۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ فکر مت کرو۔ آرام سے اپنا بدن پونچھ لو۔" پرکاش کی یہ کچھ دیر کی دریا دلی شروتی کی سمجھ سے باہر تھی۔

دل ہی دل میں ڈری سہمی شروتی دھیرے دھیرے تولیے سے اپنا بدن پونچھنے لگی۔ اس ڈر کے ساتھ کہ نہ جانے کب پرکاش پلٹ کر دیکھ لے۔

"پونچھ لیا۔" پرکاش نے پوچھا۔

"جی۔" ایسا لگتا تھا جیسے شروتی کو جی کے علاوہ کچھ کہنا آتا ہی نہیں ہو۔ پرکاش کے بولتے ہی اس نے جھٹ سے تولیے کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔

"گڈ۔ یہ لو۔" کہتے ہوئے پرکاش نے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے نیلا لباس شروتی کی طرف بڑھا دیا۔ لباس لیتے ہوئے شروتی کا ہاتھ پرکاش کے ہاتھ سے ٹکرا گیا اور اس کے پورے بدن میں جھنجناہٹ سی دوڑ گئی۔

شروتی نے ایک ہاتھ سے تولیے کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے لباس کو نیچے لٹکا کر دیکھا۔ نہایت ہی خوب صورت لباس تھا۔ مخملی سا، باریک ریشم سے بنا ہوا۔ ایک دم ملائم۔ اس لباس کو شروتی کسی اور موقع پر اپنے لیے دیکھتی تو شاید اس کے چہرے پر الگ ہی تاثر ہوتا۔ اس کو لگا جیسے یہ سب اس کی عزت کی بھینٹ لینے سے پہلے کی تیاریاں ہیں۔ اس نے لباس کو سینے سے اوپر لگا کر دیکھا۔ لباس اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔

"جی وہ۔" شروتی کو لگا، بنا بولے کچھ نہیں ہوگا۔

"وہ کیا؟" پرکاش دوسری طرف منہ کیے اس سوچ میں کھڑا تھا کہ بے پناہ حسن کی مالکن اس شاندار لباس میں کیسی لگے گی۔

"میرے کپڑے۔" انجان مرد سے اپنے زیر جامے مانگتے ہوئے شروتی کا چہرہ اس بھیانک ماحول میں بھی شرم سے لال ہو گیا۔

"ہاں۔ دے تو دیئے۔ پہن لو۔" پرکاش جانتا تھا کہ وہ کیا مانگ رہی ہے۔

"نہیں......وہ......وہ...... اندر والے۔" شروتی نے ہکلاتے ہوئے بڑی مشکل سے الفاظ ادا کیے۔

"جو تمہارے پاس ہیں۔ وہی پہن لو۔" پرکاش نے شرارت سے کہا۔

پرکاش کا لہجہ نرم پڑتا دیکھ کر شروتی کی تھوڑی ہمت بندھی۔

"اب پہن بھی لو۔" پرکاش نے دوبارہ لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا۔ اور شروتی نے کسی کٹھ پتلی کی طرح ایک دم سے وہ لباس اپنے گلے میں ڈال لیا۔

"پہن لیا۔" پرکاش نے اب تک ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"جی۔" شروتی بڑبڑائی۔ اس نے سر جھکا کر اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ لباس ایسا تھا کہ اس میں اس کے جسم کے تمام پیچ و خم اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ نمایاں ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر شروتی اندر تک پانی پانی ہو گئی۔ اس لباس نے اس کا بدن ڈھک تو لیا تھا مگر چھپایا کچھ نہیں تھا۔

جیسے ہی شروتی نے پرکاش کو پیچھے مڑتے دیکھا، وہ اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی۔ پرکاش بھونچکا سا شروتی کو دیکھ رہا تھا۔ اس لباس میں وہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ مگر جانے کیوں پرکاش خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ شروتی کا شرمیلا انداز اسے اور بھڑکا رہا تھا۔

"ادھر آ کر بیٹھو۔" پرکاش کرسی سامنے رکھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ لرزتے قدموں سے شروتی مڑی اور پرکاش کا اشارہ سمجھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا لگتا ہے تمہیں......؟ تم یہاں سے واپس جا پاؤ گی۔" پرکاش نے شروتی سے کام کی بات شروع کر دی۔

شروتی کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے پہلے سے جھکے ہوئے چہرے کو تھوڑا اور جھکایا اور آنسو لڑھکا دیئے۔

"میرا یہ روز کا کام ہے۔ تمہارے یہ آنسو میرے اوپر اثر نہیں کر سکتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ تم یہاں سے کیسے واپس جا سکتی ہو؟ اب بتاؤ۔ کیا ارادہ ہے؟" پرکاش نے اپنی آواز کو مزید سخت کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔" شروتی کو ڈرانے کے لیے کسی اور ناٹک کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب تک جو ہو چکا تھا وہی کافی سے بھی بہت زیادہ تھا اس کو اندر تک ہلانے کے لیے۔

"شاباش، تو شروع کریں؟" پرکاش نے اسی انداز میں کہا۔

"جی۔" شروتی کے پاس اور کوئی آپشن تھا ہی نہیں سوائے پرکاش کی ہر بات ماننے کے۔

"تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔"

اب شروتی کیا کہتی۔ مگر کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"جی۔" کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔

"کیسے پتا؟" پرکاش نے اس بار نہایت ہی بے تکا سا سوال کیا۔

"جی۔" شروتی اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی۔

"تمہارے اندر ایسا کیا ہے کہ تمہیں لگتا ہے کہ تم دوسروں سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو۔" پرکاش بات کو پتا نہیں کہاں لے جا رہا تھا۔

"جی۔ کچھ نہیں۔ اور بھی بہت خوب صورت ہیں۔" شروتی کو یہی کہنا مناسب لگا۔

"نہیں۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ بہتوں کو نہایت قریب سے پرکھا ہے لیکن سچ کہتا ہوں۔ تم جیسی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں جانتا ہوں لیکن بتانا تم کو ہی ہے کہ تمہارے اندر دوسروں سے الگ کیا ہے؟" پرکاش نے کہا۔

"جی پتا نہیں۔" شروتی نے دھیرے سے کہا۔

"میں بتاؤں......؟ تمہارے ایک ایک انگ کو چھو کر۔" پرکاش نے دھمکی دی۔

شروتی اندر تک لرز اٹھی۔ سوالوں کا جواب دینا اس کو اپنی عزت دینے سے بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ عزت تو جانی ہی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"کھڑی ہو جاؤ اور یہاں آؤ۔"

شروتی نے فوراً اس حکم کی بجا آوری کی۔ نظریں جھکائے وہ پرکاش کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا چیز ہو تم۔" نہ چاہتے ہوئے بھی پرکاش کے منہ سے نکل ہی گیا۔ شروتی کی آنکھیں پہلے ہی بند ہو چکی تھیں۔

"تمہیں تو کوئی بھی پسند کر سکتا ہے۔ ہے نا۔" پرکاش کا انداز اکسانے والا تھا۔ اس حالت میں شروتی کے لیے کسی بات کا جواب دینا محال تھا اور ہاں کہتے ہوئے بھی اس کے گلے سے ہاں کی بجائے آہ ہی نکلا۔

"روہن کو پٹا سکتی ہو۔"

"جی۔ مگر کیوں؟"

"دولت کے لیے۔ وہ اسی کروڑ کی جائیداد کا اکیلا وارث ہے۔ مگر ایک دم بھولا ہے۔ اور تمہارا دیوانہ بھی۔ صرف تم ہی اس کو یہ یقین دلا سکتی ہو کہ تم ہی اس کی نیرو ہو۔" شروتی کو اس کی آدھی بات ہی سمجھ میں آئی۔

"مگر میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔"

"اس کی فکر تم مت کرو۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا اور اس سے ملوا بھی دوں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ بس میرے ہاتھوں کا مہرا بننا ہے۔ اس سے

شادی کر کے طلاق لینی ہے۔ بس۔ دس کروڑ تمہارے اور تیس کروڑ میرے۔ بولو۔"

اب شروتی بیچاری کیا بولتی۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پرکاش نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کو کمر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور شروتی کو ایسا لگا جیسے کسی طوفان یا منجدھار کے بیچ پھنس گئی ہو اور جب طوفان تھما تو وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ اس نے وہی کیا جو پرکاش نے حکم دیا، لیکن تمام احکام ماننے کے باوجود ابھی بھی اس کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ کیا وہ یہاں سے زندہ جا پائے گی۔ کیا اب پرکاش اسے صحیح سلامت واپس جانے دے گا۔

"تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ وہ سب صرف ایک ناٹک تھا۔ تمہیں ڈرانے کے لیے۔ تاکہ تم چپ چاپ میری ہر بات مان لو۔" پرکاش نے اس کے چہرے پر آئے رنگ کو پڑھ کر نرم لہجے میں کہا اور شروتی کسی حد تک مطمئن ہو گئی۔ مگر پوری تسلی نہیں ہو پائی تھی۔

"مگر وہ لاشیں؟" یاد کرتے ہوئے شروتی کا پورا بدن کانپ اٹھا۔

"ہاہاہا۔ ایک منٹ، بھگوان داس۔" پرکاش نے ذرا زور سے آواز لگائی۔

"جی صاحب۔" بھگوان داس دروازے کے باہر سے بولا۔

پرکاش اٹھا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "ذرا وہ لاش اٹھا کر لانا۔"

بھگوان داس کو احساس نہیں تھا کہ ناٹک ختم ہو چکا ہے۔ پرکاش کے قریب آتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "صاحب۔ ان کو تو میں نے دھوڈالا ہے۔"

"ہاں ہاں وہی۔" کہتے ہوئے پرکاش واپس بستر پر آ کر شروتی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"دراصل وہ ربر کے پتلے ہیں۔ شکار کے دوران میں ان پر خون لگا کر جانوروں کا شکار کرنے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ ابھی پوری روشنی میں ان کو دیکھو گی تو سب سمجھ جاؤ گی۔"

شروتی کچھ بولنے ہی والی تھی کہ بھگوان داس ایک لاش کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔ شروتی حیرت کے مارے اچھل پڑی۔

"یہ تو نقلی ہے۔"

"تو کیا میں ابھی فارسی میں بول رہا تھا۔"

شروتی کو ایسا لگا جیسے اسے بھرے بازار میں ٹھگ لیا گیا ہو۔ یہ پتلے ہی تھے جنہوں نے شروتی کو اپنی مرضی سے بنا کسی ہچکچاہٹ کے اپنا بدن پرکاش کو سونپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ......

"اب تو مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ میں بابا سے کوئی بھی بہانہ بنا دوں گی۔ صبح تک نہیں گئی تو وہ تو مر ہی جائیں گے۔"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو تمہیں یہاں لانے کا اصل مقصد پورا کرنا ہے۔ انکل جی کی فکر مت کرو۔ میں نے ایک لڑکی سے گھر فون کروا دیا ہے کہ تم اس کے پاس ہو۔" پرکاش نے شروتی کی ڈھارس بندھائی۔

"مگر تمہیں گھر کا نمبر کہاں سے ملا؟" شروتی نے حیرت سے پوچھا۔

"انکل جی سے لیا تھا۔ جب میں اور وہ اکیلے بیٹھے تھے۔"

شروتی کو اب اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ جان بچنے کی یقین دہانی ملنے کے بعد اس کو اپنے ساتھ بیتے حادثے کا گہرا پچھتاوا تھا۔ یہ پچھتاوا اب ٹیس بن کر اس کے دل میں ابھرنے لگا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ۔" شروتی نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''تمہارے دس کروڑ اور اپنے تیس کروڑ کے لیے۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہو تو یہ ہمارے چالیس کروڑ بھی ہو سکتے ہیں۔''

شادی کا ذکر کر کے پرکاش نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اس کو قطعی احساس نہیں تھا کہ اس کو پرپوز کرنے والا پہلا شخص اس انداز میں اس سے ملے گا۔ یہ سوچ کر ہی شروتی پوری طرح سے ٹوٹ کر رہ گئی اور سسکنے لگی۔

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے یار۔ زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے اور دس کروڑ کے لیے یہ قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ تم رونا دھونا چھوڑو اور دھیان سے میری بات سنو۔'' پرکاش نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا سنوں میں اب؟'' شروتی پھٹ سی پڑی۔

''آپ میری قیمت لگا رہے ہیں۔ میری زندگی کی۔ اب اگر میں جیوں گی تو صرف بابا کے لیے۔ گھٹ گھٹ کر۔ آپ کو نہیں پتا کہ آپ نے مجھے کیسے زخم دیئے ہیں۔'' شروتی ڈبڈبائی آنکھوں سے بولی۔

''مگر میں نے کہا نا کہ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میری بات تو سن لو۔'' پرکاش ایک پل کے لیے شروتی کی نفرت اگلتی آنکھوں کو دیکھ کر ہڑبڑا سا گیا۔

''سینہ تان کر کہتے ہو کہ جانے کتنی ہی لڑکیوں کو اس بستر پر لے کر آئے ہو۔ کس کس سے شادی کرو گے عزت لوٹنے کے بعد۔ بولو۔'' شروتی چلا پڑی۔

اس کے آنسو اب نہیں تھم رہے تھے۔

''ہے...... ہے...... ایک منٹ...... میں نے تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔ میرے پاس ثبوت بھی ہے۔ اب میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔ شادی کے لیے میں نے صرف اس لیے آفر کی ہے کہ تم مجھے پسند ہو۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے پیار کرنے کا ہرجانہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھیں تم۔ چپ چاپ میری بات سنو۔ بھگوان داس کو بھی نئی نئی لڑکیوں کا شوق ہے اور اس کا انداز تم برداشت نہیں کر پاؤ گی۔'' پرکاش نے تقریباً غراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

شروتی کو تو ڈرانے کے لیے ہلکا سا اشارہ ہی کافی تھا۔ خود کو بھگوان داس کو سونپ دیئے جانے کی دھمکی سن کر تو وہ تھرا اٹھی۔ یہاں وہ ان سے مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔ اپنے آپ کو سسکنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے آنسوؤں کو پونچھا اور چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

''میرا ایک کام تمہیں کرنا ہوگا۔ بدلے میں، میں تمہیں اس کی قیمت بھی دوں گا۔ دس کروڑ۔'' پرکاش نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' شروتی کا جواب دس کروڑ کے لالچ کی وجہ سے نہیں آیا تھا، لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔ بات سننی ضروری تھی۔

''پہلے تمہیں میں ایک کہانی سنا دوں۔ روہن اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ظاہر ہے اس کے باپ کی اسی کروڑ کی وصیت سیدھی اس کے ہی حصے میں آنی ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس دولت کو سنبھال پائے گا۔ بڑا سیدھا اور بھولا سا ہے بیچارہ۔ کوئی نہ کوئی اس سے وہ دولت ہتھیا ہی لے گا۔ تو کیوں نہ میں ہی کچھ سوچ لوں۔ ہی ہی ہی۔ ویسے مجھے بڑا بھائی مانتا ہے بیچارہ۔'' کہتے ہوئے پرکاش رک گیا۔

شروتی کی جانب سے کوئی بات نہ کہنے پر اس نے بولنا جاری رکھا۔ ''دراصل کئی مہینے سے اس کو عجیب عجیب سے خواب آ رہے ہیں۔ اس کے خوابوں میں تم آتی ہو اور اپنے پاس بلاتی ہو۔ پچھلے جنم کا واسطہ دے کر۔ یہ سب عجیب ہے اور میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے ایسی باتیں صرف فلموں میں ہی دیکھی ہیں۔ مگر کچھ حادثات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس رات کو تمہاری جو قمیص پھٹی۔ وہ تم نے خود اس کے خواب میں پھاڑی تھی۔ کتنا عجیب ہے نا۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ صرف کام کی بات سنو۔ تمہیں دیکھ کر وہ تمہیں ہی اپنے سپنوں کی رانی ماننے لگا تھا۔ مگر پھر سپنے میں تم نے ہی یہ بولا وہ لڑکی میں نہیں ہوں کوئی اور ہے۔ نیرو نام کی۔ سمجھیں کچھ۔''

''نہیں۔'' سچ میں شروتی کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

''ایک منٹ۔ میں تمہیں ساری بات شروع سے بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پرکاش اس کو پوری کہانی بتانے لگا جو ان کے ٹیلے پر جانے سے شروع ہوئی اور آج دوپہر روہن سے ملاقات ہونے پر ختم ہوئی۔

''اگر اس کی ساری کہانی اس کے دماغ کا وہم ہے تو پھر تمہیں وہاں پیپل کے پاس دورہ کیوں پڑا۔'' شروتی نے کہانی میں پوری دلچسپی لیتے ہوئے۔ حالانکہ وہ اس کہانی کو روہن کے دماغ کا وہم نہیں بلکہ پچھلے جنم کی کوئی سچی کہانی مان رہی تھی۔

''وہ میں نے ناٹک کیا تھا۔ ایک طرف میں اسے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب سچ نہیں ہے۔ دوسری طرف اس کے دماغ میں ٹھوس ٹھوس کر نیرو کا بھوت بھر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ اسے مجھ پر رتی بھر بھی شک نہ ہو۔'' پرکاش نے جیسے اپنے دل کی پوری گندگی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

شروتی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پرکاش کو اپنے لیے شروتی کی آنکھوں میں نفرت دکھائی دی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' شروتی نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ تم اس پلان میں میرا ساتھ دو۔ تم روہن کو یقین دلا دو کہ تمہیں سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ اور تمہی اس کے پچھلے جنم کی محبوبہ ہو۔ یعنی اس جنم میں روہن کی نیرو۔''

......☆☆☆......

''وقت کی پابندی تو کوئی تم سے سیکھے۔ کتنے بجے کا ٹائم دیا تھا تمہیں؟'' روہن نے رویندر کے آتے ہی اس پر غصہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اوئے ہوئے۔ کیا بات ہو گئی یار۔ ٹینشن نہ لے۔ آ تو گیا ہوں نا میں۔ دیکھ تیری خاطر بنا نہائے ہی بھاگ آیا ہوں اٹھتے ہی۔'' رویندر نے اگلی بات دھیرے سے اس کے کان میں کہی۔ ''میلے کپڑوں پر ہی پرفیوم لگا کر آیا ہوں۔ دھلے ہوئے ملے ہی نہیں۔ تم نے کل رات کو ہی تو بتایا۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔ ٹرین نکال دی نا۔ ٹرین سے چلنے کا پروگرام تھا۔ اب بس سے جانا پڑے گا۔'' روہن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آنے والی اپنے آپ سدھار دے گی۔ کوئی اس جیسی سوہنی۔'' رویندر نے پاس سے گزرتی ہوئی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر جملہ پھینکا۔

لڑکی نے شاید بات سن لی تھی، اپنی چال کو دھیمی کر کے لڑکی نے رویندر کو گھورا اور آگے نکل گئی۔

''دیکھا کیسے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسی ہی کسی کی

ضرورت ہے۔ لال مرچی جیسی۔ جو مجھے سدھار سکے۔ ہیں نا۔ ہی ہی ہی۔" رویندر نے تھوڑی اور تیز آواز میں بات کہہ کر لڑکی تک اپنی فریاد پہنچا ہی دی۔

"اپنی زبان پر تالا لگا کر رکھا کر۔ نہیں تو کسی دن ایسی دھلائی ہوگی کہ۔" روہن نے واپس مڑ کر دیکھ رہی لڑکی کی طرف دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں معذرت کرلی۔

"اوئے دھلائی ولائی چھوڑ۔ چل بس اسٹینڈ پر چلتے ہیں۔ نہیں تو بس نکالنے کا سہرا بھی میرے ہی سر باندھو گے۔ باقی لڑکی پٹاخہ تھی یار۔ نہیں؟" رویندر اب بھی باز نہیں آیا۔

"ابے یہ کیا ہے چاچا۔ بس اسٹینڈ ہی تو ہے۔" روہن چلا اٹھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ آئی ایم سوری یار۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم نے مجھے دوبارہ فون کرکے بس اسٹینڈ آنے کو کہا تھا۔ مگر ہم جا کہاں رہے ہیں' یہ تو بتا دو۔" رویندر کا بولنا بدستور جاری تھا۔

"جہنم میں۔ اب تم چپ چاپ کھڑے رہو تھوڑی دیر۔ بس آنے والی ہے۔"

"دیکھ بھائی۔ جنت میں چل یا جہنم میں۔ مگر کھٹارا بس میں' میں نہیں جاؤں گا۔ نئی سی بس ہونی چاہئے کوئی ایکسپریس۔" رویندر نے کہا۔

"ہوں۔ تیرے باپ دادا نے ایئرپورٹ بنوا رکھا ہے یہاں۔ خیر اس کی فکر مت کرو۔ اے سی کوچ ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ دیکھ بھائی۔ جہاں بھی چلنا ہے' مجھ سے بات مت کرنا۔ راستے بھر سوتا جاؤں گا۔ آج تمہاری وجہ سے پانچ گھنٹے پہلے اٹھنا پڑ گیا ہے۔ ویسے چلنا کہاں ہے؟"

"تم چپ رہو گے تبھی تو میں بات کروں گا نا۔ یہاں سے میر پور خاص چل رہے ہیں۔ آگے کی آگے بتاؤں گا۔ اب اور کچھ مت پوچھنا۔" روہن نے کہا۔

"میر پور خاص؟ میر پور خاص میں تو ایک بار میری دادی کھوگئی تھی یار۔ پان کھانے کے لیے گاڑی سے اتری تھیں اور میرے دادا جی کو یاد ہی نہیں رہا کہ ان کے ساتھ دادی جی بھی ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرکے چلتے بنے۔ بعد میں دھیان آیا تو بڑے پریشان ہوئے۔ پتا ڈھونڈتے ہوئے واپس میر پور خاص پہنچے تو دادی کیا کرتی ملیں؟" رویندر طوفان میل کی طرح بولے جا رہا تھا۔

"کیا یار؟"

"پان والے سے سیلون اور بنگلہ پان پر بحث کر رہی تھیں۔ پان کھانے ہی تو اتری تھیں نا' ہی ہی ہی۔"

"بس اب چپ ہوجا۔ بس آ گئی ہے۔ چلو بیگ اٹھاؤ۔ روہن نے اس کا بھونپو بند کروایا اور بیگ اٹھا کر وہ بس کی طرف چل پڑے۔

"آ...... ہا...... اگر بس کی سیٹس ایسی ہوں تو پھر گھر کا پٹرول کیوں پھونکیں۔ سچ میں بڑی مست نیند آئے گی اس سیٹ پر تو۔" کہتے ہوئے رویندر نے اپنے پیر اوپر کرکے آگے والی سیٹ پر رکھ کر سونے کا پروگرام سیٹ کرنا شروع کردیا۔ آگے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے پیچھے منہ نکال کر رویندر کو گھورا۔

"اوئے پوری بس کو خرید لیا ہے کیا تم نے۔ پیر تو نیچے کرلو۔"

"ابھی کہاں بھائی صاحب۔ ابھی تو ٹیسٹ ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔ ہاہاہا۔" کہتے ہوئے رویندر نے پیر نیچے کرلیے اور اپنی بیلٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

"کیا ہوا جی۔ کیوں سارا دن سینگ کھڑے کیے گھومتے رہتے ہو۔ سیدھے نہیں بیٹھ سکتے کیا؟" مسافر کے ساتھ بیٹھی ہوئی اس کی بیوی نے اپنے شوہر کو ہی جھاڑ دیا۔

"میں نے کیا کہا ہے بیگم۔ میرے کندھے پر پیر رکھے گا تو کیا میں بولوں بھی نہیں۔ دیکھو تمہاری گفٹ کی ہوئی شرٹ پر مٹی لگادی۔ بس اسی لیے غصہ آ گیا تھا۔" مسافر نے اپنی صفائی دیتے ہوئے بیگم کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اچانک بس میں سوار ہونے والی ایک لڑکی کو دیکھ کر روہن کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کھلے بالوں کو سلجھاتی ہوئی وہ لڑکی نظریں نیچی کیے ہوئے اپنی سیٹ کا نمبر ڈھونڈتی ہوئی آ رہی تھی۔ گورے رنگ اور دل موہ لینے والے نین نقش نے روہن کو کچھ لمحوں کے لیے باندھ سا دیا۔ گرے کلر کی دھاریدار جینز اور گول گلے کی ٹی شرٹ کے اوپر کالر والی لائٹ پرپل کلر کی بنا بٹنوں والی جیکٹ پہنے اس لڑکی کی آنکھوں میں ایسا جادو تھا کہ بس میں بیٹھا ہر شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

روہن کا دھیان تب ٹوٹا جب وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

"ایکسکیوزمی۔ یہ ہماری سیٹ ہے۔"

رویندر بھلا روہن کو کہاں بولنے دیتا جھٹ سے بول پڑا۔ "اچھا۔ سیٹ ساتھ لانی پڑتی ہے کیا گھر سے؟ میں نے سوچا بس میں ہی مل جاتی ہوگی۔ آپ بھی آ جاؤ۔ کافی چوڑی سیٹ ہے۔ وہ کیا ہے نا کہ ہم سیٹ ساتھ لانا بھول گئے تھے۔ کیوں روہن؟" کہہ کر رویندر ایک طرف کو کھسک گیا۔

لڑکی کو اس کی بات پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ اس کی بے ڈھنگی باتوں سے الجھی لڑکی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔ وہ کچھ بولتی اس سے پہلے روہن بول پڑا۔ "سوری مس۔ یہ کبھی بس میں بیٹھا نہیں ہے۔ اس لیے لیکن میرے خیال سے یہ ہماری ہی سیٹ ہے۔"

"اچھا میرے مذاق کو میری نا سمجھی بتا کر تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ سا۔" پھر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے منہ سے نکلنے والی گالی کو واپس کھینچتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا ہے کہ جیسے مرد کبھی اپنی زبان نہیں بدلتے' ویسے ہی سیٹ بھی نہیں بدلتے۔ ایک مہربانی ہم آپ پر کرسکتے ہیں کہ ہماری سیٹ ڈھونڈ کر اس پر بیٹھ جائیں۔ ہم بڑے ہی نرم دل والے ہیں۔ کچھ نہیں کہیں گے۔ کیوں روہن؟"

لڑکی کو اچانک نہ جانے کیا سوجھی اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور آواز لگائی۔ "ریتو! جلدی آ۔"

"کیا ہوا؟" ریتو نامی لڑکی کچھ اس انداز میں اوپر چڑھی جیسے مصیبت کی گھڑی میں کسی نے اس کو مدد کے لیے پکارا ہو۔ لڑکی وہی تھی جس پر رویندر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہوکر باتوں ہی باتوں میں جملے کسے تھے۔

"کیا ہوا؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟"

"یہ ہماری سیٹ نہیں چھوڑ رہے۔"

"تم؟" ریتو' رویندر کو پہچان کر غصے سے آگ بگولہ ہوگئی۔

"اوہ۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں کیا۔ میری یادداشت تھوڑی کمزور ہے۔ مگر دیکھو لو۔ تمہارا نام ابھی بھی مجھے یاد ہے۔ ریتو۔ ویسے ہم پہلے ملے کہاں تھے۔؟" روی نے سینہ تانتے ہوئے بتیسی نکال دی۔

"ابھی بتاتی ہوں۔ چلو۔ اٹھو یہاں سے۔ نہیں تو ابھی پولیس انکل کو بلاتی ہوں۔" ریتو نے طیش میں آ کر آستینیں چڑھا کر ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے۔

"پولیس ماما' تمہارے انکل ہیں کیا؟ ہماری تو ویسے ہی رشتے داری نکل آئی۔ ہی ہی ہی۔" رویندر کہاں قابو میں آنے والا تھا۔

"چل اٹھ نا یار۔ پیچھے والی سیٹ ہوگی ہماری۔ سوری۔ مس۔ ڈونٹ مائنڈ پلیز۔" کہتے ہوئے روہن نے کھڑا ہو کر رویندر کو کھینچ لیا۔

مجبوراً رویندر کو بھی اٹھنا پڑا۔ اور دونوں پیچھے والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔

"یاہو۔" لڑکی نے پیچھے دیکھ کر رویندر کو اپنے نازک بازوؤں کے ڈولے بنا کر چڑایا۔ "پتا ہے ریتو۔ مرد کبھی اپنی سیٹ نہیں بدلتے۔ ہاہاہا۔"

اس سے پہلے کہ رویندر کچھ کہتا۔ روہن نے اس کے منہ کو اپنے ہاتھ سے دبا دیا۔

"کچھ مت بول یار۔ لڑکیاں ہیں۔ خواہ مخواہ پنگا ہو جائے گا۔"

بیچاروں کو بیٹھے ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ ایک جوڑا آ کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"ایکسکیوزمی۔ یہ ہماری سیٹ ہے۔"

رویندر سے رہا نہ گیا۔ امیتابھ کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ "جاؤ۔ پہلے وہ سیٹ دیکھ کر آؤ جس پر ہمارا نمبر لکھا ہے۔ یہ لو ہمارا ٹکٹ۔ ہیں۔"

مریل سے اس ادھ گنجے لڑکے نے چپ چاپ ٹکٹ پکڑا اور نمبر دیکھتے ہی بولا۔ "سر۔ یہی تو ہیں آپ کی سیٹیں۔ آگے والی۔"

"کیا۔ کیا کہا؟ پھر سے کہنا میرے یار پلیز۔" رویندر اچھل کر سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

"ہاں سر۔ یہی تو ہیں تیرہ اور چودہ نمبر۔ یہ لڑکیاں غلطی سے بیٹھ گئی ہیں شاید۔" لڑکے نے دوبارہ کہا۔

"اوئے ہوئے۔ لالے کی جان۔ دل کرتا ہے تیرا سر چوم لوں۔" رویندر نے ایک پل بھی نہیں لگایا آگے والی سیٹ تک پہنچنے میں۔

"اے۔ اٹھتی ہے یا پولیس ماما کو بلاؤں۔ ہاہاہا۔ مرد کبھی اپنی سیٹ نہیں چھوڑتے۔"

اب لڑکیوں کو بھی تھوڑا شک ہوا۔ ریتو نے کہا۔ "ٹھیک سے دیکھ لے۔ ہماری سیٹ کا نمبر۔"

لڑکی نے اپنے پرس سے ٹکٹ نکالے اور بولی۔ "یہی تو ہیں آٹھ اور نو نمبر۔"

"چل اٹھ یہاں سے۔ آٹھ اور نو نمبر اگلی سیٹوں کے نمبر ہیں۔ سیٹ نمبر سیٹوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے پاگل۔"

اور دونوں لڑکیاں جھینپتے ہوئے سیٹ چھوڑنے لگیں۔

"واہ۔ واہ۔ واہ۔ آج کل لڑکیاں بھی ڈولے شولے دکھانے لگی ہیں۔ کیا بات ہے۔ واہ۔ واہ۔" رویندر سے اس موقع کا فائدہ اٹھائے بنا رہا نہیں گیا۔

"چپ کر یار۔ بہت ہو گیا۔ غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔" روہن نے اس کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

دونوں لڑکیاں اٹھ کر آگے کی سیٹوں پر بیٹھے پٹھان کے پاس پہنچ گئیں۔

"ایکسکیوزمی انکل۔ یہ سیٹ ہماری ہے۔"

اوئے کمال ہے یارا۔ ابھی تم لوگ ان بچوں کا پیچھے پڑا تھا۔ اب ہم کو پریشان کرنے آ گیا۔ سارا سیٹ تمہارا ہے کیا؟ یہ دیکھو ہمارے نمبر آٹھ اور نو۔ سیدھا سانگھڑ تک کا ہے۔" پٹھان نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

رویندر جوان کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا' بیچ میں ٹپکتے ہوئے بولا۔ "لیکن خان چاچا۔ بس تو میرپور خاص جا رہی ہے۔"

"ہیں۔" پٹھان چونک گیا۔

"اور کیا۔" یہ کہہ کر لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔

"او خو چہ۔ ہمارا بس تو نکل گئی۔ ہم بھی بولے آج بس اتنا لیٹ کیوں ہے۔" پٹھان ٹپٹا کر اٹھا اور اپنا سامان نیچے اتارنے لگا۔

"چہ تم کب سیکھے گا سیدھا راستے پہ چلنا۔ امارا تو نصیب پھوٹ گیا تم سے شادی کر کے۔" پٹھانی اسے کوستی ہوئی اس کے پیچھے بس سے اتر گئی۔

......☆☆☆......

ساری رات شروتی بستر کے ایک کونے میں سمٹی لیٹی رہی۔ پرکاش اس کے برابر میں ہی چین سے سویا ہوا تھا۔ مگر شروتی نے ایک بار بھی جھپکی نہیں لی تھی۔ سونے سے پہلے پرکاش نے وعدہ کیا تھا کہ کل وہ اس کو کالج چھوڑ دے گا۔ پرکاش کی جانب سے سنائی گئی کہانی اس کے دماغ میں کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے کئی بار روہن کے بارے میں سوچا۔ شکل سے ایک دم شریف اور کیوٹ نظر آنے والے روہن سے اس کو پوری ہمدردی تھی۔ اگر اس سے پیار کرنے اور شادی کرنے تک ہی بات ہوتی تو شروتی اس کو اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتی۔

پرکاش کے کہنے کے مطابق روہن اس کا دیوانہ تھا۔ مگر پرکاش اس کو جس راستے پر لے کر جانا چاہتا تھا اس کے بارے میں تو شروتی کو سوچنا بھی گناہ لگ رہا تھا۔ دھوکہ دینا تو اس نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ یا یوں کہیں کہ اس کے خون میں ہی نہیں تھا۔ بچپن میں ہی اس کی ماں کے گزر جانے کے بعد اس کے بابا نے دوسری شادی تک نہیں کی تھی۔ یہ صرف اس کی ماں کے لیے اس کے بابا کی وفا اور محبت نہیں تو اور کیا تھی۔ ورنہ نسل چلانا کون نہیں چاہتا۔

نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی اور کرے گی بھی نہیں۔ رات بھر کروٹ بدلتے بدلتے شروتی نے یہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پرکاش کی ہر ہاں میں ہاں ملائے گی۔ جب تک کہ وہ ایک بار اس کے چنگل سے آزاد نہیں ہو جاتی لیکن گھر جانے کے بعد وہ سب کچھ اپنے بابا کو بتا دے گی۔ صرف اپنی عزت کے لٹنے کا چھپا کر۔ ساتھ ہی کوشش کرے گی کہ اس کمینے آدمی کی منشا کبھی پوری نہ ہو۔ چاہے اس کے لیے اس کو پولیس میں خبر کرنی پڑے۔ چاہے اس کو کالج ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

انہی خیالوں کی اتھل پتھل میں کب سویرا ہو گیا' شروتی کو احساس تک نہیں ہوا۔ اچانک پرکاش کے کروٹ بدلنے پر وہ اٹھ بیٹھی۔

"جاگ گئیں تم؟" پرکاش نے اٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"جی۔"

پرکاش نے اس کی طرف شرارتی انداز سے گھورا اور وہ اس کا مطلب سمجھ کر سہم گئی۔

"پلیز مجھے دیر ہو رہی ہے۔ کالج بھی جانا ہے۔" وہ جلدی سے بول پڑی۔

"ہاں ہاں۔ چھوڑ دوں گا۔ فکر کیوں کرتی ہو میری جان۔ لیکن تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے کیا فیصلہ کیا۔"

"ٹھیک ہے۔" شروتی نے اتنا سا ہی جواب دیا۔

"کیا ٹھیک ہے؟ اس کے بارے میں بتاؤ نا۔ دس کروڑ کے بارے میں کیا سوچا تم نے؟" پرکاش گھاگ نظروں سے اسے گھورتا ہوا بولا۔

"ہاں۔ کہہ تو رہی ہوں کہ جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔" شروتی نے اس بار لفظوں میں کچھ اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم صرف یہاں سے جانے کے لیے ایسا بول رہی ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا۔"

پرکاش نے اس کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔
شروتی کو اس کی بات میں چھپی دھمکی کو بھانپ کر محسوس ہوا کہ جیسے اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہو۔ لیکن وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔
"دس کروڑ کے لیے تو میں دس لوگوں کو بھی الو بنانے کو تیار ہوں اور پھر یہ تو کوئی کام بھی نہیں ہے۔ مجھے اس سے پیار کا ناٹک ہی تو کرنا ہے۔ یا پھر وہی کرنا ہے جو جو تم کہو گے۔"
"گڈ۔ تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ اکثر خوب صورت لڑکیوں میں دماغ کی کمی ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اندر بے پناہ حسن کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ہے۔ دیکھنا ہم دونوں مل کر کیسے روہن کو جال میں پھنساتے ہیں۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "پھر بھی ہو سکتا ہے کہ کل کو تمہارا دل اس کی نادانی اور شرافت دیکھ کر پگھل جائے۔ اس لیے میں یہ پکا کر دینا چاہتا ہوں کہ اب تمہارا اپنے بیچ ہوئے اس اقرار سے مکرنا تمہاری پوری زندگی کو موت سے بھی زیادہ بدتر بنا سکتا ہے۔ ایک منٹ۔" پرکاش اٹھ کر کونے میں رکھے ایل سی ڈی ٹی وی کے پاس گیا اور اس کے ساتھ رکھے ڈی وی ڈی میں سی ڈی ڈال دی اور واپس آ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "یہ کچھ حسین پل ہیں جو تم نے میرے ساتھ گزارے ہیں۔ ٹی وی پر فلم ابھرتے ہی شروتی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ فلم میں شروتی کے ساتھ اس کمرے میں بیتنے والے تمام واقعات کی تفصیل ریکارڈ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں شروتی نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر پرکاش کی جانب دیکھا جو اس کی طرف غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ شروتی کی آنکھوں سے آنسو لڑھکنے لگے۔
"یہ مجھے دے دو پلیز۔"
"ہا...... ہا...... ہا......" پرکاش قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ پھر رک کر بولا۔ "کیا اتنا پیار ہے مجھ سے کہ اسے یادگار کے طور پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہو۔ ڈونٹ وری ڈارلنگ اب تو ہمارا ملنا لگا ہی رہے گا۔ اس کی ایک کاپی تمہیں بھی دے دوں گا۔ یہ بھی وعدہ رہا۔ ایک منٹ...... روہن آج ہی عمر کوٹ جانے کی بات کر رہا تھا۔ میں اس کا فون ملاتا ہوں۔ تم اس سے کہنا کہ تمہارا آج ہی اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ سپنے کے بارے میں بات کرنی ہے۔" کہہ کر پرکاش نے روہن کا نمبر ڈائل کیا۔

......☆☆☆......

پٹھان والی سیٹ پر جہاں اب وہ دونوں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ نیچے پڑا ہوا موبائل ہلنے لگا۔ فون وائبریشن پر سیٹ کیا ہوا تھا۔ پرکاش نے کئی بار نمبر ٹرائی کیا اور آخر میں غصے سے اپنے فون کو بستر پہ پٹخ دیا۔
"لگتا ہے ابھی تک سو رہا ہے۔ چلو بعد میں ٹرائی کرتے ہیں۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ نہیں تو کالج پہنچنے میں لیٹ ہونے پر تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گی۔ ہی ہی ہی۔"

......☆☆☆......

"ایک منٹ رک جانہ یار۔ ان کو اترنے دے۔" میر پور خاص بس اسٹینڈ پر اترتے وقت رویندر نے روہن کے کندھے پر ٹنگے بیگ کو پکڑ کر کھینچ لیا۔
"کیوں؟" اب کیا کسر رہ گئی ہے۔ جلدی چل اور پتا کر کے آ عمر کوٹ کے لیے بس کہاں سے ملے گی۔" روہن نے اس کو لگ بھگ گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "سارے راستے تم نے ان کی ناک میں دم کیے رکھا۔ اب ان کا علاقہ آ گیا ہے۔ یہاں تمہیں چھوڑیں گی نہیں دیکھ لینا۔"
"ہائے ہائے۔ کیا بات ہے میرے یار کی۔ علاقہ ہی نہیں سچ پوچھو تو میں بھی اب ان کا ہی ہو گیا ہوں۔ خاص طور پر اس لال مرچی کا۔ دیکھا نہیں تم نے۔ پیچھے مڑ کر ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کھا جائے گی وہیں۔ اف یہ تھر کی لڑکیاں۔" رویندر نے پیچھے مڑ کر بس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
لڑکیاں ابھی بس سے اتری نہیں تھیں۔ جیسے ہی ریتو اترنے لگی۔ اس کو پیر کے نیچے کچھ محسوس ہوا۔ یہ موبائل فون تھا۔
"اوہ یہ کس کا رہ گیا؟"
"ڈرائیور کو دے دو ریتو۔ شاید بیچارے خان صاحب کا ہو گا۔ واپس آئے گا تو ڈرائیور سے ہی پوچھے گا۔" دوسری لڑکی نے ریتو سے کہا۔
"تم پاگل ہو گیا۔ اتنا مہنگا فون۔ کوئی واپس نہیں کرے گا اس کو۔ جس کا بھی ہو گا وہ اس نمبر پر فون تو کرے گا ہی۔ تبھی ہم بتا دیں گے کہ فون ہمارے پاس ہے۔ آ کر لے جاؤ۔" ریتو نے سمجھداری کی بات کہی۔
"ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے...... اے...... اس لڑکے کا تو نہیں ہے یہ فون؟ دیکھ ہماری طرف ہی آ رہا ہے۔" لڑکی نے بس سے اترتے ہی رویندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
ریتو رویندر کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئی۔ "آنے دو اس کو۔ اس کو تو میں ایسا فون دوں گی کہ سپنے میں بھی یاد کرے گا مجھے۔ تم چپ رہنا بس۔" ریتو نے فون اپنے پرس میں ڈال لیا۔
ریتو کے پاس آتے ہی رویندر اس کے تیور دیکھ کر سٹپٹا سا گیا۔ وہ لگاتار اس کو گھورے جا رہی تھی۔ رویندر کی ٹون اچانک بدل گئی۔
"آپ تو برا مان گئیں۔ میں نے تو یونہی آپ کو اپنا مان کر آپ سے مذاق کیا تھا تا کہ سفر اچھا گزرے۔"
پہلی بار رویندر کے منہ سے ایسی بات سن کر ریتو کے تیور بھی بدل گئے۔
"اچھا۔ ایک ہم ہی اپنے سے لگے آپ کو پوری بس میں؟"
"اجی میرا کیا ہے۔ میں تو ابھی بالکل کنوارا ہوں۔" رویندر نے کنوارے پر خاص طور سے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو سبھی اپنی ہیں۔ جب تک کوئی لپیٹتی نہیں۔ ویسے یہ عمر کوٹ کے لیے بس کہاں سے ملے گی؟"
"عمر کوٹ؟ تم۔" دوسری لڑکی بولنے لگی تھی کہ ریتو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبوچ لیا۔
"پہلی بار آئے ہو کیا اس علاقے میں؟" ریتو نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"اور نہیں تو کیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ خدا نے تم سے ملانے کے لیے ہی یہاں کھینچ لیا ہے۔ اس روہن کی وجہ سے۔ میرا نام رویندر ہے آپ کا؟"
ریتو کے میٹھا بولتے ہی رویندر سیدھا لائن بازی پر اتر آیا۔
"انارکلی! اچھا ہے نا۔" ریتو یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔
"جی بہت پیارا ہے۔ کاش میرا نام سلیم ہوتا۔ اور ان کا۔" رویندر نے دوسری لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"گلابو! تم راستہ پوچھنے آئے تھے یا۔" ریتو اب پک گئی تھی۔
"جی پلیز۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔" رویندر نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔
"تمہیں گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ سامنے ملے گی؟" ریتو نے منہ بنا کر کہا۔
"اجی ہمیں تو پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔

بس آپ کی عنایت کی ضرورت ہے۔" رویندر جاتے جاتے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آیا۔

دوسری لڑکی جسے گلابو کہا گیا تھا' نے رویندر کے جاتے ہی ریتو کو گھورا۔ "تم نے ان کو جھوٹ کیوں بولا۔ بس تو چلنے ہی والی ہوگی۔ اس کے بعد جانے کب آئے؟"

"کیا بات ہے۔ بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔ کون سا پسند آ گیا۔" ریتو نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتا ہے ریتو کہ مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ پھر کیوں۔" گلابو ناراض سی ہوتے ہوئے بولی۔

"ارے یار۔ مذاق بھی نہیں کر سکتی کیا؟ اگر میں اس کو الو نہیں بناتی تو وہ پھر سے ہمیں پکاتے ہوئے چلتے۔ ساتھ ساتھ۔ چلو اب جلدی کرو۔ بس نکل گئی تو۔"

دونوں جا کر بس میں بیٹھ گئیں جو چلنے کو تیار ہی تھی۔ اور بس چل پڑی۔ ریتو نے بس میں بیٹھتے ہوئے ہی رویندر کو ٹھینگا دکھا کر چڑایا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"یار اگر ان کی بس نہیں چلتی تو یہ انارکلی تو پٹ پٹائی تھی۔" رویندر نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔ تجھے لگتا ہے کہ تُو اس جنم میں کوئی لڑکی پٹا پائے گا؟" روہن مسکرا کر بولا۔

"ارے کیا بات کر رہے ہو یار۔ تم نے وہ...... کیا کہتے ہیں...... تم نے وہ مقولہ نہیں سنا کہ "لڑکی ہنسی تو پھنسی۔" دیکھا نہیں تم نے اسے میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے۔" رویندر کہاں ہار ماننے والا تھا۔

"ہاں ہنس تو رہی تھی۔ چل چھوڑ یار اب گھنٹہ بھر انتظار کیسے ہوگا۔ اور کوئی گاڑی نہیں جاتی کیا عمر کوٹ؟" روہن کو عمر کوٹ پہنچنے کی جلدی تھی۔

"یار یہ میر پور خاص تک کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ عمر کوٹ میں تمہاری کون سی اپائنٹمنٹ ہے جہاں جانے کے لیے بس کا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے۔" رویندر نے کہا اور اخبار بیچنے والے لڑکے کو دیکھ کر اسے آواز دی۔ ہاکر لڑکا بھاگا بھاگا آیا۔

"جی صاحب۔ کون سا دوں؟"

"یہ عمر کوٹ کے لیے بس کب جائے گی۔ اور کوئی گاڑی نہیں جاتی کیا وہاں۔" روی نے پوچھا۔

"ابھی آپ کے سامنے ہی تو گئی ہے صاحب یہیں سے۔ عمر کوٹ والی۔ ویسے باہر جا کر کسی سے بھی لفٹ کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ ہم تھر کے لوگ بڑے دل والے ہوتے ہیں۔ اخبار کون سا دوں۔"

"ہوں۔ بہت بڑے دل والے ہوتے ہیں تھر کے لوگ۔ اگر تمہاری کسی اخبار والے سے سیٹنگ ہے تو ایک خبر چھپوا دینا۔ ایک سڑی سی تھری لڑکی ہمیں الو بنا کر چلی گئی...... چلو۔ لاؤ کوئی سا بھی دے دو۔" رویندر نے کہتے ہوئے روہن کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

"اب سمجھ آیا کہ کیوں ہنس رہی تھی وہ۔ کہتا ہے ہنسی تو پھنسی۔ چل آ جا باہر۔ اب لٹک کر چلتے ہیں۔ لفٹ لے کر۔" روہن باہر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"میری کیا غلطی ہے یار۔" رویندر سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"نہیں نہیں غلطی تو میری ہے جو تمہیں ساتھ لے آیا۔ ابے ان سے ہی راستہ پوچھنا تھا تمہیں۔"

روہن اور رویندر باہر آ کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک لمبی سی گاڑی ان کے پاس آ کر رکی۔ گاڑی کا شیشہ نیچے ہوا اور اندر بیٹھے ایک بہت ہی اسمارٹ نوجوان نے ان سے پوچھا۔

"بھائی صاحب۔ یہ عمر کوٹ کتنی دور ہے۔"

روہن بولنے ہی والا تھا کہ رویندر نے جھٹ سے اندر ہاتھ دے کر دروازہ کھولا اور لپک کر اندر بیٹھ گیا۔

"کیا ہے بھائی صاحب۔" نوجوان نے آنکھوں سے چشمہ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"رویندر نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور پچھلا دروازہ بھی کھول دیا۔ "بیٹھ جاؤ روہن۔ بھائی صاحب ہم بھی عمر کوٹ ہی جا رہے ہیں۔" روہن نے اس نوجوان سے نظریں ملائیں تو اس نے اپنے کندھے اچکا دیئے۔ روہن کار کے اندر بیٹھ گیا اور نوجوان نے گاڑی دوڑا دی۔

"کتنی دور ہوگا عمر کوٹ یہاں سے؟" نوجوان نے پھر پوچھا۔

"آگے چل کر پوچھ لیتے ہیں نا۔ ٹینشن نہ لو بھائی۔ اب میں ساتھ ہوں نا۔" رویندر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یعنی تمہیں بھی نہیں پتا؟" نوجوان نے چہرہ گھما کر رویندر کو غور سے دیکھا۔

"ہوں۔ ایسا ہے بھائی صاحب۔ ایکچوئلی ہم بھی پہلی بار ہی آئے ہیں۔ میں نے سوچا ایک سے بھلے تین۔ آپ کی بھی مدد ہو جائے گی اور ہم بھی پہنچ جائیں گے۔" رویندر نے جواب دیا۔

"کمال کے آدمی ہو یار' لو سگریٹ پیتے ہو؟" نوجوان نے سگریٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نا بھئی نا۔ اور جب تک ہم گاڑی میں ہیں اس کو سلگانا بھی مت۔" رویندر نے گاڑی پر ہی قبضہ سا کر لیا۔

نوجوان نے اچانک بریک لگا دی اور رویندر کو گھور کر دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا بھائی! آگے چل کر پوچھ لیتے ہیں نا۔"

رویندر نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر واپس پیکٹ میں ڈال دی۔

نوجوان کچھ حیرت زدہ سا لگ رہا تھا۔ اچانک قہقہہ لگا کر زور زور سے ہنسنے لگا اور گاڑی چلا دی۔

"نام کیا ہے آپ کا؟" رویندر سے زیادہ دیر چپ بیٹھا نہیں گیا۔

"سمیر۔" نوجوان نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر پوچھا۔ "اپنا بھی بتا دو یار۔ تم ویسے بھی مانو گے نہیں بنا بتائے۔"

"رویندر...... اور یہ جو پیچھے بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ یہ روہن ہے۔ میرا سب سے پیارا دوست۔ یہ مت سمجھنا کہ یہ غصے میں ہے۔ دراصل قریب دو مہینے سے اس کی شکل ہی ایسی رہتی ہے۔"

"ایسا کیا ہو گیا تھا بھائی۔ گرل فرینڈ روٹھ گئی تھی کیا۔" سمیر نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی۔ آپ ابھی تک بھی نہیں سمجھے کیا اس کو۔ یہ ایسا ہی ہے۔ اس کی کسی بات کا برا مت ماننا۔" روہن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پہلی بار بولا۔

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ ویسے عمر کوٹ میں کوئی رشتے داری ہے کیا؟" سمیر نے پوچھا۔

روہن کے بولنے سے پہلے ہی رویندر بول پڑا۔ "رشتے داری؟ اجی مجھے تو ابھی یہ بھی نہیں پتا کہ فٹ پاتھ پر سلائے گا یا کوئی ہوٹل بھی نصیب ہوگا کہ نہیں۔ جانے کیا رکھ کر بھول گیا ہے عمر کوٹ میں۔"

"جہاں میں سوؤں گا وہاں تو سلا ہی لوں گا۔ اب تیرے لیے وہاں ہوٹل تو کھولنے سے رہا میں۔" روہن نے کہا۔

"ویسے بتا دو یار کہ جا کس کام سے رہے ہو۔" سمیر کو جاننے کی جستجو ہو رہی تھی۔

"ابھی مجھے بھی نہیں بتایا تو تمہیں کیا بتاؤں۔

ویسے پانچ سات دن کا کام بول رہا ہے۔ اب بتا بھی دو یار کیوں دماغ کے کیڑوں کو بے چین کر رہا ہے۔" روبندر، روہن کو دیکھتے ہوئے بولا۔

روہن کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کو کچھ نا بولتا دیکھ کر سمیر ہی بول دیا۔

"ویسے اگر پانچ سات دن کی بات ہے تو تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہاں میرے دوست کی کوٹھی ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ اگر تمہارے سیکرٹ مشن پر کوئی آنچ نہ آ رہی ہو تو؟"

"تھینکس یار۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ کمال کے ہو۔ بنا جانے پوچھے ہی ساتھ رہنے کی آفر کر دی۔ اپنی خوب جمے گی لگتا ہے۔" روبندر نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہیں جاننے میں کسی کو وقت ہی کتنا لگ سکتا ہے۔" سمیر نے کہا اور ہنسنے لگا۔

روہن بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اچانک گاڑی کے بریک لگتے ہی روہن اور روبندر کا دھیان آگے کی طرف گیا۔

"اوہ تیری۔ یہ تو وہی بس ہے۔" روی نے کہا۔

بس سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ اس کے سامنے ٹریکٹر کھڑا تھا۔ شاید بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بس کے پاس ہی آٹھ دس سواریاں کھڑی تھیں۔ ان میں ہی روبندر کی انارکلی اور وہ گلابو بھی تھیں۔ روبندر کا دھیان سیدھا ان ہی پر گیا۔

"ایک منٹ روکنا سمیر بھائی۔ روبندر نے کہا اور باہر منہ نکال کر زور سے آواز لگائی۔ "آ جاؤ۔ آ جاؤ۔" جیسے ان کی پرانی جان پہچان ہو۔

لیکن سمیر کو اب کی بار غصہ نہیں آیا۔ وہ بس روبندر کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔ روبندر کے آواز لگاتے ہی ان دونوں لڑکیوں کو چھوڑ کر سبھی لوگ بھاگ بھاگے آئے۔

"شکریہ سائیں۔" ان میں سے ایک سواری نے پاس آتے ہی کہا۔

"ارے سائیں کرائے کی نہیں ہے۔ اپنی ہے اپنی۔" روبندر نے کہا اور کار سے اتر کر ان دونوں لڑکیوں کی طرف بڑھا۔ "آ بھی جاؤ۔ کب تک کھڑی رہو گی۔ بس تو ایک گھنٹے کے بعد آئے گی نا۔"

دونوں لڑکیوں نے جھینپ کر اپنا منہ پھر لیا۔ کچھ دیر پہلے ہی تو ریتو نے اس کو الو بنایا تھا۔

"سوچ کیا رہی ہو انارکلی اینڈ کمپنی۔ یہ سوچنے کا نہیں گاڑی میں بیٹھنے کا وقت ہے۔ جلدی کرو۔ آ جاؤ۔ میں گاڑی کو دو منٹ سے زیادہ رکوا نہیں پاؤں گا۔" روبندر نے کہا اور گھوم کر واپس چلنے لگا۔

"کیا کریں۔ چلیں؟" ریتو نے پوچھا۔

"تم پاگل ہو گیا۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ انجان لڑکوں کے ساتھ ہم گاڑی میں کیسے بیٹھیں۔ ذرا سوچ کے بولا کر۔" دوسری لڑکی نے صاف منع کر دیا۔

"ارے انجان ونجان کچھ نہیں ہیں اور پھر اب اندھیرا بھی ہونے والا ہے۔ ساری بسیں بھری ہوئی آ رہی ہیں۔ کب تک انتظار کریں گے؟ جہاں تک اس الو کی بات ہے۔ اس کو میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اس کی بس بولنے کی عادت ہے۔ کچھ کرنے ورنے کا دم نہیں اس میں۔ اور دوسرا لڑکا تو ایک دم شریف ہے۔ وہ تو کچھ بولتا بھی نہیں ہے۔ چل نا کچھ نہیں ہوتا۔" ریتو نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے گردن گھما کر گاڑی کی طرف دیکھا اور کچھ دیر رک کر ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ان کے کار کے پاس پہنچتے ہی روہن نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہو گیا۔

"تم بیٹھو پہلے۔" دوسری لڑکی نے ریتو سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ریتو روہن کے ساتھ بیچ میں بیٹھ گئی۔

اس لڑکی کے بیٹھنے کے ساتھ ہی سمیر نے کار چلا دی۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ لیکن روبندر تھا نا۔ کار کے چلتے ہی شروع ہو گیا۔

"ان سے ملیے بھائی صاحب۔ ایک ہے انارکلی اور دوسری گلابو۔ اگر آج یہ نا ہوتی تو ہم اور آپ نہیں مل پاتے۔ اور نہ ہی ہمارا عمر کوٹ میں رہنے کا اتنا اچھا انتظام ہوتا۔" کہہ کر روبندر ہنسنے لگا۔

"ایسا کیوں؟" سمیر نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"وہ تو تم انہی سے پوچھ لو۔ ورنہ میں تو بتاؤں گا ہی۔ نمک مرچ لگا کر۔ بتا دو اب۔ انجان مسافروں کو الو بنانے کا قصہ۔"

لڑکیاں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ سمیر نے بات کو وہیں چھوڑ دیا اور پوچھنے لگا۔

"ویسے جانا کہاں تھا آپ کو؟"

"جی۔ عمر کوٹ۔" ریتو نے سر جھکائے ہوئے ہی جواب دیا۔

"ہوں۔ یعنی ہم سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔" سمیر نے یہ کہہ کر کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

.......☆☆☆.......

"کہو تو گھر چھوڑ آئیں۔" عمر کوٹ پہنچتے ہی لڑکیوں نے کار روکنے کو کہا تو روبندر نے چٹخارہ لیا۔ بنا کچھ بولے لڑکیاں کار سے اتر گئیں۔ پھر اچانک واپس مڑتے ہوئے ریتو آگے آئی اور بولی۔ "شکریہ اور سوری۔"

"کیا لڑکیاں تھیں یار۔"

"یہ کہاں مل گئیں تمہیں۔" سمیر نے لڑکیوں کے جاتے ہی روبندر سے سوال کیا۔

"کیسی لڑکیاں تھیں یار۔ احسان مند ہونا چاہئے تھا ان کو کہ میں ساتھ لے آیا۔ خالی شکریہ بول کر چلی گئیں۔ کم سے کم اپنا موبائل نمبر تو دے کر جاتیں۔" روبندر نے کہتے ہوئے اس طرح منہ بنایا جیسے سچ مچ میں اس کو ان کا چلا جانا اچھا نہیں لگا ہو۔

موبائل کا لفظ سن کر روہن کو ایک فون کرنے کی سوجھی۔ اور جیب کو ہاتھ لگاتے ہی وہ اچھل پڑا۔

"اوئے میرا فون؟"

"کیا ہوا؟" سمیر اور روبندر ایک ساتھ بول پڑے۔

"موبائل گیا۔ کہیں نکل گیا شاید۔" اپنی شرٹ اور پینٹ کی سبھی جیبوں کو ٹٹولنے کے بعد روہن نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ۔" روبندر کے منہ سے نکلا۔ "اب۔"

"ایک منٹ۔ نمبر بتانا۔" سمیر نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

روہن کے نمبر بتانے پر سمیر نے ڈائل کیا۔

"ہوں۔ فون تو یار کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگ گیا۔ سوئچ آف آ رہا ہے۔" کہتے ہوئے اچانک موبائل اسکرین پر دیکھتے ہوئے سمیر لگ بھگ اچھل ہی پڑا۔

"آپ۔ روہن ہیں؟"

"اور میں روبندر۔ ابھی بتایا تو ہے بھائی۔" روہن کے بولنے سے پہلے ہی روبندر نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ روہن اسٹیٹ کے مالک روہن ہیں؟" سمیر نے چونکتے ہوئے کار کو بریک لگائے۔

"مالک تو میرے والد ہیں۔ میں تو صرف ان کا

وارث ہوں۔ ابھی میں نے آفس جانا بھی شروع نہیں کیا۔ پڑھ ہی رہا ہوں ابھی تک۔ لیکن آپ کو یہ سب کیسے پتا؟'' روہن کی دلچسپی اپنے موبائل سے ہٹ کر سمیر پر آ گئی۔

''میری آپ سے بات ہوئی تھی۔ کچھ دن پہلے۔ ڈیفنس فیز VIII میں آپ کے نئے پروجیکٹ کی حصے داری پر...... یاد ہے؟ آپ نے اپنے والد کا نمبر دیا تھا اور ہاں۔ آپ نے اپنا نام بھی روہن ہی بتایا تھا۔''

''سوری مجھے یاد نہیں آ رہا۔ دراصل پاپا نے میرا نمبر بھی وزیٹنگ کارڈ پر ڈال رکھا ہے۔ اس لیے اکثر جب ان کا فون آف رہتا ہے تو میرے پاس کال آ جاتی ہے۔''

ہوں۔ میں نے بھی آپ کا نمبر کارڈ سے ہی لیا تھا۔ اور آپ کے نام بتانے پر میں نے وہ نمبر روہن آر اے کے نام سے سیو کر لیا تھا۔ کمال ہو گیا یار۔ مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ میں اتنے بڑے آدمی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔'' سمیر حقیقت میں حیرت زدہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ روہن کی طرف بڑھایا جسے روہن نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

''پھر۔ بات بنی کہ نہیں۔'' رویندر نے سمیر کو ٹوکا۔

''کس بارے میں؟'' سمیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پارٹنرشپ کے بارے میں اور کیا؟''

''ہاں۔ وہ تو پہلے ہی ڈن تھی۔ صرف کچھ فارملیٹیز باقی تھیں۔'' سمیر نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا یار۔ اب ہم تینوں پارٹنر ہیں۔ اب تمہارے پاس رہ کر مفت کا کھاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔''

''مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہاں عمر کوٹ میں؟ اور وہ بھی بس سے؟'' سمیر کے دماغ میں ابھی بھی کافی سوال تھے۔

''سب اس کے کرتوت ہیں۔ کہتا تھا ڈرائیور کو لے کر نہیں چلنا ہے اور اتنی دور کار چلانا اس کے لیے عذاب ہے۔'' رویندر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی یار۔ یہاں اس چھوٹے سے شہر میں ایسا کیا کام نکل آیا؟'' سمیر نے پوچھا۔

رویندر نے پیچھے مڑ کر روہن کی طرف ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔ ''اب تو بتا دو گرو۔ اب تو آپ کا عمر کوٹ بھی آ گیا۔''

رویندر کو تو بتانا ہی تھا۔ اور سمیر کو بتانے میں بھی روہن کو کوئی حرج نظر نہیں آیا۔

''دراصل میں ایک لڑکی کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''اوئے۔ تیری تو۔ تم نے ایک لڑکی کے لیے مجھے اتنی دور تک گھسیٹا' یہ حالت بنائی۔ وہاں کراچی میں لڑکیوں کی کمی ہے کیا اور کالج میں تم پر کتنی لڑکیاں لٹو ہو چکی ہیں۔ ان کی گنتی بھی یاد ہے تمہیں۔ وہاں تو بھولے بابا بنے رہتے ہو اور لڑکی کے لیے آیا ہے یہاں۔ مجھے نہیں چلنا تیرے ساتھ۔ اتار نیچے ابھی۔ گاڑی روکو سمیر بھائی۔ ابھی کے ابھی گاڑی روکو۔'' رویندر جانے کیا کیا بولنے لگا۔

سمیر نے بیچ میں ہی کار کو بریک لگا دیئے۔

''مذاق کر رہا ہوں یار۔ چل نا جلدی۔ بہت بھوک لگی ہے اور پیاس بھی۔'' رویندر نے سمیر کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہنسنے لگا۔ سمیر بھی مسکرا دیا۔

''اور کہاں چلیں۔ آ تو گئے منزل پر۔''

''اوہ۔ مجھے لگا کہ شاید زبردستی اتارنے کے لیے کار روکی ہے۔'' رویندر مسکرایا اور کار سے اتر گیا۔

روہن کے باہر نکلتے ہی رویندر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کو ایک طرف لے گیا۔

''یہ لڑکی کا کیا معاملہ ہے بھائی۔''

''بتاتا ہوں یار۔ سب بتاتا ہوں۔'' روہن نے کہا اور تینوں مل کر سامنے والی تین منزلہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔ گیٹ پر ہی انہیں چوکیدار نے روک لیا۔

''کس سے ملنا ہے سائیں۔''

''اسی الو کے پٹھے سے جو اس گھر کا مالک ہے۔ امان سے۔ گیٹ کھول بھی دے یار۔'' سمیر نے چڑتے ہوئے کہا۔

''مگر...... مگر صاحب تو مصروف ہیں سائیں۔ ان کا حکم ہے کہ مزید ایک گھنٹے تک کسی کو بھی مت آنے دینا۔''

''کسی معشوقہ کے ساتھ ہو گا۔ شراب اور لڑکی کے علاوہ وہ کچھ کرتا بھی ہے۔'' سمیر زیر لب بڑبڑایا اور فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''اوئے یار سمیر۔'' امان تیزی سے چلتا ہوا نیچے اتر کر آ ہی رہا تھا کہ سمیر ان دونوں کو لے کر اوپر پہنچ گیا۔ برمودہ اور بنیان میں وہ آتے ہی سمیر سے لپٹ گیا۔

''سالے ننگے۔ آج تو کم از کم انتظار کر لیتا۔ صبح صبح ہی چالو ہو گیا تھا کیا؟'' سمیر نے مذاق میں کہا۔

''ہی ہی ہی نہیں تو۔'' امان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں تو مطلب؟ اور کیا شراب کی اسمیل کا پرفیوم لگانے لگا ہے؟'' سمیر نے اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر سونگھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار وہ چھوٹا سا پروگرام بن گیا تھا۔'' امان نے کہا اور روہن اور رویندر سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بھائی؟''

''بھائی ہی سمجھ لے۔'' سمیر یہ کہتے ہوئے اس کے بیڈ روم کی طرف جانے لگا۔

''یار۔ یہاں نہیں۔ چل نیچے ہی بیٹھتے ہیں۔'' امان نے سمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیوں؟ یہاں کیوں نہیں دیکھوں تو سہی برانڈ کون سا لے رہا ہے آج کل۔ اس علاقے میں انڈیا سے اسمگل ہونے والی شراب آسانی سے مل جاتی ہے نا۔'' سمیر زبردستی بیڈ روم میں گھس گیا۔ اندر جاتے ہی باہر کھڑے تینوں کو اس کے زوردار قہقہے سنائی دیے۔ اگلے ہی پل وہ واپس باہر تھا۔ اس کی ہنسی تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہنستے ہنستے ہی بولا۔

''ابے دو دو ایک ساتھ۔'' پھر پاس آ کر دھیرے سے بولا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ ایک دن تم اتنے کمینے ہو جاؤ گے۔''

امان' رویندر اور روہن کے سامنے شرما رہا تھا۔

''ایسے مت بول یار۔ میری گرل فرینڈز ہیں۔''

''میں نے چہرہ نہیں دیکھا۔'' سمیر کہہ کر چپ ہوا ہی تھا کہ رویندر نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔

''دو دو گرل فرینڈز ایک ساتھ۔ کیسے مینج کرتے ہو بھائی؟''

''کیا کریں یار۔ اپنا دل ہی اتنا بڑا ہے۔ چلو نیچے چلتے ہیں۔ ان کو آرام کرنے دو یہیں۔'' امان نے کہا اور ان کو لے کر نیچے چلا آیا۔

نیچے آتے ہی ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے امان نے رویندر اور روہن سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تھوڑی بہت چلے گی کیا......؟ یا کھانا لگانے کا بول دوں۔''

روہن نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رویندر کا

دھیان اوپر سے نیچے نہیں آرہا تھا۔
"وہ دونوں پرسنل ہیں یا ٹائم پاس؟"
امان پر نشے کا ہلکا ہلکا سرور تو تھا ہی۔ اس نے کسی واعظ کی طرح بیان شروع کر دیا۔
"سچ پوچھو تو میں خود ہی پرسنل نہیں ہوں یار۔ لڑکیاں کیا خاک پرسنل ہوں گی۔ بس زندگی جیسے چلا رہی ہے۔ ویسے چل رہا ہوں۔ صورت دیکھ کر لڑکیاں پٹ جاتی ہیں اور پیسہ دیکھ کر سب کچھ کرنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ لڑکیوں کے معاملے میں سیریس ہونا تو ایک دم پاگل پن ہے۔"
"یہ ہوئی نا بات یار۔ تم ایک دم صحیح آدمی ہو۔ ایک اس کو دیکھو۔ ایک لڑکی کے چکر میں دھکے کھاتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔" روہن کے لاکھ اشارہ کرنے پر بھی رویندر کہے بنا نہیں مانا۔
امان بھی سمجھ دار لڑکا تھا۔ دو منٹ پہلے کہی گئی اپنی بات سے مکر گیا۔ "وہ تو اپنی اپنی مینٹالٹی ہوتی ہے یار اور ہو سکتا ہے اس کو قسمت سے کوئی سچا پیار کرنے والی مل گئی ہو۔ مگر ایسی ہوتی ہزاروں میں ایک آدھ ہی ہے۔ ورنہ تو...... اب بس کیا کہوں ان اوپر والی لڑکیوں کو ہی دیکھ لو۔"
"دیکھ لوں؟" رویندر تو جیسے اس کی بات پکڑنے کے لیے منہ کھولے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی رویندر نے مثال کے طور پر ان لڑکیوں کا نام لیا۔ جھٹ سے رویندر نے "دیکھ لو۔" پکڑ لیا۔
"کیا؟" امان نے رویندر کی طرف دیکھا۔
"لڑکیوں کو۔ آپ نے ہی تو کہا ہے۔ اوپر والی لڑکیوں کو دیکھ لو۔" رویندر نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔
"تم بھی ایک نمبر کے آدمی ہو یار! جاؤ دیکھ لو۔ مگر دیکھ بھائی۔ کوئی اونچ نیچ ہوتی دکھائی دے تو چپ چاپ واپس آ جانا۔ ان لڑکیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کب ناٹک کرنے لگ جائیں۔ کب پچھاڑی ماردیں۔" امان نے ہنستے ہوئے رویندر کو اندر سے ہی اوپر جانے کا راستہ دکھا دیا۔
"میں چلوں کیا ایک بار ساتھ میں؟"
"نہیں یار۔ تم بیٹھو۔ تمہارا دوست آیا ہے۔ میں اکیلا ہی ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔" رویندر نے کہا اور مستی میں گنگناتے ہوئے اوپر چلا گیا۔
"کمال کا آدمی ہے یار۔ میری ایسے لوگوں سے بہت بنتی ہے۔" امان نے کہا اور پھر روہن کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم ایسے گم صم کیوں بیٹھے ہو یار۔ موج مستی کرو۔ کل اپنی والی لڑکی سے بھی مل لینا۔ ٹھیک ہے نا؟"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے یار۔ بس میں ٹھیک ہوں۔ رویندر کی باتوں کا برا مت ماننا یار۔ وہ ذرا منہ پھٹ ہے۔ جو من میں آیا بول دیتا ہے۔" روہن نے کہا۔
"یہ کیا بات کہہ دی یار۔ اگر دوبارہ ایسا بولا تو برا مان جاؤں گا۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں اور پھر سمیر کے یار تو مجھے بھی عزیز ہوں گے ہی۔ یہ سمیر کہاں چلا گیا؟" اچانک امان کا دھیان سمیر پر گیا۔
"کہیں وہ بھی اوپر تو نہیں پہنچ گیا؟"
"یہیں ہوں بے۔ فریش ہو رہا تھا۔ صبح سے چلا ہوا ہوں۔" سمیر باتھ روم سے نکلتے ہوئے بولا۔
"صرف فریش ہی ہو رہا تھا یا۔" امان یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔
"ابے چپ۔ ہمیشہ بکواس ہی کرتا رہتا ہے۔ وہ رویندر بھائی کہاں گیا۔" سمیر نے روہن کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"اوپر۔" روہن کہتے ہوئے مسکراہٹ کو چہرے پر آنے سے نہیں روک پایا۔

......☆☆☆......

رویندر دبے قدموں چلتا ہوا بیڈ روم کے قریب آیا۔ دروازے کے سامنے آتے ہی لڑکیوں سے اس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ شاید وہ نکلنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انجان لڑکے کو سامنے پا کر وہ چونک اٹھیں اور ایک دم سے اپنا چہرہ گھما کر اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئیں۔ ادھر لڑکیوں کا حسن اور کرارا بدن دیکھ کر رویندر بھی ہکا بکا رہ گیا۔ لگ بھگ ایک ہی قد کاٹھی کی وہ لڑکیاں بمشکل بیس اکیس سال کی ہوں گی۔ ایک دم گوری چٹی لمبی لڑکیوں کا بھرا بھرا بدن دیکھ کر رویندر کے منہ میں پانی آ گیا۔ دونوں نے جینز پہن رکھی تھی۔ ایک لڑکی نے جین پر کرتا ڈال رکھا تھا۔
"ہیلو۔"
جب لڑکیوں کو نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں سوجھا تو مجبوراً ان کو پلٹنا ہی پڑا۔ جواب میں ہائے کہہ کر لڑکیاں رویندر کے برابر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگیں۔
رویندر نے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ لیے۔
"ایسے کہاں بھاگی جا رہی ہو یار۔ تعارف تو ہو جائے ایک بار۔"
کرتے والی نے چہرہ نیچے کیے ہوئے ہی نظریں اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔
"ہمیں جانے دو۔ ہم لیٹ ہو رہی ہیں۔" ان کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ سہمی ہوئی سی ہیں۔
"نام کیا ہے تمہارا؟" رویندر نے کرتے والی کی ہی کلائی پکڑ لی۔ دوسری ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔
"امان۔" لڑکی ہلکی سی چیخی اور کوئی راستہ نہ پا کر ٹون بدل لی۔ "پلیز جانے دو نا۔ سچی میں ہم لیٹ ہو رہی ہیں۔ گھر جانا ہے۔" کلائی موڑ کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے رویندر کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"اور اگر ٹوٹ گئی تو؟ اتنی نازک ہے۔ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ دو چار منٹ سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آؤ۔" رویندر نے دوسری لڑکی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے بستر پر جا کر بیٹھ گئیں۔
تینوں کے پاؤں لٹکے ہوئے تھے۔ رویندر دونوں کے بیچ میں بیٹھا تھا۔
"پلیز ہمیں چھوڑ دو۔ ہم ایسی لڑکیاں نہیں ہیں۔" دوسری لڑکی نے اپنی کمر کو ہلاتے ہوئے رویندر سے دور ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر رویندر نے ایک جھٹکے سے اسے دوبارہ کھینچ لیا۔
"اوئے ہوئے۔ صدقے جاؤں۔ اور کیسی لڑکیاں ہو تم؟" رویندر نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تم ہوتے کون ہو ہم سے ایسی بات کرنے والے۔ ہم آپ کو جانتی بھی نہیں ہیں۔ امان کہاں ہے۔ اس کو بلاؤ۔"
"کیا......؟ تم سچ میں مجھے نہیں جانتی ہو۔ امان نے تمہیں بتایا نہیں؟" رویندر نے حیرت زدہ سا ہوتے ہوئے ناٹک کیا۔
"دونوں لڑکیوں نے چونک کر اس کو دیکھا۔ مگر ان کی سمجھ میں بات آئی نہیں۔
"کیوں؟ ہمیں کیوں بتائے گا؟ ہمیں کیا لینا دینا آپ سے؟"
وہ دونوں مسلسل اس کی گرفت سے چھوٹنے کی

کوشش کر رہی تھیں۔

"ارے تمہیں میرے لیے ہی تو بلایا تھا اس نے۔ اور امان نے تم کو بتایا بھی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ عمر کوٹ جیسے علاقے میں بھی تم جیسی ماڈرن لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔ امان کو بتانا چاہیے تھا نا تم کو۔"

رویندر کی یہ بات سن کر وہ عجیب سی نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے اپنی کشمکش بھول گئیں۔

"آپ کے لیے...... کیا بکواس کر رہے ہو؟ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔" کرتے والی نے کہا۔

"ہاں مجھے پتا ہے اور تم بھی اس سے بہت پیار کرتی ہو۔ اسی لیے تو تمہیں میرے لیے بلایا ہے۔ تمہاری خاطر ہی۔" رویندر نے باری باری سے ان دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ مگر بات شاید ان کے سر کے اوپر سے نکل گئی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کیوں ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔ پلیز جانے دیجئے نا۔" کرتے والی نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"حد ہے یار۔ لگتا ہے مجھے ہی سب کچھ بتانا پڑے گا اب۔ وہ کیا ہے کہ پچھلی بار جب تم آئی تھیں تو میں نے جنگلے سے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر تمہاری مووی بنا لی تھی۔" رویندر نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو سیدھا نشانے پر جا لگا۔ اس کی بات سن کر جیسے کرتے والی لڑکی کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ یکا یک پیلا پڑ گیا۔

"کک...... کیا؟"

"ہاں اور نہیں تو کیا؟ میں تو آج فری بھی نہیں تھا۔ ایک دوست کا اس کی گرل فرینڈ کے ساتھ پارک میں ایم ایم ایس بنانے جانا تھا مجھے۔ مگر امان اڑ گیا۔ بولا آج ہی آ جاؤ۔ میں نے بلا لیا ہے لڑکیوں کو۔ اب وہ تم سے پیار ہی اتنا کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ تمہاری وہ فلم گھر گھر میں دیکھی جائے۔ میرا نقصان تو ہوا ہے لیکن کیا کروں۔ امان بھی خاص یار ہے اپنا۔ اس کی اور اس کے پیار کی عزت کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا نا۔" کہتے ہوئے رویندر ہنسنے لگا۔

"لیکن آپ تو اس دن یہاں تھے ہی نہیں۔"

"ہاں۔ پہلے امان بھی یہی کہہ رہا تھا۔ جب اس کو مووی دکھائی تب جا کر یقین آیا اسے۔ دراصل مجھے امان نے بتا رکھا تھا کہ اس دن اس کے ساتھ تم آنے والی ہو۔ میں پیچھے سے آیا اور چوکیدار کو بول دیا کہ امان کو کچھ نا بتائے۔ مجھے سرپرائز دینا ہے۔ اب بھلا وہ دوستوں کے بیچ کیسے آتا۔ اور میں چھپ کر اپنا کام کر گیا۔" رویندر مزے لیتا ہوا بولا۔

لڑکیوں کو کاٹو تو خون نہیں۔ کرتے والی تو باقاعدہ کانپنے لگی تھی۔ دوسری لڑکی نے مشکل سے آواز نکالی۔

"مگر۔ مگر میں تو آج پہلی بار آئی ہوں...... ہیں نا کوشل۔"

"مجھے سب پتا ہے یار۔ مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ مجھے تو وہ مووی دیکھے بنا نیند ہی نہیں آتی۔ مگر اب تو آج کے دن کی یادیں ہی بچی رہنی ہیں بس۔ سی ڈی تو میں آج دے ہی دوں گا امان کو۔"

"ایک درخواست ہے مان لو گے نا پلیز؟" کرتے والی نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں جان۔ بولو۔" رویندر نے دریا دلی دکھاتے ہوئے کہا۔

"تم جو چاہے کر لو۔ لیکن وہ سی ڈی امان کو مت دینا۔ مجھے دے دینا۔" کوشل نے اپنی شوخ نظروں کا جادو اس پر چلانے کی کوشش کی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ امان تمہیں اتنا پیار کرتا ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ تم رکھو یا وہ۔"

"تم وہ سی ڈی مجھے ہی دینا پلیز۔" کوشل نے پیار سے رویندر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"او کے میری جان او کے۔"

"میں جاؤں کوشل۔ تم آ جانا بعد میں۔" دوسری لڑکی نے کہا۔

"نہیں نندنی مجھے چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔ صرف دو منٹ اور رکو۔" پھر وہ رویندر سے مخاطب ہوئی۔ "وہ سی ڈی مجھے دے دو پلیز۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔"

"پہلے نندنی سے کہو کہ یہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔ جب تک میں نا کہوں۔ تبھی میں سی ڈی تمہیں دینے کے بارے میں سوچوں گا۔"

اب رویندر نے ان دونوں لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کیا اس بات کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

......☆☆☆......

نیچے محفل جم چکی تھی۔ کچھ دیر رویندر کا انتظار کرنے کے بعد امان نے وہیں پروگرام جما لیا۔ گلاسوں کو کھڑکھڑاتے اب تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ شراب کے نشے میں روہن اب وہ سب بولنے لگا تھا جس کو بتانے میں اب تک وہ ہچکچا رہا تھا۔

"اوہ! پھر کیا ہوا؟" امان آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو یار۔ کیوں ٹائم ضائع کر رہے ہو۔ میں ان بے وقوفانہ باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک خواب کو لے کر اتنا سیریس اور جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" سمیر ماورائی قسم کی باتوں پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

"پوری بات تو سن لو گدھے۔" روہن نے سمیر کو ڈانٹا اور کہانی سنانے لگا۔

"کون گدھا؟ میں۔" سمیر زور زور سے ہنسنے لگا۔ "گدھا۔"

"تمہیں نہیں سننی نا۔ چل سامنے جا کر بیٹھ جا اور اپنا منہ بند رکھ۔ میں مانتا ہوں اور مجھے سننی ہے۔" امان آ کر سامنے والے صوفے پر سمیر اور روہن کے بیچ میں بیٹھ گیا۔

سمیر اٹھا اور بڑبڑاتے ہوئے سامنے چلا گیا۔

باتیں ابھی چل رہی تھیں کہ رویندر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"اچھا اکیلے اکیلے مزے کیے جا رہے ہیں۔"

"ابے گدھے اکیلے اکیلے تم مزے کر کے آئے ہو یا ہم۔" سمیر اس کے آتے ہی کھڑا ہو گیا۔ "بات کرتا ہے۔"

"بھائی تم میرے کو گدھا کیوں بول رہے ہو۔ وہ تو روہن بولتا ہے۔" رویندر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میرے اندر روہن کا بھوت گھس گیا ہے۔" سمیر نے بھوتوں والی بات کا مذاق بنا لیا۔

"چپ کر بے ذلیل انسان۔ ایسی باتوں کا مذاق نہیں اڑاتے۔ کسی کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔" امان نے پیار سے اس کو سمجھایا۔

"کس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے بھائی؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔" رویندر نے اپنا گلاس بنا کر اٹھایا اور سب کے ساتھ چیئر کیا۔

"وہ بات بعد میں شروع سے شروع کریں گے۔ اب سب کو سیریس ہو کر سننی ہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔ مزے کیے یا نہیں۔" امان نے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"واہ۔ مزے کیسے نہیں لیے۔"

"سچ میں۔ چل آ گلے لگ جا۔ مبارک ہو مبارک ہو۔" امان لڑکھڑاتا ہوا آ کر اس کے گلے لگ گیا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔"

"اس میں کمال کی کیا بات ہے؟" سمیر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ابے یار وہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔"

"کیا؟ سگی بہنیں ہیں؟"

"ہاں۔ چل چھوڑ یار لمبی کہانی ہے۔ اس کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ پہلے روہن بھائی کی کہانی سنتے ہیں۔ چل بھائی روہن۔ اب سب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ شروع سے آخر تک سنا دے۔ پہلے بول رہا ہوں سمیر۔ بیچ میں نہیں بولنا۔"

"نہیں بولوں گا۔ چلو سناؤ۔" سمیر بھی روہن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

روہن نے کہانی سنانی شروع کر دی۔

"اوہ مائی گاڈ۔ مطلب یہ کہ کوئی لڑکی صدیوں سے تمہارے لیے تڑپ رہی ہے آج تک۔" امان نے پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔ "میں نے تو ایسا صرف کہانیوں میں پڑھا یا فلموں میں دیکھا ہے۔ آج جیتا جاگتا ثبوت دیکھ رہا ہوں۔"

"ابے گھونچو۔ یہ بھی تو کہانی ہی ہے۔" نشے اور مستی میں جھول رہے سمیر نے مونگ پھلی کا دانہ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔

"مطلب؟ یہ بھی صرف کہانی ہی ہے۔ کیوں روہن؟" امان نے سوالیہ نظروں سے روہن کی طرف دیکھا۔

روہن کچھ نہیں بولا۔ پچھلی باتیں یاد کرتے کرتے اس کے چہرے پر پسینہ چھلک آیا تھا۔ بدن میں رہ رہ کر انجانی سی لرزش دوڑ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ابے یار سپنے کہانیاں ہی تو ہوتے ہیں۔ سپنے میں ہی تو آئی ہے ناوہ اور جو کچھ جیتے جاگتے میں ہوا ہے۔ اس کے بارے میں تمہارا دوست پر کاش ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ ضرور اس بڈھے اور لڑکی کی سازش ہے۔ ضرور کسی تنتر منتر کا سہارا لے کر اس کے سپنے میں آ جاتی ہو گی۔ تم کیا کہتے ہو رویندر؟" سمیر نے سب کے لیے ایک ایک پیگ اور بنا دیا۔

"سالا کمینہ۔ دو مہینے سے ایسی ہی رونی سی صورت بنائے ہوئے ہے۔ کبھی مجھ کو دوست نہیں سمجھا۔ مجھے آج تک کچھ بھی نہیں بتایا اس نے۔" اب تک چپ چاپ غور سے ساری باتیں سن کر رویندر اٹھا اور روہن کے پاس بیٹھ کر گلے لگ گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا یار۔ میں چلتا تیرے ساتھ ہر جگہ۔ افسوس تم نے مجھے اپنا نہیں مانا یار۔ مجھے اپنا نہیں مانا۔"

"اب چپ بھی کر یار۔ ذرا سی چڑھتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔" روہن نے بھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

"آج میں اس طرح سے شروع نہیں ہوا ہوں یار۔ کتنا ہنستے تھے تم۔ کتنی مستی کرتے تھے ہم دونوں۔ مگر دو مہینے سے تم پتا نہیں کیسے ہو گئے ہو۔ نہ کہیں گھومنے چلے۔ نہ کبھی فون اٹھایا اور ملتا بھی ہے تو شاہ رخ خان کے اسٹائل میں۔ میں سوچتا تو تھا کہ کہیں تمہارا کسی سے کوئی چکر تو نہیں چل گیا۔ مگر یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ سارا چکر ہی خوابوں کا ہے۔ مگر اب تم فکر مت کرو۔ یہاں عمر کوٹ میں ہی ہے ناوہ؟" رویندر انتہائی جذباتی ہو رہا تھا۔

"ہاں۔" روہن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کو ڈھونڈنا ہی ہے نا بس۔ باقی کام تو تم کر لو گے۔" رویندر نے پوچھا۔

"صرف ڈھونڈنا نہیں ہے یار۔ اس کو وہاں لے بھی جانا ہے۔ اس ٹیلے پر۔" روہن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تو۔ وہ تو چل ہی پڑے گی نا۔ جب تم سے اتنا پیار کرتی ہے۔ تمہارے لیے تو وہ ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہے بھائی۔ پھر عمر کوٹ میں کیا رکھا ہے؟ پرانے ٹیلے پر رہیں گے چل کر ایک چھوٹا سا مکان بنا لیں گے۔" رویندر نے اپنی بٹن جیسی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی بیکار ہے یار۔ بھیجے میں تو لگتا ہے جیسے چڑیا نے انڈے دے رکھے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آتا نہیں۔ تمہیں کیا بتاتا میں۔" روہن اس کی اول جلول باتیں سن کر جھلا اٹھا۔

"ایسے کیوں بول رہے ہو یار۔ چلو اچھے سے ایک بار اور سنا دو پوری کہانی۔ اس بار میں ضروری باتیں نوٹ کرتا رہوں گا اپنی ڈائری میں۔ میری ڈائری کہاں گئی۔" رویندر نے بھولے پن سے کہا اور سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"تمہیں کہانی سننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آگے کی سن لے بس۔ پہلے تو نیرو کو ڈھونڈنا ہے پھر اس سے دوستی کرنی ہے۔ پھر ساری باتیں اس کو بتانی ہیں اور اس کو اپنے ساتھ ایک بار پرانے ٹیلے پر چلنے کے لیے منانا ہے۔ سمجھ گیا اور اب وہاں مکان بنانے کی پلاننگ مت شروع کر دینا۔ وہاں رہنا نہیں ہے ہمیں۔" روہن نے خاص خاص باتیں دوہرا دیں۔

"رہنا نہیں ہے تو پھر کیوں چلنا ہے وہاں۔ کیوں بیچاری بھابھی کو ڈرا رہے ہو یار۔" رویندر کے دماغ میں ایک اور سوالوں کا لٹو گھومنے لگا۔

"ابے گدھے۔ وہیں چل کر اس کو سب کچھ یاد آئے گا۔ سمجھا۔" روہن نے غصے سے کہا۔

"اوہ! اچھا۔ ٹھیک ہے ایک منٹ...... مگر تمہیں کیسے پتا کہ اس کو وہیں سب کچھ یاد آئے گا۔" رویندر نے ایک اور سوال داغا۔

"خود نیرو نے ہی بتایا ہے مجھے۔ خواب میں یار۔" روہن سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔

"جب اس کو پتا ہی ہے تو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟ بس یہ ایک آخری بات اور کلیئر کر دو۔"

"ابے تیرے دماغ میں چڑھ گئی ہے۔ یہاں والی نیرو کو کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ ٹیلے پر جو ہے۔ وہ کئی جنموں پہلے کی پریا ہے۔ جو کہتی ہے کہ میں دیو تھا اور وہ پریا۔ ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس جنم میں پریا نیرو ہے اور دیو روہن یعنی کہ میں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب سچ بھی ہے یا نہیں۔ کل صبح نیرو کو ڈھونڈنے چلیں گے۔ اب اس کے بعد کوئی سوال کیا تو دیکھ لینا پھر۔" روہن بولتے بولتے تھک گیا۔

"ایک منٹ روہن۔ مان لیتے ہیں کہ تمہارا خواب ایک حقیقت ہے۔ شہر میں تو کئی نیرو ہو سکتی ہیں۔ تم اس کو ڈھونڈو گے کیسے؟"

"اس کا گھر گورنمنٹ کالج کے پاس ہے۔ وہیں پتا کریں گے کہ کوئی نیرو وہاں ہے بھی یا نہیں۔" روہن نے جواب دیا۔

"گورنمنٹ کالج کے پاس؟ وہاں تو میں ابھی پتا لگا سکتا ہوں۔ ایکچولی کوشل اور نندنی وہیں رہتی ہیں۔"

"تو پتا کر نا یار۔" رویندر اور روہن ایک ساتھ بول پڑے۔

"ہاں ابھی پتا کرو یار۔ پتا چل جائے گا کہ خواب

حقیقت ہے یا افسانہ۔" سمیر بھی بے چین ہو کر امان کی طرف متوجہ ہوا جو اپنا موبائل نکال رہا تھا۔

امان نے ان کے بیچ بیٹھے بیٹھے ہی کوشل کو کال کی اور اسپیکر آن کر لیا۔ کافی لمبی بیل جانے کے بعد کوشل نے فون ریسیو کیا۔

"جانو۔ امی یہیں پر ہیں۔ میں اوپر جا رہی ہوں۔ پانچ منٹ بعد فون کرنا۔" سرگوشی میں بات کرتے ہوئے کوشل نے جھٹ سے فون کاٹ دیا۔

......☆☆☆......

"امی! نندنی کہاں ہے؟" کوشل نے فون اپنی جیب میں ڈالا اور کچن سے باہر آتے ہوئے بولی۔

"اوپر پڑھ رہی ہوگی۔ کیوں؟" امی نے کام کرتے کرتے ہی جواب دیا۔

"میں نے دودھ ابلنے کے لیے چولہے پر رکھ دیا ہے امی۔ ایک بار دیکھ لینا۔ میں ابھی آتی ہوں۔" کوشل نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

کوشل اوپر گئی تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند ملا۔ اس نے ہلکی دستک دیتے ہوئے کہا۔

"کیا کر رہی ہو بنو۔ چلو دروازہ کھولو۔"

نندنی نے دروازہ کھول دیا اور کوشل اندر جا کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"امان کا فون آیا تھا۔ میں اسے مس کال دے رہی ہوں۔"

"میں نہیں جاؤں گی وہاں آج کے بعد۔" نندنی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اب کسی اور کے ساتھ......" بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیوں؟ پیار ہو گیا ہے اس سے۔" کوشل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔" کہتے ہوئے نندنی نے نظریں پھیر لیں۔ تبھی امان کی کال دوبارہ آ گئی۔

"امان! تمہیں پتا ہے آج تمہارے دوست نے ہمارا ریپ کیا ہے۔"

"کس نے......؟ کب......؟" امان نے فون پر حیرت اور غصہ دکھاتے ہوئے وہاں سب کی طرف دیکھ کر بتیسی نکال دی۔

"مجھے نام نہیں پتا۔ مگر جب تم نیچے چلے گئے تھے تو کوئی دوسرا اوپر آ گیا تھا۔ کہنے لگا میں نے تمہاری امان کے ساتھ مووی بنا رکھی ہے اور پھر بلیک میل کرنے لگا مجبوراً اس نے جو کچھ کہا مجبوراً ہمیں کرنا پڑا۔ نندنی تو اب تک اپ سیٹ ہے بیچاری۔"

کوشل بات کر ہی رہی تھی کہ اچانک فون پر اس کو دوسری آواز سنائی دی۔

"جھوٹ کیوں بول رہی ہو۔ ریپ تو میں نے صرف تمہارا کیا تھا۔ نندنی کے ساتھ پیار کیا تھا۔"

"مگر یار تم ایسے پاگل کیسے بن سکتی ہو۔ ایسے کیسے کوئی ہماری مووی بنا سکتا ہے۔ وہ بھی سیکنڈ فلور پر چلو چھوڑو اس بات کو بعد میں دیکھیں گے۔ مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔" امان نے کام کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو جانو۔" کوشل کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"یہ تمہارے آس پاس نیرو نام کی کوئی لڑکی رہتی ہے کیا؟" امان نے کہا۔

"بڑے بے شرم ہو تم۔ میں کافی نہیں ہوں کیا۔" کوشل اپنی آواز میں غصہ بھرتی ہوئی بولی۔

"ارے یار لڑکیاں کیا صرف اسی کام کے لیے ہوتی ہیں۔ بولو؟" امان چڑتا ہوا بولا۔

"او کے...... کس عمر کی ہے۔" کوشل نے پوچھا۔

امان نے ہاتھ سے اشارہ کر کے روہن سے عمر کے بارے میں پوچھا مگر روہن کے نا میں ہاتھ ہلانے پر بولا۔ "یہی کوئی تمہاری عمر کی ہوگی۔"

کوشل اپنا ذہن چاروں طرف دوڑاتی ہوئی بولی۔ "ہماری عمر کی کیا۔ میرے خیال سے تو کسی عمر کی لڑکی اس نام کی نہیں ہے کوئی۔" کوشل کا جواب سن کر روہن کے ارمانوں پر پانی پھر گیا۔

"پکا یہ گورنمنٹ کالج کے پاس ہی رہتی ہے نا۔" روہن نے پوچھا۔

کوشل نے اس کی آواز سن لی۔ "ہاں یار۔ کل ملا کر چالیس پچاس گھر ہی تو ہیں یہاں۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کوئی اس نام کی نہیں ہے یہاں پر۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ باقی کل بات کروں گا۔ او کے بائے۔" اور امان نے اس کی بات سنے بغیر ہی فون کاٹ دیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ خواب، خواب ہی ہوتے ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چلو چھوڑو خوابوں کو اور رئیل لائف میں انجوائے کرو۔" سمیر نے کہا۔

اب کسی کے پاس بولنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ روہن نے صوفے پر سر ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

......☆☆☆......

"امان کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟" نندنی نے کوشل کا فون بند ہوتے ہی پوچھ لیا۔

"وہ...... پتا نہیں۔ یاد نہیں آ رہا لیکن اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے پوچھ رہا تھا۔ مگر اپنی کالونی میں تو کوئی نیرو......" کوشل کو بولتے بولتے نام یاد آ گیا۔

"ہاں۔ نیرو نام کی لڑکی کا پوچھ رہا تھا۔ اپنے علاقے میں تو اس نام کی کوئی نہیں ہے نا؟"

"ارے وہ شینو! جو کونے والے بڑے سے گھر میں رہتی ہے۔ اسی کا تو نام ہے نیرو۔" نندنی نے کہا "اچھا۔ مگر تمہیں کیسے پتا۔ اس کو تو سب شینو کے نام سے ہی بلاتے ہیں۔ وہ تو بہت پیاری ہے یار۔ جسے ملے گی اس کی قسمت جاگ جائے گی۔"

"نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ بات ہوگی۔ وہ تو گھر سے ہی بہت کم نکلتی ہے اور لڑکوں کی طرف تو دیکھتی تک نہیں۔ وہ نیرو نہیں ہوگی یا پھر کوئی دوسری ہی بات ہوگی۔"

"پکا۔ وہ نیرو ہی ہے نا؟" کوشل نے بولتے بولتے فون نکال لیا۔

"ارے ہاں پکا پتا ہے۔ مجھے۔ اپنی کالونی میں تو بس وہی ایک نیرو ہے۔" نندنی نے زور دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ایک منٹ...... میں امان کو بتا دوں۔" یہ کہہ کر کوشل نے امان کا نمبر ڈائل کیا۔

امان نے فون اٹھا کر دیکھا اور واپس رکھ دیا۔

"کیا ہوا۔ کس کی کال تھی؟" سمیر نے امان کو کال ریسیو نہ کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہی یار۔ کوشل! یہ لڑکیاں پکا دیتی ہیں فون کر کر کے۔ کئی بار تو رات کے دو دو بجے فون کر کے پوچھے گی۔ کیا کر رہے ہو جانو۔" امان ہنستے ہنستے روہن کا غمگین سا چہرہ دیکھ کر چپ ہو گیا۔ "کیا ہو گیا ہے یار۔ ہو جاتا ہے۔ تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو۔ تمہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ ٹائم پاس کے لیے بھی اور مستقل بھی۔ کہو تو آج ہی بلاؤں ایک ٹائم پاس۔ مست لڑکی ہے۔ دیکھتے ہی گھنگھرو بجنے لگیں گے دل میں۔"

"ہاں بلا لے یار۔" رویندر چہکتے ہوئے بولا۔

"تمہارا دل نہیں بھرا اب تک۔ بول روہن کیا کہتا ہے۔" سمیر نے رویندر کو ڈانٹتے ہوئے روہن سے پوچھا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" روہن نے اتنا ہی کہا تھا کہ امان کا فون پھر بج اٹھا۔

"کیا ہے یار۔ تمہیں پتا ہے نا کہ آج یار دوست آئے ہوئے ہیں۔ دوبارہ فون مت کرنا۔" امان نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ۔ ایک منٹ۔ فون مت کاٹنا' وہ نیرو ہے ایک ہماری کالونی میں۔ کیا کرنا ہے اس کا؟" کوشل نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

امان تو حیرت اور خوشی سے اچھلتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کیا؟ نیرو مل گئی۔" امان کی بات سنتے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے اور وہ سب بھی امان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ روہن کا چہرہ تو خوشی کے مارے چمکنے لگا تھا۔

کوشل امان کی حیرت کو سمجھ نہیں پائی۔ "ایسا کیا ہو گیا۔"

"مگر پہلے تم نے منع کیوں کر دیا تھا؟" امان نے اس کی نہ سنتے ہوئے اپنا سوال کیا۔

"وہ یہاں سب اس کو شینو کہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کا اصلی نام نیرو ہے۔ ابھی نندنی نے بتایا ہے۔"

کوشل نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ روہن نے امان کے ہاتھ سے فون چھین سا لیا۔

"کیسی ہے وہ؟ مطلب دیکھنے میں؟"

"تم کون ہو؟" بدلی ہوئی آواز سن کر کوشل نے پوچھا۔

"میں روہن ہوں۔" روہن کا دل بلیوں اچھل رہا تھا بولتے ہوئے۔

"کیوں؟ رشتہ آیا ہے کیا اس کا تمہارے لیے۔" کوشل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... وہ...... مگر۔" روہن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔

"نہیں۔ تو ایسا کرو کہ اس کا خیال بھی اپنے دماغ سے نکال دو۔ وہ ایسی ویسی نہیں ہے۔ بالکل الگ ٹائپ کی ہے۔ ساری لڑکیوں سے الگ۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔ وہ کبھی کبھار ہی گھر سے نکلتی ہے۔ سیدھی کالج جاتی ہے۔ سیدھی آتی ہے۔ لڑکوں کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہے اور نہ ہی کبھی انہیں اپنے پاس پھٹکنے دیتی ہے۔ وہاں کوشش کرو گے تو اپنا وقت ہی برباد کرو گے۔ سمجھ گئے۔" کوشل نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی روہن کو سمجھانے میں۔

"ہاں۔ مگر لگتی کیسی ہے۔ یہ تو بتا دو۔" روہن کا دل اب بھی نہیں مانا۔

"کوئی لڑکی کسی لڑکے کے سامنے دوسری لڑکی کی تعریف نہیں کرتی۔ آل دی بیسٹ۔ امان کو فون دو۔" کوشل نے کہا۔

روہن نے فون امان کو پکڑایا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ امان نے فون لیتے ہی کان سے لگا لیا۔

"ہاں۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا معاملہ ہے۔" کوشل نے کہا۔

"تم اس بات کو چھوڑو۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔" امان بولا۔

"کیا؟"

"نیرو کو بتانا ہے کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے اور ہو سکے تو اس کو بلا کر لانا ہے۔"

"نہیں یار۔ میں بتا تو رہی ہوں۔ بلا کر لانا تو دور کی بات ہے اگر اس کے سامنے اس طرح کی بات بھی کر دی تو بات گھر تک پہنچ جائے گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ سوری۔" کوشل نے مایوس ہو کر کہا۔

"تیری سوری کا کیا میں اچار ڈالوں گا۔" امان نے غصے ہو کر فون کاٹ دیا۔

"اوئے دیکھو ذرا۔ میرے یار کا چہرہ کتنے دنوں بعد کھلا ہے۔ اب تو نیرو بھابھی کو یہاں سے لے کر ہی جائیں گے۔ ٹیلے پر۔" روہن کے چہرے پر خوشی دیکھ کر نشے نے رویندر کا سرور اور بڑھا دیا۔

"مگر یار کوشل نے تو صاف منع کر دیا ہے۔ ہم اس تک پہنچیں گے کیسے؟ مطلب بات کیسے کریں گے؟ ویسے بھی کوشل بتا رہی تھی کہ وہ تو نہایت ہی شریف لڑکی ہے۔ کوئی نہ کوئی تو راستہ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔" امان نے اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"چلو اب چھوڑو۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ کل صبح دیکھیں گے۔"

"امان بھائی ایک بار اس کا گھر پوچھ لیتے تو ابھی جا کر دیکھ آتے۔" روہن بہت زیادہ بے چین ہو گیا۔

"کمال کرتا ہے یار۔ رات کے نو بجے اور وہ بھی ایسی لڑکی جو بلا وجہ گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ تمہیں گھر کے باہر ملے گی کیا تمہیں اپنی شکل دکھانے کے لیے۔" امان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ۔ بس ایسے ہی۔ باہر سے یونہی دیکھ آتے۔" روہن نے اپنا سر جھکاتے ہوئے امان اور سمیر کی طرف دیکھا۔

"چلو بھائی۔ گاڑی باہر نکالو۔ بھابھی جی کا گھر دیکھ کر آتے ہیں ابھی کے ابھی۔" نشے میں جھومتا ہوا رویندر کھڑا ہو گیا۔ سمیر نے بھی کندھے اچکا دیئے تو امان کھڑا ہو گیا۔

"چلو پھر۔ باہر کی ہوا کھا کر آتے ہیں۔"

گاڑی میں جاتے ہوئے امان نے کوشل کو فون کیا۔ "کوشل۔"

"اب کیسے آ گئی میری یاد' جانو دوست گئے کیا۔" کوشل نے انگڑائی لیتے ہوئے سیدھے لیٹ کر کتاب اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ نندنی پاس ہی بیٹھی تھی۔

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ وہ نیرو کے گھر کی لوکیشن بتا دو۔" امان سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔

"یہاں آ رہے ہو کیا۔" کوشل خوشی سے اچھل پڑی۔

"ہاں۔ اب بتاؤ بھی۔"

"مجھے بھی لے چلنا اپنے ساتھ۔"

"پاگل تو نہیں ہے۔ کیسے لے جا سکتا ہوں میں۔"

"اس دن بھی تو لے کر گئے تھے رات کو۔ نندنی یہاں سنبھال لے گی۔ مجھے سویرا ہونے سے پہلے چھوڑ جانا۔ لگتا ہے اب تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔" کوشل نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"یار سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے دوست آئے ہوئے ہیں۔ آج صبر کر لو۔ ایک دو دن میں وعدہ رہا۔ اب تم مجھے جلدی سے نیرو کا گھر بتا دو۔ ہم گورنمنٹ کالج کے پاس پہنچ گئے ہیں۔" امان نے اسے وعدے پر ٹرخاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا گھر یاد ہے نا؟"

"ہاں۔"

"اسی گلی میں جب تم ہمارے گھر کی طرف آؤ گے تو جو دوسرا والا چوراہا ہے۔ اس چوراہے پر ہی اس کا گھر ہے۔ بڑا سا۔ ڈارک گرے کلر کا ہے۔ مگر ابھی وہاں جا کر کرو گے کیا؟" کوشل نے گھر بتانے کے بعد سوال کیا۔

"اوکے بائے۔ تھینکس۔" امان نے کہا اور فون کاٹ دیا۔ چوراہے پر پہنچتے ہی امان کو کوشل کا بتایا ہوا گھر مل گیا۔ دو گلیوں کے سنگم پر خوب صورت دو منزلہ عمارت کے دونوں اطراف گیٹ تھے۔

"لے بھائی روہن مل گیا نیرو کا گھر۔ اب بول کیا

کرنا ہے؟" امان نے گاڑی چوراہے سے پہلے ہی روک دی۔ نیرو کا گھر ملنے کی بات سنتے ہی روہن لرز سا گیا۔ اس کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ اس کو دل ہی دل میں ایسا لگا جیسے وہ پرانے ٹیلے پر کھڑا ہے اور نیرو دور سے اس کو پکار رہی ہے۔ روہن نے گھر دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیرو کی اس کے دماغ میں جو تصویر ابھری وہ شروتی کی تھی۔

"واپس چلو۔" روہن کے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔

"اب کیا ہوا؟" سمیر نے کہا۔

"کچھ نہیں بس گھر دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ اب چلو۔" روہن نے کہا اور امان نے چوراہے سے گاڑی گھما لی۔ کچھ آگے جا کر ان کو ایک کچا راستہ بائیں طرف جاتا دکھائی دیا۔

دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس راستے پر اتفاق کیا اور اس راستے پر چل پڑے۔

"اف خدایا۔ یہاں تو کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ چلو واپس چلو۔ یہ راستہ نہیں ہے۔

......☆☆☆......

پرکاش دل ہی دل میں اس لڑکی کو کوس رہا تھا جس کے پیار میں پاگل روہن نے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی خوار کر دیا تھا۔

"کہاں ہو یار تم، کل صبح سے تمہارا فون ٹرائی کر رہا ہوں۔ فون کیوں آف کر رکھا ہے۔" پرکاش کے پاس صبح اٹھتے ہی جب روہن نے روبندر کے نمبر سے اسے فون کیا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

"وہ۔ فون کھو گیا ہے بھائی۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں روبندر کے ساتھ عمرکوٹ جا رہا ہوں۔ وہیں ہوں میں ابھی۔" روہن نے جواب دیا۔

"ہاں بتایا تھا۔ مگر روبندر کا نمبر میرے پاس کہاں ہے۔ گھر بھی گیا تھا وہاں سے بھی نہیں ملا۔ تم پہلے بھی تو فون کر سکتے تھے۔ پتا ہے کتنا پریشان ہوں میں تمہارے لیے۔" پرکاش نے مری ہوئی آواز میں روہن کے لیے فکرمند ہونے کا ناٹک کیا۔

"پتا ہے بھائی لیکن یہاں آنے کے بعد وقت ہی نہیں ملا۔ ابھی صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔" روہن چہکتی ہوئی آواز میں بولنے لگا تھا کہ پرکاش نے اس کو ٹوک دیا۔

"سنو۔ میں نے شروتی سے سب اگلوا لیا ہے۔ دراصل تمہارے خوابوں کے پیچھے اور کوئی نہیں ہے۔ وہی ہے۔ میں اس عامل سے بھی مل آیا ہوں، جس نے اس کی مدد کی تھی۔ تم اپنا وہم چھوڑو اور واپس آ جاؤ۔"

پرکاش کی بات سے روہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بوکھلاتا ہوا سا بولا۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

پرکاش نے ایک بار پھر اس کو بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ "ہو سکتا ہے نہیں یار۔ یہی ہوا ہے۔ تم واپس آؤ گے تو میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ مگر یار اس کی نیت غلط نہیں تھی۔ وہ تم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ سچ میں۔ تم پر جان دیتی ہے وہ۔ کل جب بول رہی تو بلک بلک کر رو رہی تھی تمہارے لیے۔ اب تم جلدی واپس آ کر اس سے مل لو پھر میں گھر والوں سے بات کر لوں گا۔ آ رہے ہو نا تم۔"

"لیکن یہاں مجھے نیرو مل گئی ہے اور جیسا مجھے خواب آیا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ۔"

روہن کی اس بات نے پرکاش کے پلان پر جیسے گڑھوں پانی ڈال دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا؟" پرکاش نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھائی۔ بالکل اسی جگہ اس کا گھر ہے۔ ایک بات اور بتاؤں۔ مجھے خواب میں بھی اکثر یہی گھر دکھائی دیتا ہے۔ بالکل ویسا ہی۔ کل جب میں نے وہ گھر دیکھا تو اسے دیکھتے ہی میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔" روہن نے اپنی بات پوری کی۔

"دیکھنے میں کیسی ہے؟" پرکاش دل مسوس کر بولا۔

"میں نے دیکھا نہیں ہے ابھی لیکن سب پتا کر لیا ہے۔ اس کا نام نیرو ہی ہے۔ مگر یہاں سب اس کو شینو کہتے ہیں۔ بہت شریف لڑکی ہے۔ کبھی بلا وجہ گھر سے باہر نہیں نکلتی اور کہتے ہیں کہ بہت خوب صورت بھی ہے۔" یہ کہتے ہوئے روہن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"دیکھو۔ تم مجھے بھائی کہتے ہو نا۔ اس لیے بڑے بھائی کے ناتے سمجھا رہا ہوں۔ ابھی کے ابھی واپس آ جاؤ۔ ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ شروتی بھی کم خوب صورت نہیں ہے اور میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ تیری نیرو شروتی سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتی۔ تمہیں اتنا پیار کرتی ہے کیا بتاؤں اور اس کی شرافت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس کا قصور صرف اتنا سا ہے کہ وہ تم سے پاگل پنے کی حد تک پیار کرتی ہے۔ بس کہنے سے شرما رہی تھی۔" پرکاش اپنی ہی بات پر زور دیے جا رہا تھا کہ روہن نے اس کو ٹوک دیا۔

"مگر بھائی اس نے تو پہلے کبھی مجھے دیکھا بھی نہیں تھا پھر وہ مجھ سے پیار کب سے کرنے لگی اور مان لو کہ مجھے کہیں دیکھا بھی ہوگا تو بنا جانے میرے لیے کسی عامل وامل کے پاس کیوں جائے گی۔ بولو۔"

پرکاش ان باتوں کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں تو یہی تھا کہ روہن کو کوئی نیرو ملنے والی نہیں ہے۔ اور جیسے ہی اس کو وہ بتائے گا کہ شروتی ہی وہ سب کر رہی تھی تو وہ اس پر یقین کر کے واپس دوڑا چلا آئے گا۔

"تم آؤ گے تبھی تو بتاؤں گا نا۔ یہاں فون پر کیسے سمجھاؤں۔ بہت لمبا معاملہ ہے۔ آ رہے ہو نا آج؟"

روہن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "میں تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں بھائی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ مگر مجھے تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔" پرکاش نے فون کاٹا اور غصے سے بیڈ پر پٹک دیا۔ اس کو آج پھر شروتی سے ملنے جانا تھا۔

......☆☆☆......

"کیا ہوا یار۔" روہن کے چہرے پر الجھن دیکھ کر روبندر نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں یار۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" اور روہن نے اس کو پرکاش کے ساتھ ہونے والی پوری بات بتا دی۔

"ایک بات بولوں۔" روبندر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"ہاں۔ بولو نا۔" روہن اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ دل سے بڑا کچھ نہیں ہوتا۔ تم صرف اپنے دل کی بات سنو اور خود فیصلہ کرو۔ پرکاش بھائی کی بات مان بھی لیں تو پھر بھی ایک سوال کا جواب تو نہیں ملتا نا۔" روبندر نے کہا۔

"وہ کیا؟" روہن غور سے اس کی بات سنتا ہوا بولا۔

"وہ یہ کہ اگر مان بھی لیں کہ شروتی تمہارے پیار میں یہ سب ٹونے ٹوٹکے کر رہی تھی تو وہ اپنا نام نیرو کیوں بتاتی۔ شروتی نے اپنا نام کیوں نہیں بتایا۔ اور عمرکوٹ کا ایڈریس کیوں دیتی۔ بولو۔ سوچنے کی بات ہے کہ نہیں اور یہاں عمرکوٹ میں نیرو تمہیں مل بھی گئی ہے اور اس کا گھر۔ سب سے بڑی بات تو اس کا گھر ملنا

ہے۔ جس کے بارے میں تم نے کل آ کر بتایا تھا کہ تمہیں خواب میں وہی گھر دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے تمہیں ڈر کے مارے پسینہ آ گیا۔" رویندر نے بات پوری کر کے کہا۔ "اب بولو۔ کیا کہتا ہے تمہارا دل۔"

"میرا دل یہ کہتا ہے کہ تم اپنا فون آف کر دو۔" روہن مسکراتے ہوئے بولا۔ "تجھ میں اتنی عقل آئی کہاں سے۔ میں نے تو یہ سب سوچا بھی نہیں۔ فون آف کر دے۔ ابھی ہمیں وہیں چلنا ہے۔ نہا دھو لو۔"

"کہاں چلنا ہے؟"

"وہیں یار۔ میری سسرال۔ تیری بھابی کو دیکھ کر ہی آئیں گے آج۔ چاہے پورا دن وہیں گزر جائے۔" روہن ہنسنے لگا۔ اس کے چہرے کی کھوئی ہوئی رونق لوٹ آئی تھی۔

......☆☆☆......

روہن اور رویندر چوراہے پر کھڑے تھے۔ امان اور سمیر کو انہوں نے گلی کے کونے سے ہی واپس بھیج دیا تھا۔ کھڑکیوں کے اندر لہرا رہے پردے، کارپر کلر کا گیٹ۔ دیواروں کا رنگ۔ سب کچھ روہن کا جانا پہچانا سا تھا۔ اس لیے تھوڑا بے چین تھا۔

"یار کسی نہ کسی کو تو باہر آنا چاہئے۔ پتا نہیں اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔" روہن نے بے تاب ہو کر کہا۔

"آ جائے گا یار۔ یہاں بیٹھ کر آرام سے مونگ پھلی کھاتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو بھابی جی کا دیدار ہو ہی جائے گا۔" رویندر نے کہا۔ دونوں ایک مونگ پھلی کے ریڑھے والے کے پاس سامنے والے گھر کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ اچانک گھر کے اندر سے آنے والی آواز نے دونوں کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

"شینو بیٹی۔ میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔ آ کر دروازہ بند کر لو۔"

"آئی ماں۔ جاؤ آپ۔ میں بند کر لوں گی۔ جلدی آ جانا۔ مجھے ٹیوشن بھی جانا ہے۔"

باہر بیٹھ کر آواز پر کان لگائے روہن اور رویندر کو اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوئی کہ بعد میں آنے والی نہایت سریلی آواز صرف اور صرف نیرو کی ہی تھی۔

"یار آواز تو بڑی پیاری ہے۔ خدا کرے شکل بھی آواز کے مطابق ہی ہو۔" رویندر نے دعا کرتے ہوئے کہا۔

"پتا ہے رویندر۔ جب ہم عمر کوٹ کے لیے چلے تھے تو میں صرف یہی سوچ رہا تھا کہ ایک بار، صرف ایک بار دیکھ کر آنا ہے، میرے خواب میں سچائی ہے بھی یا نہیں۔ سیریئسلی مجھے نیرو سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ مگر یار یہاں کی آب و ہوا، یہ گھر، یہ چوراہا اور یہ آواز، سب کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا ہے یار۔ ایسا لگتا ہی نہیں کہ یہ سب میرے لیے نیا ہے۔ ایسے لگ رہا جیسے۔ یہیں پر رہنے لگ جاؤں۔ یہ آواز سنتا رہوں۔ سچ یار۔ مجھے یہاں بہت سکون محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی تو بات ہو گی نا؟ وہ بھی میرا یونہی انتظار کر رہی ہو گی یا نہیں؟ اگر اس نے میری بات سننے سے صاف منع کر دیا تو۔" روہن کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

"ابھی سے اتنی لمبی مت سوچ یار۔ دیکھ آنٹی جی آ رہی ہیں۔ یہ ہی تمہاری ساسو ماں ہے۔ غور سے دیکھ لے۔" کہتے ہوئے رویندر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر سلام کرنے لگا۔

"نمستے آنٹی جی۔" روہن کے چہرے پر گھبراہٹ ابھر آئی۔

"نمستے بیٹا۔" کہہ کر آنٹی جی رک گئیں۔ "کچھ کام ہے بیٹا؟"

"نہیں۔ بس یونہی آنٹی جی۔ آپ بڑی ہیں۔ بزرگ ہیں ہماری۔ بس اس لیے۔" رویندر ابھی بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔

"بھگوان تمہارا بھلا کرے بیٹا۔ جگ جگ جیو۔" کہہ کر آنٹی جی مسکرائیں اور آگے بڑھ گئیں۔

"اوئے مروائے گا کیا۔ ایسے کیوں کیا؟" روہن آنٹی جی کے جاتے ہی رویندر کو لتاڑنے لگا۔

"بھائی۔ میں تو ابھی سے جان پہچان کر رہا ہوں۔ شادی کے بعد بھابی جی کو لینے تمہارے ساتھ مجھے ہی تو آنا ہے۔ اور پھر دیکھ۔ دعا بھی مل گئی۔"

رویندر کو روہن کی لتاڑ سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

"تم بھی گھن چکر ہو پورے کے پورے۔ اگر آج نیرو نہیں دکھائی دی تو؟ انہوں نے اب تمہارا چہرہ بھی یاد کر لیا ہو گا۔ آج کے بعد میرے ساتھ یہاں مت آنا۔" روہن نے غصہ ہوتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ نا یار۔ آج کے بعد یہاں آنا ہی نہیں پڑے گا تمہیں۔ باہر ہی ملنا بھابی جی سے۔ ایک منٹ۔ میں ابھی آیا۔" رویندر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"اوئے کیا کر رہے ہو یار۔ کہاں جا رہے ہو۔ واپس آ جاؤ۔" روہن ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ رویندر نے واپس مڑ کر بتیسی دکھائی اور روہن کی پروا نہ کرتے ہوئے گیٹ پر پہنچ کر بیل بجا دی۔ تبھی اس کو گیٹ کی جھریوں کے بیچ سے ایک لڑکی کے آنے کا احساس ہوا تو وہ گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں جی۔" لڑکی نے کہا

"تم؟" لڑکی اور رویندر کے منہ سے ایک ساتھ تم نکلا۔ رویندر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دروازے پر ریتو کھڑی تھی۔ وہی پتلی اور لمبی خوب صورت سی لڑکی جس کے ساتھ رویندر کی بس میں اور پھر کار میں مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

"آ...... آ، ہاں جی۔ مگر آپ کا نام تو ریتو ہے نا۔" رویندر بوکھلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو؟ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تمہیں کیسے ملا یہ گھر۔" ریتو نے تنکتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر جما لیے۔

"وہ...... وہ...... ہم تو...... ایسے ہی آ گئے تھے جی...... بھٹکتے ہوئے...... معاف کرنا...... مگر...... وہ...... کہاں ہیں؟" رویندر نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات پوری کی۔

"وہ کون؟ تمہیں چاہئے کیا؟" ریتو کی آواز تیز ہو کر اب روہن کے بھی کانوں میں پڑنے لگی تھی۔

ریتو کے غصے سے بولنے کی وجہ سے رویندر ابھی تک سنبھل بھی نہیں پایا تھا۔

"وہ...... وہ...... بھابی جی۔"

"کون بھابی جی؟ تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ یہاں کوئی بھابی جی نہیں رہتی۔ تم آخر کیا لینے آئے ہو؟" جیسے ہی ریتو نے اس کو کھری کھری سناتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کیا، رویندر کو ایک بہانہ سوجھ گیا۔

"ہمارا فون...... اوئے روہن آ جا۔ مل گیا تیرا فون۔ میرا شک صحیح تھا کہ انہوں نے ہی چرایا ہے۔ شکل سے ہی پتا لگ رہا تھا کہ انہی کا کام ہے۔" رویندر اب اسے حاوی ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

"فون؟" روہن کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ وہ کس لیے گیا تھا اور اب کیا بک رہا ہے۔ مگر رویندر کے بلانے پر وہ دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتا ہوا گیٹ پر پہنچ ہی گیا۔

"کیا ہوا؟"

"ارے تمہارا فون۔ یہ دیکھ اس کے ہاتھ میں۔" رویندر نے ریتو کے ہاتھ میں روہن کے جیسا فون دیکھ کر

اس کو سر پر چڑھانے لگا۔
اب بڑبڑانے کی باری ریتو کی تھی۔ اس طرح سے خود پر گلی میں الزام لگاتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔
''ہمیں تو یہ...... بس میں ملا تھا۔'' ریتو کی نظریں جھک گئیں۔
''اچھا۔ بس میں ملا تھا۔ بس میں تو میں بھی ملا تھا۔ مجھے کیوں نہیں اٹھا لائیں تم۔ بولو۔ کہہ دیتی گھر والوں سے کہ بس میں پڑا ملا تھا میں۔'' رویندر لگاتار اس پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔
''یار اب چپ بھی کر۔ اتنا بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' روہن نے اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''کیوں نہ بولوں میں۔ گھر آئے مہمان کو پانی پوچھنا تو دور کی بات۔ عزت اتارنے پر تلی ہوئی ہے محترمہ۔ اس کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کیسے میں نے ان کو لفٹ دلوائی تھی۔'' رویندر کی آواز اور اونچی ہوگئی۔
''آپ۔ آپ پلیز اندر آجائیں...... یہاں تماشہ کیوں کررہے ہیں؟'' ریتو نے پوری نزاکت کے ساتھ کہا۔
''نہیں۔ ہمیں نہیں آنا۔'' رویندر بول ہی رہا تھا کہ روہن نے اس کو پیچھے سے دھکا مارا۔
''چل رہا ہوں نا یار۔ دھکا کیوں مار رہے ہو۔'' اور پھر وہ ریتو کو گھورتے ہوئے اس انداز سے اندر بڑھ گیا جیسے وہ اسی کا گھر ہو۔
''آجایئے۔ آپ اندر بیٹھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' کہہ کر ریتو اوپر بھاگ گئی۔
''تم اتنا چلا کیوں رہے تھے بے میرا پتا صاف کروانا ہے کیا۔'' روہن نے اندر جا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے رویندر کو ڈانٹا۔
''اچھا۔ تم نے میرا چلانا سن لیا۔ اس کا نہیں سنا کہ کیسے میری عزت تار تار کررہی تھی۔ پھر مجھے اس کے ہاتھ میں تیرا موبائل دکھائی دیا۔ میں اتنا سنہرا موقع کیسے جانے دیتا۔ ہی ہی ہی۔'' رویندر نے ہنستے ہوئے اپنی چھاتی چوڑی کرلی۔
''ٹھیک ہے یار۔ مگر ہم یہاں نیرو کے لیے آئے ہیں۔ بھول گیا کیا۔'' روہن نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔
''او تیری۔ میں تو بیچ میں ہی بھول گیا تھا۔ سوری یار۔ اب ہم گھر کے اندر تو آ ہی گئے ہیں۔ دیکھ۔'' رویندر اچھل کر بولا۔
''چپ۔ کوئی آرہا ہے۔'' روہن کے کہتے ہی دونوں چپ ہوگئے اور نیرو کے کمرے میں قدم رکھتے ہی روہن سدھ بدھ کھو کر کھڑا ہوگیا اور پلک جھپکائے بنا اسے دیکھنے لگا۔ حالانکہ وہ اس پری کو پہلے دیکھ چکا تھا مگر اب کی تو بات ہی دوسری تھی۔ نیلی کڑھائی والے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں وہ سچ مچ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے نزاکت ٹپک رہی تھی۔ پھر روہن تو اس کو دیکھنے سے پہلے ہی اپنا مان چکا تھا۔ اس کا دل اس خوشی کو برداشت نہیں کرپارہا تھا۔ دھیمے دھیمے قدموں سے نظریں جھکائے ہوئے وہ چل کر ان کے پاس آئی اور جیسے ہی جھک کر اس نے ٹرے میز پر رکھی، ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑھک آئی۔ کھڑی ہو کر اس نے اپنی لٹ کو کان سے پیچھے لے جاتے ہوئے مدھر آواز میں کہا۔
''بیٹھیں نا۔'' روہن تو کھڑا ہو کر جیسے بیٹھنا ہی بھول گیا تھا۔
''جی تھینکس۔'' مگر وہ کھڑا ہی رہا۔
''ارے بیٹھیں تو سہی۔ ٹھنڈا لیجیے۔'' نیرو نے اس کو پھر ٹوکا۔

''جی۔ جی بیٹھ رہا ہوں۔'' نیرو کے چہرے کی خوب صورت میں روہن اس قدر کھو گیا تھا کہ اس بار بھی کھڑا ہی رہا۔ رویندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔
''بیٹھ جا یار۔''
''وہ ہاں۔'' روہن نیرو کے ٹرانس سے جیسے ابھی آزاد ہوا ہو۔
''آپ لیجیے۔ ہم آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر نیرو جانے کے لیے مڑی۔
''آپ ہی نیرو بھا' جی ہیں نا۔'' رویندر کے منہ سے بھابی جی نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اتنا سنتے ہی نیرو چونک کر پلٹی۔
''آپ کو میرا نام کیسے معلوم...... یہ نام تو کوئی لیتا ہی نہیں یہاں پر۔ سوائے ماں کے۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ بچپن میں تھا میرا یہ نام۔'' نیرو نے حیرت سے رویندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام اب شینو ہے۔ پلیز دوبارہ وہ نام مت لینا۔''
''دیکھ لو جی۔ ہیں نا ہم کمال کے۔ ہم تو آپ کے پچھلے جنموں کی باتیں بھی جانتے ہیں۔'' رویندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نیرو نے اس بات کو مذاق سمجھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور باہر نکل گئی۔
''کیسی لگی بھابی جی؟'' اس کے جاتے ہی رویندر نے روہن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
''یہ تو میں نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا یار۔ اتنی سندر لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔'' روہن ساتویں آسمان پر تھا۔
''دیکھی کیوں نہیں......؟ اس دن بس میں نہیں دیکھی تھی کیا۔'' رویندر نے یاد دلایا۔
''ہاں مگر اس دن میں نے اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا یار! بس ایک پل کے لیے ہی تو نظریں ٹھہری ہوں گی اس پر۔ روہن نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ ریتو اور نیرو دونوں کمرے میں آگئیں۔
''یہ لیجیے آپ کا فون۔''
''تھینکس۔'' فون لیتے ہوئے جیسے ہی روہن کی انگلیوں نے نیرو کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا اس کے دل کے سبھی تار جھنجھنا اٹھے۔ اتنا جادو تھا اس کے ہاتھوں میں۔ تبھی ریتو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
ہم نے چوری نہیں کیا تھا۔ سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ ہم نے سوچا خان صاحب کا ہوگا۔ ہم نے وہیں ڈرائیور کو بھی دینے کے بارے میں سوچا تھا لیکن ہمیں لگا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جس کا بھی ہوگا وہ فون تو کرے گا ہی۔ تبھی اس کو بتادیں گے۔ گھر آکر دیکھا تو اس کی بیٹری ختم ہوچکی تھی ہمارے پاس چارجر بھی نہیں تھا اس کا۔ چاہو تو آنٹی جی سے پوچھ لینا۔ ہم نے آتے ہی ان کو بتادیا تھا۔''
''اوہو۔ آپ تو اتنی سی بات کو دل پر لے رہی ہیں۔ آپ کو پتا ہے نا کہ میری مذاق کرنے کی عادت ہے۔'' رویندر مسکراتے ہوئے بولا۔
''تم سے کون بات کررہا ہے۔'' ریتو نے غصے سے کہا تو نیرو ہنس پڑی۔
''ٹھیک ہے۔ شکریہ۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے روہن اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکلنے سے پہلے روہن نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن نیرو تو اس کو چھوڑنے باہر آئی ہی نہیں۔ وہ دوسری طرف منہ کیے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

باقی آئندہ

رنگین لڑکی

راحیلہ تاج

عورت کی فطرت میں ٹیڑھ ہوتی ہے۔ جسے سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ جو بات اپنے دل و دماغ میں ٹھان لے پھر وہ خاندان کے خاندان تباہ کردیتی ہے۔
اک بھنورا صفت خاتون کا احوال' وہ حسن لطافت کی آوارگیوں کو زندگی کی معراج سمجھتی تھی۔

فرانس سے درآمدہ ایک لہورنگ کہانی' نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

وہ ٹیلی فون کال جمعہ ۸ فروری کی شب ٹھیک ۹ بج کر ۲۴ منٹ پر فرانس کے ایک چھوٹے سے گاؤں' فرلینے سرسارتھے کے چھوٹے سے پولیس اسٹیشن پر موصول ہوئی تھی۔ نسوانی آواز کی مالکہ سخت ہیجان میں مبتلا تھی۔ ڈیسک سارجنٹ کو اس کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ تاہم وہ اتنا سمجھ گیا کہ خاتون یہ اطلاع دینے کی کوشش کررہی ہے کہ کسی نے اس کے شوہر کو گولی ماردی ہے۔

صرف تین ہزار نفوس پر مشتمل یہ گاؤں چونکہ بہت مختصر سا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود پیٹرول مین کو اس پتے پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گاؤں کا یہ علاقہ پرانا اور درماندہ تھا۔ وہ رہائشی عمارت کے دوسرے فلور پر واقع دو کمرے کے ایک اپارٹمنٹ کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا جہاں ایک انتہائی دلخراش اور روح فرسا منظر اس کا منتظر تھا۔ گہری بھوری' لمبی زلفوں کی مالک اکیس سالہ قبول صورت اور حد درجہ خوش اندام جیکو لین بیکر ہسٹریائی انداز میں دھاڑیں مار مار کررو رہی تھی اور کھلی کھڑکی کے سامنے فرش پر اس کے ۲۴ سالہ شوہر پیٹر بیکر کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور یہ خون' گوشت اور شکستہ ہڈیوں کا مجموعہ لگ رہا تھا۔ بیکر چھریرے جسم کا مالک ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ یہ بات ناقابل یقین سی لگ رہی تھی کہ اس کے جسم میں اتنا خون تھا۔ کمرے کا فرش' پردے اور دیوار کے کچھ حصے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پیٹرول مین یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر دہشت زدہ رہ گیا۔ اس نے آج تک ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمر میں بیکر سے زیادہ بڑا نہیں تھا اور دوسرے مقامی لڑکوں کی طرح یہیں پیدا ہوا تھا اور ان ہی کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ وہ نہ صرف بیکر سے واقف تھا بلکہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔

بیکر کا باپ فرانس کے غیر ملکی فوجی ڈویژن سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ویت نام اور الجیریا کی جنگ میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے چار بچوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ بیکر اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ شروع ہی سے بے حد لاغر اور کمزور واقع ہوا تھا۔ اس پر مرگی کے دورے بھی پڑتے تھے۔ سات سال کی عمر میں وہ تقریباً نو ماہ تک عالم بے ہوشی میں پڑا رہا تھا۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی اور اس کا سوتیلا باپ ان سب کا بہت خیال رکھتا تھا۔

بیکر نے پینٹر کی تربیت حاصل کی تھی اور کچھ عرصے تک اسی حیثیت سے کام بھی کرتا رہا تھا۔ لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ وہ پینٹ سے الرجی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس نے یہ پیشہ ترک کردیا تھا۔ اس کے بعد وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگا لیکن کوئی ملازمت بھی مستقل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے فرلینے سرسارتھے کی ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی اور وہ خود کو خوش قسمت تصور کرنے لگا۔ اسے ملازمت کی سخت ضرورت تھی کیونکہ اس نے پچھلے ہی سال جیکو لین سے شادی کی تھی جو بڑوس کے گاؤں بیٹو ماؤنٹ کی رہنے والی تھی۔

پولیس کانسٹیبل اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا کیونکہ جیکو لین کو اس گاؤں میں آئے ہوئے بہ مشکل چار ماہ ہورہے تھے۔ وہ بے شک بالکل نوجوان تھی لیکن خاموش طبع لگتی تھی اور اس کی اس بردباری میں ایک عجیب دلکشی تھی۔ چنانچہ وہ اسے ایک عمدہ لڑکی تصور کرتا تھا لیکن اس وقت وہ زیادہ خوب صورت نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی زلفیں منتشر تھیں اور شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ تاہم اس وقت کی نسبت جب اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا' کچھ سنبھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق اس کا شوہر کھڑکی تک گیا تھا' اس کے پٹ کھولے تھے لیکن اگلے ہی لمحے باہر ایک شدید دھماکہ ہوا تھا اور وہ اچھل کر کمرے میں آ گرا تھا۔ اس نے اس کے سینے پر ایک نگاہ ڈالی تھی اور پولیس اسٹیشن فون کردیا تھا۔

کانسٹیبل نے اس سے کہا کہ وہ فون کرکے ایمبولینس طلب کرنا چاہتا ہے اور دل میں یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا کہ جیکو لین نے پولیس کو فون کرکے غلط نہیں کیا تھا۔ اس امر میں تو کوئی شبہ ہی نہیں تھا کہ بیکر مرچکا تھا۔ اس کے پیٹ اور سینے کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اور یہ اس بات کی غمازی کررہے تھے کہ گولی کسی بے حد طاقتور بندوق یا رائفل سے چلائی گئی تھی۔

کانسٹیبل نے پہلے پولیس اسٹیشن فون کرکے ڈیوٹی سارجنٹ کو اس المناک حادثے کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی وہاں سے تیس میل دور' لی مینز شہر سے ایمرجنسی ایمبولینس طلب کرنے کے لیے کہا کیونکہ بیکر ہر قسم کی طبی امداد سے بہت دور جاچکا تھا۔ سارجنٹ نے اس سے کہا کہ ایمبولینس کے بجائے کورونر وہاں پہنچ رہا ہے۔

ڈیوٹی سارجنٹ نے بہرحال پولیس چیف کو اس کے گھر فون کرکے اس سانحے کی اطلاع دی اور پھر اس کی ہدایت کے بموجب لی مینز کی پولیس کو فون کردیا۔ فرلینے سارتھے پولیس اسٹیشن اتنا بڑا نہیں تھا کہ قتل کے اتنے سنگین اور اہم واقعے کی تفتیش کرسکتا۔ تاہم کورونر کے بعد اس نے ڈاکٹر جیرالڈ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ وہ زیادہ دور نہیں رہتا تھا۔ لہٰذا پونے دس بجے موقع واردات پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے جیکو لین کو خواب آور دوا دے کر نچلی منزل میں واقع خواب گاہ میں سونے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ لاش کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا معائنہ کرکے اس خیال کی تصدیق کردی کسی بہت ہی طاقت ور شارٹ گن کی پہلی یا دوسری گولی سے قتل کیا گیا ہے۔ شاٹ گن یا تو بالکل بھری ہوئی تھی اور اس کی نالی کافی لمبی تھی یا پھر گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی۔ سارے زخم دس انچ سے بھی کم دائرے میں اکٹھے ہوگئے تھے۔ اس کے سوا ڈاکٹر اور کچھ نہ کہہ سکا کہ گولی کو چلے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی اور یہ کہ موت فوری واقع ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں بیکر نے اس وقت پی رکھی تھی کیوں کہ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کے بعد وہ کانسٹیبل کے ساتھ بیٹھ کر لی مینز کے سراغ رسانوں کا انتظار کرنے لگا۔ لاش ان کے پہنچنے تک وہاں سے ہٹائی نہیں جاسکتی تھی۔ کورونر تقریباً اڑتیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا وہ بھی بیکر کو جانتا تھا اور اسے اس کے قتل پر کانسٹیبل سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

کانسٹیبل کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ بیکر کے بارے میں بعض ایسی باتیں جانتا تھا جن کا ڈاکٹر کو علم نہیں تھا۔ مثلاً وہ یہ جانتا تھا کہ بیکر مقامی غنڈوں اور بدمعاشوں کی کئی وارداتوں میں ملوث تھا۔ نوجوان غنڈوں کی ایک ایسی ٹولی آج کل فرانس کے تقریباً ہر گاؤں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اہم مجرمانہ سرگرمیوں میں لوگوں کو سرراہ لوٹ لینا ہفتے کے شبینہ رقص کو درہم برہم کرنا اور بار پر دھاوا بولنا شامل ہیں۔ یہ اگرچہ چھوٹی

موٹی چوریاں بھی کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ڈکیتی اور نقب زنی کی واردات بھی کر لیتے ہیں۔ ایسے گروہوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب بے حد لمبے تڑنگے اور کسرتی جسم کے مالک ہوتے ہیں لیکن بیکر ان سب کا الٹ تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی اسی کمزوری کو چھپانے کی خاطر ان دیوزادوں میں شریک ہو گیا ہو۔

اس وقت کانسٹیبل کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ بیکر کو اتنی طاقت ور شاٹ گن سے گولی مار کر ہلاک کرنے کا کسی کے پاس کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ وہ امیر نہیں تھا اور اس کی شادی کو بہ مشکل چار ماہ ہو رہے تھے۔ ممکن ہے یہ گھریلو جھگڑے کا شاخسانہ ہو یہ بھی ممکن ہے چونکہ وہ ان بدمعاشوں کے بہت سارے راز سے واقف تھا اور اب شادی شدہ اور ملازم ہو جانے کے بعد اس نے اس گینگ سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور اس کا یہ فیصلہ انہیں نہ صرف ناگوار گزرا ہو بلکہ وہ خائف بھی ہو گئے ہوں لہٰذا اس کا قصہ پاک کر دیا ہو۔ اس نے اپنی نوٹ بک کھول کر یہ تھیوریاں نوٹ کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد لی میز سے عملہ پہنچ گیا اور اس نے لاش لی میز پولیس کے سب سے ذہین سراغ رساں انسپکٹر لیٹون مورس کے حوالے کر دی۔ وہ پستہ قد اور معصوم سی شکل کا مالک تھا۔ وہ دوسرے شہر سے محض اس وجہ سے اس پراسرار قتل کی تفتیش کرنے آیا تھا کہ وہ اس رات ڈیوٹی پر تھا۔ اس گاؤں میں بدمعاشوں کی موجودگی کے باوجود زیادہ جرائم نہیں ہوتے تھے جبکہ لی میز میں ہوتے تھے۔ ان کا کرمنل انوسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ چوبیس گھنٹے مصروف رہتا تھا۔ انسپکٹر مورس سب کے ساتھ اور ہر اس چیز کے ساتھ پہنچا تھا جس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سراغ رساں سارجنٹ چارلس، عدالتی ماہر میڈیسن جیوکس، چار ٹیکنیشن بہت سا ساز و سامان اور ایک ایمبولینس موجود تھی تاکہ لاش لی میز کے سرد خانے پہنچائی جا سکے۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اس گاؤں میں سرد خانہ موجود تھا جہاں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا لیکن شاذ و نادر ہی اس کی نوبت آتی تھی۔ ضابطے کی ساری کارروائیاں مکمل ہونے کے بعد لاش سرد خانے بھیج دی گئی جہاں ڈاکٹر جیر اللہ اور لیڈی ڈاکٹر جیوکس نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ معلوم نہ کر سکے۔ سوائے اس کے کہ یہ شاٹ نمبر ۲ تھی جس نے مقتول کا سینہ پھاڑ دیا تھا۔ اس کے دل اور پھیپھڑوں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ صرف ایک چھرا بارود حاصل ہو سکا لیکن وہ بھی بیکار تھا۔ کیونکہ اس سے یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا تھا کہ فائر کس شاٹ گن سے ہوا تھا۔ شاٹ گن کی نالی بالکل چکنی ہوتی ہے اور ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑتی جو بلٹ پر نظر آتا ہے اور جس سے یہ معلوم کرنا آسان ہوتا ہے کہ فائر رائفل سے ہوا یا پستول سے۔

❁……❁……❁

اس دوران انسپکٹر اور اس کے عملے کو بھی تفتیش میں کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جیکولین نے جو وقت بتایا تھا قتل ٹھیک اسی وقت ہوا تھا۔ بیکر کھڑکی تک گیا تھا، اس کے پٹ کھولے تھے اور کسی شاٹ گن سے کیے جانے والے فائر نے اس کا سینہ پھاڑ دیا تھا۔ قاتل کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو گا اور بیکر تھوڑا سا باہر کی جانب جھکا ہو گا کیونکہ گولی سیدھی اس کے سینے میں جا گھسی تھی۔ وہ اس کے جھٹکے سے اچھل کر کمرے میں آ گرا تھا اور فرش پر گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

لیبارٹری کے ٹیکنیشنز کے موقع واردات کا معائنہ کرنے کے دوران انسپکٹر مورس گہری دلچسپی سے وہ نوٹس پڑھ رہا تھا جو کانسٹیبل اس کے حوالے کر گیا تھا اور سارجنٹ چارلس باقی اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ انسپکٹر نوٹس پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ سارجنٹ نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ یہاں شام میں غالباً کوئی پارٹی وغیرہ ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں بچھی ہوئی میز پر کھانے کی پانچ پلیٹیں رکھی ہیں۔ آس پاس ڈھیر سارے خالی گلاس بھی پڑے ہیں، کچن میں پانچ افراد کا کھانا پورے اہتمام کے ساتھ اب بھی موجود ہے اور اسے چھوا بھی نہیں گیا ہے۔ خالی بوتلوں کی خاصی تعداد بھی نظر آ رہی ہے۔

انسپکٹر مورس، جسے ڈاکٹر جیر اللہ نے اس امر سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس نے جیکولین کو خواب آور دوا دے کر سونے کے لیے بھیج دیا ہے، یہ دیکھنے کے لیے خواب گاہ میں گیا کہ آیا وہ سو رہی ہے یا بیان دینے کے قابل ہو گئی ہے۔ جیکولین خوابیدہ نہیں تھی اور اس دوا کی بدولت اس قابل ہو گئی تھی کہ اپنا بیان دے سکے۔ انسپکٹر نے اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور جیکولین اپنا بیان دینے لگی۔ اس نے بتایا کہ آج اس کے ہاں دوستوں کی پارٹی تھی اور انہوں نے بیٹو ماؤنٹ کے ایک مزدور ۲۴ سالہ برنارڈ کو مدعو کیا تھا جو اس کا پرانا دوست تھا اس کے علاوہ بیکر کا تئیس سالہ دوست جیروم اور ان کی انیس سالہ پڑوسن اینی بھی مدعو تھی جو نچلی منزل میں رہتی تھی۔ پارٹی پانچ بجے شام کو شروع ہوئی تھی اور کافی پینے پلانے کے بعد اینی نے یہ تجویز پیش کی کہ اب اس کے اپارٹمنٹ میں چل کر مزید پی جائے۔ سب نے اس تجویز کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور وہ سب اینی کے اپارٹمنٹ میں چلے گئے جہاں یہ شغل ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہا پھر وہ اور بیکر کھانے کا اہتمام کرنے کے ارادے سے اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آ گئے۔ بیکر اپنے ہائی فائی سیٹ کو درست کرنے بیٹھ گیا، جو ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا اور وہ ایک پلیٹ اٹھا کر کچن میں جا رہی تھی کہ اس نے بیکر کو کھڑکی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور اگلے ہی لمحے باہر ایک شدید دھماکہ ہوا۔ بیکر الٹ کر کمرے کے فرش پر آ گرا اور ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا۔

اس بیان سے صرف ایک بات واضح ہو گئی جو پوسٹ مارٹم میں بھی ظاہر ہوئی تھی۔ یہ کہ بیکر نے بہت زیادہ چڑھا رکھی تھی۔ لیکن ایک عجیب سوال یہ ابھرتا تھا، کہ مہمان کہاں گئے؟ انسپکٹر زینہ طے کر کے نچلی منزل میں اینی کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا اور اطلاعی گھنٹی بجائی۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور اس کے خلاء کو شب خوابی کے گاؤن میں لپٹی ہوئی اینی نے پر کر دیا۔ ایسے میں وہ کسی فریم میں سجی ہوئی گڑیا لگ رہی تھی۔ انسپکٹر اس کا بیان لینے لگا اور سارجنٹ اندر کے کمرے میں چلا گیا جہاں ایک نوجوان بستر پر دراز تھا۔ اس کے جسم پر بھی ہلکا پھلکا لباس تھا۔ اس نے جیروم کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ اینی کا بیان بہت ہی مختصر تھا۔ جیروم کا بھی اتنا ہی مختصر تھا۔ ان کے مطابق وہ اس پارٹی میں مدعو تھے اور اینی کے ہاں آ کر دوسرا دور چلانے تک وہاں مسلسل پیتے رہے تھے پھر بیکر اور جیکولین کھانے کا اہتمام کرنے اپنے اپارٹمنٹ میں واپس چلے گئے تھے لیکن کافی دیر تک واپس نہیں آئے۔ وہ دونوں ان کا انتظار کرتے کرتے اکتا گئے اور پھر سونے چلے گئے۔ برنارڈ تنہا اپنے گاؤں بیٹو ماؤنٹ واپس جا چکا تھا۔ انہیں پارٹی کا یہ اختتام عجیب نہیں لگا تھا اور انہوں نے کسی فائر کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اینی کا اپارٹمنٹ نچلی منزل کی مخالف سمت میں تھا۔ ان کے شناختی کاغذات کے مطابق جیروم اور اینی دونوں ہی مقامی تھے۔ انسپکٹر نے اوپر واپس جا کر کانسٹیبل سے پوچھا کہ کیا وہ ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟

کانسٹیبل نے جواب دیا کہ وہ اینی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس کی معلومات کے مطابق اینی گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی اور اس نے اس کے متعلق کبھی ایسی ویسی کوئی بات نہیں سنی تھی...... لیکن وہ اپنا گھر چھوڑ کر اس اپارٹمنٹ میں تنہا کیوں رہتی تھی اور اس کا کرایہ کون ادا کرتا تھا؟ اس کا اسے کوئی علم نہیں، لیکن ممکن ہے وہ کہیں ملازمت کرتی ہو کیونکہ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کو آسانی سے روزگار مل جاتا ہے۔ جہاں

تک جیروم کا تعلق ہے وہ بیکر کا دوست ہوسکتا ہے وہ نہ صرف بہت بڑا بدمعاش ہے بلکہ سفاک ترین شخص ہے۔ کانسٹیبل کو یقین تھا کہ اس کا پولیس ریکارڈ بھی ہوگا لیکن چونکہ وہ تفتیش کار نہیں تھا اس لیے اسے تفصیل کا علم نہیں تھا۔

❀......❀......❀

انسپکٹر موریس جب گاؤں کے پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہاں پولیس چیف اور کرمنل انوسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ کا پورا عملہ جلوہ افروز تھا۔ اس گاؤں میں چونکہ قتل کے واقعات عام نہیں تھے پولیس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کیس سے کیسے نمٹا جائے اور یہ کہ لی مینز سے آنے والے سراغ رساں اس سے کیسے نمٹیں گے۔ چنانچہ اس نے اس خیال سے اپنے عملے کے سارے افراد کو طلب کرلیا تھا کہ ممکن ہے ان کی ضرورت پڑ جائے۔ وہ صرف اتنے ہی کارآمد ثابت ہوئے کہ جیروم کے بارے میں جو باتیں پولیس فائل میں نہیں تھیں وہ انہوں نے زبانی مہیا کردیں۔ ان کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جیروم عام بدمعاشوں سے اونچے درجے کا بدمعاش تھا اور ایک بڑا مجرم بننے کی راہ پر گامزن تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز ویک اینڈ کے شبینہ رقص کو درہم برہم کرنے سے کیا تھا لیکن پھر اسے غیر منفعت بخش پا کر جلد ہی نقب زنی شروع کردی تھی اور اب باور کیا جارہا تھا کہ اس نے منشیات کا کاروبار بھی شروع کردیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ تشدد اور ہنگامہ آرائی سے تائب ہورہا تھا بلکہ حصول رقم کے لیے یہ کام کرنے کا اصول وضع کررہا تھا۔ رات میں گھر لوٹنے والے کسی شرابی کو پکڑ کر اسے زدوکوب کرکے اس کی جیبیں خالی کردینا یا کسی طوائف سے اس کی ساری رقم چھین لینا بھی خاصا منافع بخش تھا۔ رقص گاہوں میں ہنگامہ آرائی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کی پولیس کم سے کم نو مرتبہ ڈکیتی، تشدد، ہنگامہ آرائی اور مختلف الزامات کے تحت اسے بند کرچکی تھی لیکن اسے جیل بھیجنے کے بجائے لاک اپ ہی میں رکھا جاتا اور وہیں اپنا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے کا انتظار کرتا۔ چونکہ وہ نوجوان تھا لہٰذا عدالت اسے بار بار سنبھلنے کا موقع دے رہی تھی۔

انسپکٹر موریس ایسے بدمعاشوں سے خوب واقف تھا۔ لی مینز میں بے شمار جیروم تھے اور عدالت عام طور سے انہیں اس وقت تک ڈھیل دیتی تھی جب تک وہ کسی سنگین جرم کے مرتکب نہ ہوجائیں۔ مثلاً کسی کو قتل نہ کردیں اور اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ پھر بھی نوجوان مجرموں کو بارہ سال سے زیادہ سزا نہیں ہوتی تھی لیکن وہ درحقیقت اس سے نصف سے بھی کم عرصہ سزا کاٹ کر آجاتے تھے۔ دراصل بے شمار قانون شکن یہ جان گئے ہیں کہ آج کل مشکل ہی سے کوئی جرم اتنا سنگین تصور کیا جاتا ہے جس کے تحت کسی کو کڑی سزا دی جاسکے۔ انسپکٹر موریس اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ نوجوان مجرم قید میں بھی خود کو قوال سمجھتے ہیں اور گویا وہاں تفریح کرنے جاتے ہیں۔ انہیں حد سے زیادہ رعایت دی جاتی ہے اور یہ اس خیال سے رہا کردیے جاتے ہیں کہ پھر سے ایک اچھے شہری بن کر وہیں سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے جہاں سے چھوڑ آئے تھے۔

لہٰذا انسپکٹر کے خیال میں جیروم ایک اعلیٰ درجے کا مشکوک ہوسکتا تھا لیکن زیادہ تسلی بخش نہیں۔ اس کے ریکارڈ سے یہ بات عیاں تھی کہ اگر اس نے یہ قتل کیا تھا تو جذبات کی بنا پر کسی خاص وجہ سے کیا ہوگا اور اپنے تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی بے عیب اور جامع منصوبہ تیار کیا ہوگا۔ لہٰذا اس بات کا زیادہ امکان نظر نہیں آتا تھا کہ پوچھ گچھ کے ذریعہ اس سے کچھ اگلوایا جاسکتا ہے۔ یہ بات عیاں تھی کہ جیروم، ایپی یا برنارڈ میں سے کسی کے بھی پاس موقع واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی بھی گھوم کر عمارت کے اس پہلو میں جاسکتا تھا اور بیکر کو قتل کرکے پانچ یا چھ منٹ میں اطمینان سے واپس آسکتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی آخر بیکر کو قتل کرنا ہی کیوں چاہتا تھا؟

ایپی کو تو فوری اس معاملے سے خارج کیا جاسکتا تھا۔ جس طرح گاؤں کے سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اسی طرح وہ بھی بیکر کو جانتی تھی۔ لیکن اس بات کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی کہ بیکر کے اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے سے پہلے اسے بیکر سے کوئی سروکار بھی تھا۔ پھر یہ کہ وہ بیکر سے زیادہ جیکولین کی دوست تھی۔ برنارڈ بھی جیکولین کا دوست تھا۔ اور اس کی شادی سے پہلے وہ بیکر کو نہیں جانتا تھا۔ بادی النظر میں یہ محبت کا مثلث نظر آرہا تھا چنانچہ سارجنٹ کو یہ پتا چلانے کے لیے بیوماؤنٹ بھیجا گیا کہ کیا شادی سے پہلے جیکولین اور برنارڈ کے تعلقات دوستی سے زیادہ گہرے تھے؟

سارجنٹ بیٹوماؤنٹ میں سارا دن گزار کر واپس آیا تو یوں لگ رہا تھا گویا اس کے چہرے نے حیرت کی تصویر کھینچ لی ہو۔ اسے جیکولین کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ وہ بیٹوماؤنٹ کی بدنام ترین دوشیزہ تھی۔ وہ حد سے زیادہ بے باک واقع ہوئی تھی اور مشکل ہی سے کوئی جوان یا بوڑھا اس کی محبت سے محروم رہا ہو۔ اس کی فطرت کی یہ رنگینی ایک مرض کی صورت اختیار کرگئی تھی اور وہ پورے گاؤں کے لیے ایک زبردست خطرہ بنی ہوئی تھی اگرچہ وہ پری جمال نہیں تھی لیکن دلکش اور چنچل تھی۔ سارجنٹ وہاں اخلاقیات کی تفتیش کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا چنانچہ اس نے اس کے عاشقوں کے نام اور جگہوں کے نام نہیں پوچھے۔ تاہم یہ بات بالکل عیاں تھی کہ اس کے بیشتر عشاق عمر میں اس سے چوگنے اور پانچ گنے بڑے تھے۔ حالانکہ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں لڑکیاں گڑیوں سے بہلا کرتی ہیں۔ اس کے والدین نہ صرف اس سے نالاں تھے بلکہ دہشت زدہ بھی تھے کہ وہ نہ جانے کب کوئی نیا گل کھلائے چنانچہ انہوں نے اسے کیتھولک اسکول برائے خواتین میں داخل کردیا۔ جہاں وہ ننوں کی سخت زیرنگرانی میں رہنے لگی۔ یہ ننیں ممکن ہے بے حد سخت گیر ہوں لیکن جیکولین کی رنگین فطرت سے بالکل میل نہیں کھاتی تھیں چنانچہ انہوں نے تنگ آکر اسے اسکول سے خارج کردیا۔

جیکولین نے سولہ سال کی عمر میں چون سالہ شخص سے شادی کرلی لیکن اس شادی میں اس کے والدین کی دعائیں بھی شامل تھیں جو اس ذمے داری سے سبکدوش ہونے کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ تھے۔ شادی کی تقریب بخیروخوبی انجام پاگئی لیکن ہنی مون کے دوران ہی ان میں خطرناک جنگ شروع ہوگئی لیکن یہ جنگ فوراً ہی طلاق پر منتج نہیں ہوئی بلکہ نو مہینے برقرار رہی لیکن ان نو مہینوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو کہ جیکولین نے اپنے شوہر سے بے وفائی نہ کی ہو۔ بالآخر اس کے شوہر نے اپنی بدنامی سے تنگ آکر اسے طلاق دے دی۔ جیکولین میں طلاق حاصل کرکے اپنے میکے آگئی اور اس کے والدین کو ایک بار پھر دہشت نے آگھیرا۔ وہ وہاں تین سال تک رہی اور کہیں ملازم نہ ہونے کے باوجود بے حد مصروف رہی۔ اگست میں وہ فرلینے سرسار تھے کے بیئر فیسٹیول میں شریک ہونے گئی۔ جہاں بیکر سے اس کی ملاقات ہوگئی اور انہوں نے دو ماہ سے بھی کم مدت میں شادی کرلی۔ بیکر کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ پہلے بھی شادی کرچکی تھی اور اسے طلاق ہوگئی تھی۔ وہ اسے کنواری سمجھے بیٹھا تھا لیکن جلد ہی اس کے خوابوں کے رنگ اترنے لگے۔ جیکولین ان میں سے نہیں تھی جو نجی مصروفیات میں شادی کی مداخلت برداشت کرسکتیں۔ ابھی بیکر نے اسے گھر کی دہلیز پار کرائی تھی کہ وہ وقت بے وقت اپنے دوستوں کو وہی دہلیز پار کرانے لگی۔

اس صورت حال نے انسپکٹر کو سخت الجھن میں ڈال

دیا۔ مقتول بیکر کے پاس اپنی بیوی کو قتل کرنے کا ٹھوس محرک تھا لیکن اس کی بیوی یا کسی اور کے پاس اسے قتل کرنے کا کیا جواز تھا۔ وہ کسی کا رقیب روسیاہ بھی نہیں تھا۔ اور جسمانی طور پر لاغر اور کمزور تھا۔ کسی کو بھی اس سے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اس سے شادی نہ کرتا اور عشاق کی صف ہی میں شامل رہتا۔ ان پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اسے برنارڈ کا خیال آ گیا۔ جیکولین سے یقیناً اس کے تعلقات رہے ہوں گے کیونکہ وہ اس کے گاؤں بیٹو ماؤنٹ کا رہنے والا تھا لیکن اس کی حیثیت بھی اس جم غفیر میں امتیازی نہیں لگتی تھی وہ جیکولین کا محبوب نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم اس کی شادی کے چند ہی ہفتے بعد ان کے ساتھ رہنے لگا تھا اور اس کی شامیں اور راتیں ان ہی کے ساتھ گزرتی تھیں۔ وہ کھاتا بھی وہیں تھا لیکن اس نے اور جیکولین نے اپنے تعلقات کو جھٹلایا تھا اور جو شخص حقیقت سے واقف تھا وہ مر چکا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ بیکر نے اس طرز کی زندگی کیوں اپنائی تھی وہ جسمانی اعتبار سے برنارڈ سے کافی کمزور تھا اور پھر بہر صورت اس نے کچھ کیا بھی نہیں تھا۔

جہاں تک جیروم کا تعلق ہے وہ بھی بیکر کے ہاں راتیں گزارا کرتا تھا اور بیکر سب کچھ جانتے ہوئے بھی نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا ہو کیونکہ وہ جیروم کا زبردست مداح تھا۔ جیروم جو کہ اب بھی مشکوک افراد میں سرفہرست تھا' لی مینز کے لاک اپ میں بند تھا اور حالانکہ اس نے سب کچھ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا' پھر بھی وہ واحد فرد تھا جس کے پاس قتل کرنے کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور تھا۔ ممکن ہے منشیات کا کاروبار اس کا محرک ہو فرانس کی حکومت ہر قسم کے جرم کو حتیٰ کہ قتل تک کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن منشیات کے معاملے میں حد درجہ سخت رویہ رکھتی ہے۔ وہ لوگ منشیات کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے بے حد خائف ہیں اور انہوں نے منشیات کا کاروبار کرنے والوں اور اس کا استعمال کرنے والوں کے لیے کڑی سزائیں رکھی ہیں۔ انسپکٹر نے سوچا کہ ممکن ہے' بیکر' جیروم کے کاروبار کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہو۔ جیروم کسی زمانے میں اس پر بے حد بھروسہ کرتا ہو جب دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اس نے بیکر جیسے لاغر کو شریک راز کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ وہ پولیس کی ایک بھبکی بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اس نے یہ سوچا ہو کہ اس کا قصہ پاک کر دینا ہی بہتر ہوگا اور اس نے اس کا قصہ پاک کر دیا۔ لیکن جو شے اسے پریشان کر رہی تھی' وہ تھا وقت' وہ کھڑکی جس سے بیکر کو گولی ماری گئی تھی' بالکل سڑک پر کھلتی تھی اور چونکہ رات کے وقت اس پر زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا تھا لہٰذا قاتل کھڑکی کے نیچے شاٹ گن تھامے' جب تک چاہتا انتظار کر سکتا تھا' اگر جیروم ہی نے اسے قتل کیا تھا تو وہ اپنی کے اپارٹمنٹ سے نکل کر یہاں تک آیا ہوگا اور گولی مار کر فوراً ہی لوٹ گیا ہوگا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ کیونکر معلوم تھا کہ بیکر کب کھڑکی سے آدھا دھڑ نکال کر جھکے گا؟ یا وہ یہ کیسے جانتا تھا کہ بیکر اس رات آ کر ضرور کھڑکی کھولے گا؟ وہ صرف یہی سوچ سکتا تھا کہ جیروم نے اسے باہر سے پکار کر کھڑکی پر آنے کے لیے کہا ہوگا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے وہ کتنی زور سے چیخا ہوگا؟ انسپکٹر نے لی مینز سے ٹیکنیشنز کو طلب کر لیا۔

وہ لوگ اپارٹمنٹ کے اندر گھوم پھر کر مختلف مقامات سے باہر سے پکارے جانے والے اپنے نمبروں کو سننے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسی دوران ان کی نگاہیں ایک ایسی شے پر پڑیں جو پہلی نگاہ میں آنے سے رہ گئی تھیں۔ کئی جگہوں پر دیواروں میں سوراخ تھے اور پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ سوراخ کس قسم کے ہیں۔ یہ شاٹ گن کی گولیوں کے سوراخ تھے۔ انہوں نے دیواروں کو ان جگہوں سے کھودا تو اندر

سے شاٹ گن کی گولیاں برآمد ہوئیں۔ یہ مختلف سائز کی تھیں۔ نمبر ۳ نمبر ۴ حتیٰ کہ نمبر ۲ بھی۔ اسی سائز کی جس سے بیکر کو ہلاک کیا گیا تھا۔

انسپکٹر کو فوراً اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگا بھاگا فریسنے سرسار تھے آ گیا۔ نہ تو اسے اور نہ ہی ٹیکنیشنوں کو یہ معلوم تھا کہ دیوار میں موجود یہ گولیاں کیا ظاہر کرتی ہیں لیکن یہ بات طے تھی کہ جیکولین اور بیکر کے یہاں منتقل ہونے کے بعد ہی یہ سب ہوا ہے کیونکہ اس وقت اس اپارٹمنٹ کو نیا نیا پینٹ کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس امر میں اب کوئی شبہ نہ رہا کہ جیکولین نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ اس کے شوہر کے پاس کوئی شاٹ گن نہیں تھی اور اس اپارٹمنٹ میں کبھی کوئی شاٹ گن نہیں رہی۔ لیکن ان دیواروں میں موجود گولیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ ان کے پاس نہ صرف شاٹ گن تھی بلکہ اس سے کئی موقعوں پر دیواروں پر گولیاں برسائی گئی تھیں اور یہ ممکن نہیں تھا کہ جیکولین اس بات سے آگاہ نہ ہو وہ بے شک اس کے بارے میں جانتی تھی۔

اس سے جتنی سختی سے پوچھ گچھ کی جانے لگی' اس کا بیان اتنا ہی الجھن آمیز اور متضاد ہوتا چلا گیا۔ بالآخر اس نے اس پر بات ختم کر دی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ شاٹ گن کس طرح لوڈ کی جاتی ہے' اگر برنارڈ نے اس کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ کبھی اسے لوڈ نہ کر سکتی۔ اسے فوراً قتل کے شبہے میں گرفتار کر لیا گیا اور لی مینز لے جایا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی برنارڈ کو بھی وہیں پہنچا دیا گیا۔ برنارڈ صحت جرم سے بار بار انکار کرنے لگا جب اس نے ٹیپ ریکارڈ سنا جس میں جیکولین نے شاٹ گن کو لوڈ اور خالی کرنے پر تبصرہ کیا تھا تو اس نے اقرار کیا کہ یہ سچ ہے' اس نے شاٹ گن لوڈ کی تھی کیونکہ جیکولین کو لوڈ کرنا نہیں آتا تھا' اس کے بعد وہ کچن میں چلا گیا تھا ایک ہی لمحے بعد اس نے ایک زوردار دھماکہ سنا اور کمرے میں آیا تو بیکر کھڑکی کے سامنے' فرش پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا اور جیکولین دھواں اگلتی ہوئی شاٹ گن تھامے کھڑی تھی۔ پھر جیکولین کے فون کرنے کے دوران اس نے شاٹ گن لے جا کر دریائے سارتھے میں پھینک دی اور بیٹو ماؤنٹ لوٹ گیا۔ وہ واضح طور پر یہ بتانے سے قاصر رہا کہ جیکولین نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا لیکن اس کے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں اس بات پر ہمیشہ لڑتے رہتے تھے کہ جیکولین کے چاہنے والے اور بھی تھے۔ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ بھی ان عاشقوں میں سے ایک ہے۔

اب جیکولین نے درست بیان دیا اور یہ تسلیم کیا کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے لیکن اس کا محرک برنارڈ کی طرح واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کے درمیان ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہتا تھا کیونکہ بیکر اس سے خواہ مخواہ جلتا تھا۔ اس نے یہ الزام لگایا کہ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ بیکر اسے نقصان پہنچائے گا۔ کیونکہ وہ ایک شاٹ گن خرید لایا تھا اور جب غصے میں یا نشے میں ہوتا تھا تو دیواروں پر فائر کرنے لگتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کسی روز اسے بھی اس شاٹ گن سے گولی مار دے گا اور چونکہ وہ ابھی زندگی کی رونقوں سے منہ موڑ کر موت کو گلے نہ لگانا چاہتی تھی اس لیے وہ بھی کسی ایسے ہی موقعے کی منتظر تھی جب تمام واقعات اور شبہات اس کے جرم کی پردہ پوشی کر سکیں اور وہ موقع اسے اس ایوننگ پارٹی نے فراہم کر دیا تھا۔

جیکولین کو خاموش طبع لڑکی کی حیثیت سے جاننے والا پیٹرول مین ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اس کی رنگین فطرت سے جنم لینے والے اس بھیانک حادثے کی کارروائی سن رہا تھا۔

❖

وشنام

احمد صغیر صدیقی

خالق کائنات نے ہر شے کو مختلف النوع اشیاء سے وابستہ کر رکھا ہے مگر ان سازوں کو سمجھنے کے لیے نظر و فکر چاہیے۔

ایک ایسے نفسیاتی مریض کی کہانی جو مجرم تھا سائنس فکشن کے شائق قارئین کے لیے

عام طور پر سائیکو وارڈ میں مریض کو اس کے عزیز و اقارب ہی داخل کراتے ہیں' مگر یہ معاملہ مختلف تھا۔ اس بار مریض خود سے آیا تھا۔ اور درخواست کی تھی کہ اسے نفسیاتی امراض کے وارڈ میں داخل کرلیا جائے کیونکہ وہ بے حد خطرناک مریض ہے۔

مس نیلسن نے جو کہ ریسپشن آفیسر ہے فوراً ڈاکٹر اسکاز کو فون کیا تھا اور ڈاکٹر اسکاز نے چلتے وقت مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا کہ شاید میری ضرورت پڑ جائے کیونکہ میں اسپتال میں گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ میرا جسم مضبوط ہے اور میں جوڈو کراٹے کا ماہر ہوں۔

مریض وہاں کچھ اس انداز سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا جیسے اسے خطرہ ہو کہ اس کی ذرا سی حرکت کسی نہ کسی کو جان سے مار دینے کے لیے کافی ہوگی۔ ویسے وہ اوروں ہی کی طرح تھا اور اسے تنومند بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بھی نازک سے تھے۔

''مس نیلسن' ان صاحب کے بارے میں تم نے معلومات لکھ لی ہیں؟'' مریض سے مخاطب ہوئے بغیر ڈاکٹر اسکاز نے ریسپشنٹ سے استفسار کیا۔

''جناب یہ کچھ بتا ہی نہیں رہا ہے کہتا ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بتانا خودکشی کے مترادف ہوگا۔'' لڑکی نے جلدی سے کہا۔

''لیکن کم از کم ہمیں نام تو معلوم ہی ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

مریض جو بینچ کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا لرزتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا نا کہ میں یہی بات بتانا نہیں چاہتا۔ نام...... ہاں میں اپنا نام بھی نہیں لینا چاہتا۔''

نفسیات دانوں کے بارے میں ایک بات آسانی سے نوٹ کی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ ایسی باتوں پر متحیر تو ہوتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ میں بھی ان باتوں کا عادی ہو چلا ہوں۔ مگر اس بار بڑا ہی حیرت انگیز معاملہ تھا۔ قدرتی طور پر میرا تحیر میرے چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر اسکاز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر مریض کی سمت دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کچھ رش ہے۔ ہم مینٹل ہائجین آفس میں چلتے ہیں۔''

مریض اٹھ گیا اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ڈاکٹر اسے لے کر اپنے آفس میں چلا گیا اور میں آفس سے متصل کمرے میں جا بیٹھا جہاں ایک پتلا سا دروازہ دونوں کو ملاتا تھا۔ میں یہاں سے

ان کی گفتگو سن سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر مداخلت بھی کرسکتا تھا۔

''چلو اب بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' ڈاکٹر اسکاز نے متانت سے دریافت کیا۔ ''کم از کم اتنا تو بتاؤ گے ہی؟''

''ہاں اس میں کوئی حرج نہیں۔'' مریض نے کہا۔ ''بس میں تمہیں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ نہ ہی میں تمہارا نام لینا چاہتا ہوں۔ چاہے مجھے بتا بھی کیوں نہ دیا جائے۔ میں کسی کا بھی نام نہیں لوں گا۔''

''کیوں؟''

مریض چند لمحوں تک چپ رہا۔ وہ گہری سانسیں بھر رہا تھا اور ان کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ شاید وہ بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا۔

''جب بھی میں کسی کا نام تین بار لے لیتا ہوں' وہ آدمی مر جاتا ہے۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''اچھا!'' ڈاکٹر اسکاز نے تفہیمی انداز میں کہا۔ ''یہ واقعہ صرف آدمیوں کے نام تک محدود ہے؟''

''دیکھیے......'' مریض کی آواز کے ساتھ کرسی کھینچنے کی آواز بھی سنائی دی شاید وہ ڈاکٹر سے مزید قریب ہوا تھا۔

''یہی میری پریشانی ہے اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ ڈاکٹر تمہیں شاید میری بات پر یقین نہیں ہوگا مگر میں سچ کہتا ہوں میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسی ترکیب کے ذریعے وہ افراد سے وہ ساری باتیں اگلوا لیتا تھا' جنہیں وہ بتانا نہیں چاہتے تھے۔

''پہلا شکار ولیم گرین تھا۔'' مریض نے دبی آواز سے کہا۔ ''شاید تم نے اس کا نام سنا ہو۔ وہ انڈر سیکریٹری کے عہدے پر تھا۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ میں اس کا نام اخباروں میں بھی دیکھتا تھا۔ ولیم گرین' اچھا نام تھا اور پھر میں نے اسے تین بار کہا تھا اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟''

''ولیم گرین نے پچھلے ہفتے خودکشی کی تھی۔'' ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔ ''وہ پچھلے کچھ عرصے سے نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس ضمن میں کچھ زیادہ نہیں سوچا تھا۔ یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ پھر میں نے ایک نیوز ریلی دیکھی۔ یہ آبدوز بارنیکل کے بارے میں تھی۔ میں نے بلند آواز سے تین بار یہ نام دہرایا تھا بس یونہی۔ بعض اوقات ہم سب ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''ہاں...... نام ہمیں اکثر دہرانے ہی پڑتے ہیں۔''

''پھر جانتے ہو کیا ہوا...... یہ آبدوز ڈوب گئی اور پھر یہاں سے میرے ذہن میں شبہ سا پیدا ہوگیا۔ میں نے تجربتاً اخبار سے ایک نام چنا میرا خیال تھا اسے کوئی نفسیاتی عارضہ نہیں ہے۔ نہ ہی آبدوز کی مانند اس کا بزنس پرخطر تھا۔ یہ ایک لڑکی کا نام تھا' کلارا...... یہ میڈیکل کی طالبہ تھی۔''

''کیا وہ بھی مر گئی؟''

''ہاں۔'' مریض نے سسکاری سی بھری۔ ''کار کے حادثے میں' کار میں اور بھی لوگ تھے مگر مری صرف وہی تھی۔ یہ پچھلے اتوار کی بات ہے۔''

”لیکن یہ سب اتفاقات بھی تو ہوسکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے تم نے اور بھی بہت سے نام لیے ہوں مگران کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔“

مریض نے جھنجلا کر کرسی چھوڑ دی۔ مجھے کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ جھنجلاہٹ میں یہ مریض ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا اور عمل کے لیے تیار ہوگیا۔

جونہی مجھے احساس ہوا کہ میرا شبہ غلط نہیں مریض نے کہا۔ ”میں نے ناموں کو تین بار دہرانا بالکل بند کردیا بلکہ میں تو ایک بار بھی کسی کا نام پکارتے ہوئے ڈرنے لگا تھا پھر کل رات......“

”ہاں، کہو کہو؟“

”ایک بار میں لٹیرے گھس آئے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب گاہک جاچکے تھے اور بارٹینڈر دکان بند کرنے والا تھا۔ یہ دو افراد تھے۔ بار میں تھوڑی گڑبڑ مچی اور پھر انہوں نے بارٹینڈر کو مار ڈالا۔ پولیس آئی اور موقع پر ایک لٹیرے کو تو مار گرایا گیا مگر دوسرا بھاگ نکلا۔ جس لٹیرے کو گولی لگی تھی، اس کا نام تھا......“

میں نے اپنے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔ اس وقت مریض اخبار کے کچھ تراشے ڈاکٹر کو دکھا رہا تھا۔

”پال میخائل۔“ ڈاکٹر نے اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا جو تراشے میں چھپی ہوئی تھی۔

”نام مت لو۔“ مریض نے چیخ کر کہا۔ میں نے لپکنے کی تیاری کی مگر ڈاکٹر نے ہلکا سا اشارہ کرکے مجھے روک دیا۔

”دراصل میں یہ نام نہیں لینا چاہتا اگر میں نے تین بار اسے دہرایا تو یہ ضرور مرجائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”تم خوف زدہ ہو کہ کہیں تمہاری اس حرکت سے کوئی موت کے گھاٹ نہ اتر جائے۔ میں سمجھ گیا۔ مگر اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں تمہارے لیے؟“

”مجھے یہیں رکھ لو، مجھے ناموں کو تین بار دہرانے نہ دو، میں بے حد خطرناک ہوں۔ خدا معلوم میری وجہ سے کتنے لوگ مرے ہوں گے۔“

پھر اسکاز نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ ہر ممکن مدد کریں گے مریض کو معائنے کے لیے لے جایا گیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ مریض اپنا نام بتانے پر قطعی آمادہ نہ تھا۔ اس کوشش میں ڈاکٹر میری مین پر جو کہ سائیکاٹری ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے، دل کا دورہ بھی پڑ گیا وہ پہلے سے دل کے مریض تھے اور ان کے لیے یہ محنت مہنگی پڑی تھی۔

مریض کو اسپتال کا لباس پہنا دیا گیا اور اسے ایک کمرہ بھی دے دیا گیا۔ اس سے فارغ ہوکر ڈاکٹر اسکاز اور میں جب یکجا ہوئے تو اسی کی گفتگو چھڑ گئی۔

”واقعی بڑا عجیب کیس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ذہن میں ایسی بات بیٹھ جائے کہ میں کسی کا نام تین بار لوں تو وہ مرجائے گا۔ ایک حد درجہ پریشان کن گرہ کہی جاسکتی ہے۔“

”یہ بچپن کے کسی واقعے کی دین ہے۔“ ڈاکٹر نے مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا کہ بچے اکثر سمجھنے لگتے ہیں کہ خواہش کرنے سے ہی

وہ بہت کچھ کرا سکتے ہیں۔ مجھے خود یاد ہے کہ بچپن میں ایسی احمقانہ باتیں سوچا کرتا تھا اب یہ دوسری بات ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کو جلد اس حماقت کا ادراک ہوجاتا ہے اور بہت سے اس کی گرفت ہی میں پھنسے رہ جاتے ہیں۔“

”مگر یہ پال میخائل۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو ہمارے ہی اسپتال کے ہنگامی شعبے میں زیر علاج ہے اس کی حالت بہت نازک ہے۔

”یہ شہر کا سب سے بڑا اسپتال ہے۔“ جواباً ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔ ”ایسے تمام کیس جو پرائیویٹ اسپتال والے نہیں لیتے یہاں آتے ہیں۔ یہ مریض بھی اسی لیے یہاں ہے۔“

”میرے لیے کوئی ہدایت......؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ کیس خودکشی یا قتل وغیرہ جیسے رجحانات کا نہیں۔ بس اسے پرسکون رکھو، ضرورت ہو تو مسکن دوا بھی دے دینا۔“

❁......❁......❁

میرے پاس مشغول رہنے کے لیے کافی کام تھا۔ تاہم اس مریض نے کوئی پریشانی نہیں پیدا کی۔ البتہ دو گھنٹے قبل دن کے کھانے کے بعد کی بات ہے، میں ایک مریض کو ہائیڈروتھراپی وارڈ میں لے جارہا تھا اور اس مریض کی جانب متوجہ نہ تھا ورنہ ضرور دیکھ لیتا کہ وہ خاصا بے چین ہے۔ اچانک وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے کانپتے ہوئے مجھے چھوا اور بولا۔

”میرے ذہن میں بار بار وہ نام ابھر رہا ہے۔ بار بار وہ......“ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”میرے اندر زبردست خواہش ابھر رہی ہے کہ میں اسے منہ سے دہراؤں، کچھ کرو، مجھے روکو۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔ اور پھر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم پال میخائل......“

وہ ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ پرسکون ہوجائے۔ پھر نرس نے اسے دوا دے دی تھی اور وہ کھڑکی کے پاس اپنا سر پکڑ کر جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا...... ”مجھے پتا ہے میں اس کا نام ضرور لوں گا......“

❁......❁......❁

جب میں اپنے بستر پر لیٹا تب بھی میرے ذہن میں یہی مریض تھا۔ دوسرے روز اسپتال میں، میں نے بہت سے پولیس والے دیکھے۔ ڈاکٹر اسکاز واقعی بہت پریشان تھا۔

”پتا نہیں اس مریض پر اس کا کیا اثر ظاہر ہوگا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”وہ مجرم پال میخائل......“

”ہاں...... کیا ہوا اسے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”مرگیا ہے۔“ ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔

میں چند لمحوں تک سناٹے میں رہا۔ ”اوہ“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کی حالت تو واقعی نازک تھی اسے کئی گولیاں لگی تھیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔ ”مگر وہ اس وجہ سے نہیں مرا...... کسی نے اس کے گلے میں چاقو اتار دیا تھا۔“

”اوہ وہ مریض؟“

”اسے بے ہوش کردیا گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس نے اس

لٹیرے کا نام کئی بار لیا ہے اور اب وہ ضرور مر جائے گا۔"

"آپ نے اس موت کے بارے میں تو اسے بتایا نہیں ہوگا؟"

"میں نے اسے کچھ نہیں بتایا ہے۔ وہ مزید پریشان ہوتا۔"

تھوڑی دیر میں میخائل کے بارے میں تمام اسپتال واقف ہو چکا تھا سوائے مریض کے جو بے ہوش تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر پرانا کانسٹیبل سالٹری متعین تھا۔ پولیس والے چانس نہیں لیتے۔ وہ اس لیے متعین کیا گیا تھا تاکہ وارڈ کے اندر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھے۔

اس کیس میں میخائل کے ساتھ یقیناً کوئی اندر بھی رہا ہوگا اور چاقو مارنے والی حرکت یقیناً اسی نے کی ہوگی۔

ہوسکتا ہے یہ حرکت اس وقت کی گئی ہو جب سالٹری کسی طرف چلا گیا ہو۔ ویسے بھی وارڈ کے اندر مریض عموماً نیند کی دوا کے زیر اثر تھے۔ سالٹری کا کہنا تھا کہ وہ ساری رات وہیں رہا تھا۔ نرسوں کا بھی یہی بیان تھا۔ اور وہی وارڈ میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ پولیس کیپٹن نے ان سب سے سوالات کیے تھے۔

کیپٹن کا خیال تھا کہ یہ قتل کسی نرس نے کیا ہوگا اور وہ اب اس چکر میں تھا کہ آخر کون سی نرس ایسی ہوسکتی ہے جو میخائل سے واقف رہی ہو۔

مجھے یہ ساری باتیں سیلی سے معلوم ہوئی تھیں جو مینٹل وارڈ میں کام کرتی تھی۔ وہ لاکر سے اپنی وردی لینے آئی تھی، ذرا ہی دیر بعد وہ بھاگتی دکھائی دی۔ وہ سیدھی ڈاکٹر اسکاز کے پاس پہنچی اور اپنی یونیفارم اسے دکھاتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر ...... ذرا اسے دیکھو...... یہ کل ہی دھل کر آئی ہے میں نے اسے پہنا بھی نہیں ہے اور اب ذرا آستین پر نگاہ ڈالیں۔"

"بھئی اگر یہ صحیح نہیں دھلی ہے تو لانڈری والوں سے بات کرو۔ میں اس میخائل کے معاملے میں بہت مصروف ہوں۔"

"مگر جناب" نرس نے مصر ہوتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے اس کا تعلق اسی معاملے سے ہو۔" پھر اس نے ڈاکٹر کے سامنے یونیفارم کی آستین پھیلا دی۔ آستین کے نچلے حصے میں سرخ رنگ کے کئی دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

پھر اسکاز نے ڈاکٹر میری مین اور کیپٹن وارن دونوں ہی کو بلا لیا۔ ڈاکٹر میری مین کی طبیعت پھر ناساز ہو رہی تھی کیپٹن وارن کے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ آستین پر لگے دھبوں کو ٹیسٹ کرا لیتا۔ میخائل کے خون کا گروپ "بی" تھا۔ اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ دھبے اگر خون کے ہیں تو یہ خون کس گروپ کا ہے۔

کیپٹن وارن اب سیلی کی جان کو آ گیا تھا۔ تاہم درمیان میں ڈاکٹر میری مین نے مداخلت کی اور اسے اس مریض کے بارے میں بتانے لگا جس کا اصرار تھا کہ جب وہ کسی کا نام تین بار لے لیتا ہے تو وہ آدمی مر جاتا ہے۔

"عجیب احمقانہ خیال ہے۔" کیپٹن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ثبوت درکار ہے۔ مجھے یہ کہانیاں نہیں چاہیے۔"

"آپ نے درست کہا۔" درمیان میں ڈاکٹر اسکاز نے گفتگو چھیڑ دی۔ "یہ کیس ادراکی دھوکے کا ایک کیس ہے۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ اس مریض کو اس معاملے میں نہ رگیدا جائے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔" کیپٹن وارن نے کہا۔ "میرے پاس اس کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔"

"بات دراصل یوں ہے۔" ڈاکٹر میری مین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دوبارہ نامناسب انداز میں کہا۔ "کہ یہ مریض اسی خوف سے کسی کا نام نہیں لیتا...... وہ یہاں داخل بھی اسی سبب سے ہوا ہے۔"

"گویا آپ کا خیال ہے کہ اس مریض نے مرنے والے میخائل کا نام تین بار لیا تھا اور وہ اسی لیے مر گیا ہے؟" کیپٹن نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہیں، نہیں" ڈاکٹر میری مین نے کہا۔ "ویسے یہ ایسا اتفاق ہے کہ اس کی تفتیش ضروری ہے۔"

مجھے پتا نہیں ڈاکٹر اسکاز نے کس طرح معاملے کو ہینڈل کیا تھا۔ شاید کیپٹن کو اس نے اشارہ دیا ہوگا کہ ڈاکٹر موصوف عمر رسیدہ ہو گئے ہیں یا بیمار ہیں۔ بہرحال ہم سب مریض کی سمت چل دیئے تھے۔ وہ اب نیند سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے ہمیں آتے دیکھا تو اس نے جلدی سے اپنا بایاں ہاتھ کمبل کے اندر چھپا لیا۔

کیپٹن وارن کی تیز نظروں سے یہ حرکت چھپی نہ رہ سکی ویسے بھی پولیس والے بے حد پُرشبہ لوگ ہوتے ہیں۔ اس نے لپک کر مریض کی کلائی تھام لی اور اس کی مزاحمت کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے کمبل سے باہر کھینچ لیا۔ ہم سب نے دیکھا کہ اس کی انگشت شہادت کے ناخنوں میں سرخی بھری ہوئی ہے۔

"کیا یہ خون ہے؟" میں نے پوچھا۔

مگر ثابت یہ ہوا کہ یہ سرخی خون کی نہیں بلکہ لپ اسٹک کی تھی۔

"دیکھا آپ نے۔" ڈاکٹر اسکاز نے ناگواری سے کہا۔ "خواہ مخواہ اس بے چارے کو تنگ ہونا پڑا۔"

"اسے ابھی اور تنگ ہونا پڑے گا۔" کیپٹن وارن نے تمسخر سے کہا۔

پھر ڈاکٹر اسکاز کے اعتراض کے باوجود مجھے کیپٹن وارن اور ڈاکٹر میری مین کا حکم ماننا پڑا۔ ہم نے زبردستی اسے نرس سیلی کا کوٹ پہنایا اور پھر مریض کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی لالی پھیر دی گئی۔

سیلی کے یونیفارم میں مریض بالکل کسی عورت ہی کی مانند لگ رہا تھا کیونکہ وہ عام سے جثے اور نازک نقوش والا آدمی تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔ "ہم مان لیتے ہیں کہ اس نے سیلی کا یونیفارم پہن کر دھندلی روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وارڈ تک کانسٹیبل کو دھوکہ دینے کے بعد رسائی حاصل کر لی تھی جہاں میخائل تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر اسے اس حرکت کی ضرورت کیا تھی؟"

کیپٹن وارن نے دوبارہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "اس نے انگلی سے لپ اسٹک کو ٹھیک کیا ہوگا۔ رہی یہ بات کہ اس حرکت کا جواز کیا تھا؟ تو دو باتیں کہی جا سکتی ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ آدمی نفسیاتی مریض ہے۔ دوسری بات ہم یہ بھی فرض کر سکتے ہیں کہ میخائل کے

ساتھیوں میں سے ایک یہ بھی تھا۔ میخائل کے علاوہ دوسرا اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ میخائل بے ہوش تھا۔ میخائل کو خاموش رکھنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ اسے مار دیا جائے...... اور اس کے لیے اسپتال میں داخلہ ضروری تھا...... کوئی بات بھی کہی جائے یہاں فٹ بیٹھتی ہے۔"

ڈاکٹر میری مین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل یہی بات سوچ رہا تھا۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ بالکل غلط۔" مریض نے چیخ کر کہا۔ "میں نے تین بار اس کا نام لیا تھا اور بس وہ مر گیا۔ یہ ایک عذاب ہے میرے ساتھ۔ میں جس کا نام بھی لیتا ہوں، وہ مر جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے یہ بھی آزما لیتے ہیں۔" ڈاکٹر میری مین نے کہا۔ "تم میرا نام لو۔ میرا نام تین بار دہراؤ۔"

مریض اچانک جھجک سا گیا۔ "نہیں......" اس نے گھبرا کر کہا۔ "کئی موتیں مجھے پہلے ہی دہلا رہی ہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔"

"میں کہہ رہا ہوں میرا نام تین بار پکارو۔" ڈاکٹر میری مین نے درشت انداز میں حکم دیا...... "میں کہہ رہا ہوں میرا نام لو۔"

مریض نے بے چارگی سے ڈاکٹر اسکاز کی سمت دیکھا۔

"ٹھیک ہے، کرو جو کچھ کہا جا رہا ہے ویسے ہی کرو۔" ڈاکٹر اسکاز نے نرمی سے کہا۔ "اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف تمہارا وہم ہے اور جلد ہی تم پر سے اس وہم کا سایہ ختم ہو جائے گا۔"

مریض نے مجبور ہو کر حکم کے مطابق عمل کیا اور تین بار ڈاکٹر میری مین کا نام لیا۔ ویسے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور وہ کسی نامعلوم خوف سے کانپ رہا تھا۔

وارن نے جانے سے قبل مریض کے وارڈ پر پہرہ بٹھا دیا اور پھر وہ اس کی انگلیوں کے نشانات کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے چلا گیا۔

جب میں دوسرے دن اسپتال پہنچا تو وارڈ کسی مقبرے کی طرح لگ رہا تھا۔ سِلی رو رہی تھی اور ڈاکٹر اسکاز کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ مریض پورے کمرے میں ٹہلتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ "میں کہہ رہا تھا نا...... کہ مجھے نام لینے پر مت مجبور کرو۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟" میں نے پوچھا۔

"رات ڈاکٹر میری مین کا انتقال ہو گیا۔" ڈاکٹر اسکاز نے مجھے بتایا۔

میں نے وحشت زدہ انداز میں مریض کی سمت دیکھا۔ "کیا اس کی وجہ سے؟"

"اوہ نو۔" ڈاکٹر اسکاز نے جھنجلا کر کہا۔ "تم جانتے ہو ڈاکٹر میری مین دل کے مریض تھے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تکلیف سے فرار کے لیے خود ہی اپنے لیے اس مریض کے واہمے کو سہارا بنایا ہو۔ تمہیں پتا ہے ووڈوازم میں مرنے والا اپنے لیے خود موت کی خواہش کرتا ہے اور جادوگر اسے صرف تحریک دیتا ہے اور بس۔"

کیپٹن وارن جب آیا تو وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا مگر ڈاکٹر میری مین کی موت کی خبر سن کر اس کی خوشی کافور ہو گئی۔ تاہم وہ اس بات سے متفق نہ تھا کہ یہ مریض کی کرامت ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اس نے مریض کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آرنالڈ روچ...... میں تمہیں اقدام قتل کے سلسلے میں گرفتار کرتا ہوں......"

❀ ...... ❀ ...... ❀

مریض جسے کیپٹن نے آرنالڈ روچ کہہ کر پکارا تھا۔ واقعی اس معاملے میں بدنصیب نکلا تھا کہ اس کی انگلیوں کے چند نشانات پولیس کو مل گئے تھے۔ یہاں تک کی بات تو پولیس کے حق میں تھی مگر روچ مسلسل اپنی عجیب و غریب کہانی پر مصر تھا اور اسی بنیاد پر اس کے وکیل نے پاگل پن کی آڑ لے کر کیس لڑنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بار پھر مریض کو ہمارے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ اب بھی کسی شخص کا نام لینے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ جونہی کسی کا نام اس کے سامنے لیا جاتا تھا وہ چیخنے لگتا تھا۔ ذرا سوچیں کتنا مشکل کام ہے یہ کہ مریض کو دیکھ کر بھی اسے اس کے نام سے پکارنے سے احتراز کیا جائے۔

"کیا خیال ہے ڈاکٹر۔" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "یہ شخص واقعی نفسیاتی مریض ہے یا محض سزا سے بچنے کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟"

ڈاکٹر اسکاز نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں یہ آدمی واقعی نفسیاتی مریض ہے۔ ثبوت تو خیر فراہم کرنا مشکل ہے مگر میں یہ بات اس کے رویے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔"

"اور اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے ۔میرا مطلب اس تین بار نام لینے والی بات سے ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں آنے سے پہلے اس نے یہ منصوبہ بنایا ہو۔ ویسے بھی جن لوگوں کا ذکر اس نے کیا ہے وہ سب کے سب مر چکے تھے۔ ہو سکتا ہے میخائل کو اسی نے ختم کر دیا ہو...... مگر معاملہ ڈاکٹر میری مین کا ہے۔ آخر اسے کس خانے میں فٹ کیا جائے؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" ڈاکٹر اسکاز نے کہا۔ "وہ دل کے پرانے مریض تھے۔ مریض کی جانب سے تحریک نے انہیں موت سے دوچار کر دیا تھا۔"

میں نے فرش پر پونچھا لگاتے ہوئے ہاتھ روک لیے۔ "یہ تو ایک اندازے والی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے مریض کا بیان صحیح ہو، ہو سکتا ہے واقعی وہ اگر کسی کا نام تین بار دہرائے تو وہ آدمی مر جائے۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم مصر ہو تو خود آزما کر دیکھ لو۔" ڈاکٹر اسکاز نے طنزاً کہا۔

مارے گھبراہٹ کے میرا ہاتھ بہک گیا اور فرش پر رکھی پانی کی بالٹی لڑھک گئی۔

"میں؟ مگر تم تو ایک سائیکاٹرسٹ ہو ڈاکٹر تم خود کیوں نہیں آزماتے؟"

"میں جانتا ہوں، مجھے کسی ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہونہہ......" اس بار میں نے طنز کیا۔ "یہ رویہ سائنسی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر اسکاز نے بھنا کر کہا۔ "تمہارے لیے میں خود اسے آزماؤں گا۔"

مگر ڈاکٹر اسکاز نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ میں جب بھی اسے یاد دلاتا ہوں وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر معاملے کو ٹرخا دیتا ہے۔

⌘

عذاب چاہت

اسرار احمد

کچھ لوگ آزاد فضائوں میں آوارہ پنچھی بن کر زندگی کے تمام لطیف گوشوں سے آشنا ئی پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ زندگی کے ساغر میں خود غرضی کی مئے پینا چاہتے ہیں۔

پھول اور کانٹے کے ازلی رشتے سے جنم لینے والی محبت کا فسانہ

جب جم اور اس کی بیوی سینڈرا میں علیحدگی ہوگئی تو جم نے اپنے دس سالہ جڑواں بیٹوں کے ساتھ ہمارے برابر والے مکان میں رہائش اختیار کرلی۔ دراصل سینڈرا طلاق کی کارروائی مکمل ہونے سے تین سال پہلے ہی جم اور بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ گھر چھوڑتے وقت اس نے جم کے نام خط میں لکھا تھا کہ وہ جم کے ساتھ چار دیواری کی پابند زندگی نہیں گزار سکتی۔ وہ آزادانہ زندگی کے حسین لمحات سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ اس بندھن کو توڑ کر جارہی ہے۔

جن دنوں جم اور اس کے بچے ہمارے پڑوس میں منتقل ہوئے تھے' میں کسی جز وقتی کام کی تلاش میں تھی۔ جم کو جب میری سعی تلاش معاش کا معلوم ہوا تو اسی نے مجھے کیئر ٹیکر کی ملازمت کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے صبح سویرے ہی گیراج جانا پڑتا ہے۔ اگر تم میرے بچوں کو ناشتا کرا کر اسکول بھیج دیا کرو اور میری واپسی تک ان کا خیال رکھ سکو تو میں تمہیں معقول معاوضے کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں۔''

اسی دن میں نے اپنی والدہ سے جم کی پیش کردہ ملازمت کی بات کی تو انہوں نے کہا۔

''جم اچھا آدمی ہے' وہ اپنے کاروبار کی وجہ سے بچوں کی مناسب نگہداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ تم جم کی یہ پیش کش قبول کرلو اس طرح تم کو گھر سے دور بھی نہیں جانا پڑے گا۔''

اس جز وقتی ملازمت سے میرے معمولات پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ میں بچوں کو اسکول بھیج کر اپنے کالج بہ آسانی جاسکتی تھی اور بچوں کے واپس آنے سے پہلے آسکتی تھی۔ اس طرح شام کو مجھے اپنے بوائے فرینڈ جیری سے ملنے کا وقت بھی مل سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے جم کی پیشکش قبول کرلی۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اس ملازمت سے بہت خوش تھی کیونکہ مالی آسودگی اور گھر سے نزدیکی نے میرے بہت سے مسائل حل کردیئے تھے اور یوں میری اکثر شامیں جیری کے ساتھ گزرنے لگی تھیں جسے میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ وہ تھا ہی اتنا وجیہہ وشکیل کہ جب ہم دونوں کہیں سے گزرتے تو میری ہم عمر لڑکیاں پلٹ پلٹ کراسے دیکھنے پر مجبور ہوجاتیں۔ تب جیری کی قربت اور محبت کے احساس سے میرا سر فخر سے بلند ہوجاتا اور مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا۔

ابھی اس ملازمت کو تین ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک شام جیری نے مجھ سے کہا۔ ''گھے بندھے روزمرہ کے معمولات سے بندھی اس زندگی سے میں بری طرح اکتا گیا ہوں۔''

''کیا کہہ رہے ہو جیری؟'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''گریجویشن کرتے ہی تمہیں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے تم ایک پیار کرنے والی لڑکی کے محبوب ہو' پھر اور کیا چاہیے تمہیں؟''

''خاک اچھی ملازمت ملی ہے مجھے؟ اپنے تابناک مستقبل کے خوابوں کی سنہری تعبیر حاصل کرنے کے لیے مجھے برسوں انتظار کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ تب بھی میرے سارے خواب پورے نہ ہوسکیں۔''

''غربت ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں جیری۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''ہم غربت کی آغوش میں پروان چڑھے ہیں۔ ہم دونوں جوان ہیں۔ میں گریجویشن کرکے تمہارے ساتھ محنت کروں گی۔ اس طرح یقیناً ہم ایک اچھی اور آسودہ حال زندگی گزارنے کے قابل ہوجائیں گے۔''

''نہیں جولی۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''میں اب تک پیسے کو ترستا رہا ہوں۔ مفلسی کے عذاب نے میری روح تک کو کچل دیا ہے۔ زندگی کی پرتعیش ساعتوں پر مشتمل راحتوں پر میرا بھی حق ہے۔ اب میں ان سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔''

مالی دشواریوں نے اسے کتنا تلخ اور چڑچڑا بنادیا ہے' میں نے سوچا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس طرح میں اسے ذہنی سکون دے کر اس کی طبیعت پر طاری چڑچڑے پن کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی لیکن میری قربت سے وہ بہک اٹھا اور اس شام وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس پر پچھتاوا نہیں ہوا کیونکہ جلد ہی ہماری شادی ہونے والی تھی۔

جب میں جیری کے فلیٹ سے رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا۔ ''ذرا رک جاؤ جولی۔'' میں رک گئی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''میں تم سے معذرت خواہ ہوں جولی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اب پچھتانے سے کیا حاصل؟'' میں نے کہا۔ ''جو ہوا بھول جاؤ اسے۔''

''لیکن...... لیکن اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ کل میرے باس کی بیٹی گلڈا نے مجھے لنچ پر مدعو کیا تھا۔ اس کے باپ کا ملازم ہونے کے باعث میں انکار نہ کرسکا۔ آج میرے باس نے کہا ہے کہ کل میں اس کے گھر ڈنر پر آؤں۔''

''تو کیا ہوا؟'' میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ تم مالک کی دعوت نہیں ٹھکرا سکتے۔ اگر گلڈا وہاں موجود ہو تو اس کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنا اور ہاں' اس میں حالات بدلنے کی کیا بات ہے؟''

''تم اب تک نہیں سمجھیں' جولی کہ باپ بیٹی مجھ پر کیوں مہربان ہیں۔''

''اوہ! تو یہ بات ہے' مگر تم انہیں بتاسکتے ہو کہ میری اور تمہاری منگنی ہوچکی ہے اور ہم بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔''

''نہیں جولی۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ ''میری سوچوں کا دھارا بدل چکا ہے۔ میں مفلسی کی اس سسکتی زندگی سے تمام رشتے منقطع کرلینا چاہتا ہوں۔ میں ہر قیمت پر آگے بڑھنا اور زندگی کے ہر گزرتے لمحے سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ ان سب خواہشوں کے حصول کے لیے گلڈا میرے لیے سیڑھی کا کام دے گی۔''

جیری کے اس ظالمانہ انکشاف پر میں چکرا کر رہ گئی۔ اب مجھے اپنے لٹ جانے کا شدید پچھتاوا ہونے لگا۔ رگوں میں دوڑتی پیار کے احساس کی سرشاری دم توڑنے لگی لیکن میں جیری سے کچھ بھی

نہ کہہ سکی اور آنکھوں کے گوشوں میں مچلتے آنسو دل میں اتارتے ہوئے وہاں سے اپنے گھر چلی آئی۔

❀ ❖ ❀

دوسری شام میں اپنے آپ کو اس حد تک سنبھال چکی تھی کہ آنسو بہائے بغیر اپنی ماں کو جیری کے فیصلے سے آگاہ کر سکوں۔ رات کے کھانے پر جب میں نے انہیں بتایا تو وہ بولیں۔ ''میں ہمیشہ سے جیری کو کمزور کردار کا نوجوان سمجھتی رہی ہوں۔ وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ بہت سی لڑکیاں اس کی چاہ میں اپنے آپ کو بے وقوف بنا سکتی ہیں۔''

میری ماں نے مجھے باپ بن کر پروان چڑھایا تھا۔ اس لیے میں ان کی ہر بات پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ جیری کے بارے میں ان کی یہ رائے سن کر مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ گلڈا بھی اس کی چاہ میں احمق بن رہی تھی۔ مجھے یقین سا تھا کہ جیری ایک نہ ایک روز میری طرف لوٹ آئے گا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ میں نے جیری کو فون تک نہ کیا۔ بس کالج جاتی اور جم کے گھر پر جزوقتی ملازمت کرتی رہی۔ تب اچانک ایک روز مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ میری کوکھ میں جیری کی نشانی پل رہی ہے۔ کنواری ماں کا خوف اور گناہ کے احساس کے خیال سے ایک لمحے کے لیے تو میں بری طرح پریشان ہوگئی مگر دوسرے لمحے خیال آیا کہ یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ جب میں جیری کو بتاؤں گی کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو وہ گلڈا کی بجائے مجھ سے شادی کر لے گا۔ کیونکہ وہ دل کا اچھا آدمی تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں ٹیلی فون کی طرف لپکی تا کہ جیری کو یہ خبر سنا سکوں۔

''ہیلو۔'' جیری کی شستہ آواز میرے کانوں میں رس گھولتی اتر گئی۔

''جولی بول رہی ہوں، جیری۔'' میں نے کہا۔

''اوہ! تو تم نے مقامی اخبار میں میری اور گلڈا کی شادی کی خبر پڑھ لی۔ میں شادی سے پہلے تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا جولی لیکن میرے اندر تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی میں تم سے معذرت خواہ ہوں جولی۔''

''مگر میرے اندر تمہیں شادی کی مبارک باد دینے کی ہمت ہے، جیری۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ حالانکہ میں اس سے یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ تم دولت کے بھوکے تھے اور دولت تمہیں مل گئی ہے۔

❀ ❖ ❀

میں جم اور اس کے بچوں کے لیے شام کا کھانا پکا رہی تھی کہ مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ میں سیدھی باتھ روم کی طرف بھاگی اور گھر میں داخل ہوتے جم کو ''ہیلو'' تک نہ کہہ سکی۔ چند منٹ بعد جب میں باتھ روم سے باہر آئی تو جم نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم امید سے ہو؟''

''کس بات نے تمہیں یہ سوال کرنے پر اکسایا ہے، جم؟''

''میں دو بچوں کا باپ ہوں جولی۔ وہ علامات جانتا اور سمجھتا ہوں جن سے پتا چلتا ہے کہ عورت مامتا کے مقدس جذبے سے سرفراز ہونے والی ہے لیکن...... لیکن تم کیا کرو گی؟ میرا مطلب ہے ضائع کر دو گی یا......؟''

''نہیں، میں اپنے بچے کی قاتلہ نہیں بن سکتی۔ اگر کوئی قصور ہے تو میرا ہے، بچے کا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میری ماں میرا ساتھ دے گی اور...... اور......'' مگر میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

جم چند لمحے سوچتا رہا، پھر نرم لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ تاہم اگر تمہاری شادی ہو جائے تو تمہارے بچے کو شناخت مل جائے گی۔ وہ باپ کی شفقت کو نہیں ترسے گا۔ وہ دنیا کی طعنہ زنی اور گناہ کی زندہ پوٹ کہلانے سے بچ جائے گا...... کیا تم مجھ سے شادی کر سکتی ہو؟''

مجھے جم کے یہ الفاظ اپنی روح پر کوڑے کی طرح لگے لیکن وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں بے اختیار رو پڑی۔ میری ماں میرے بچے کو برداشت تو کر لیتی لیکن یہ صدمہ بڑھاپے میں اس کی صحت تباہ کر دیتا۔ میں نے سوچا، اگر میں جم سے شادی کر لوں تو زندگی ہم سب کے لیے آسان ہو جائے گی۔ جم کو کسی ایسی عورت کی ضرورت تھی جو اس کے گھر اور بچوں کی مکمل طور پر دیکھ بھال کر سکے۔ مجھے بھی اب ایک سہارے کی ضرورت تھی لیکن یہ شادی میرے لیے ساری زندگی کا معاہدہ نہیں بن سکتی تھی چنانچہ میں نے جم سے کہا۔

''مگر یہ شادی ہمارے لیے کوئی مستقل معاہدہ نہیں ہوگی جم۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت تو ہیں لیکن ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دل میں سوچا، ممکن ہے کبھی جیری کے سر سے گلڈا اور دولت کا بھوت اتر جائے اور وہ میری طرف لوٹ آئے۔

''ٹھیک ہے جولی۔'' جم بولا۔ ''اگر یہ شرط ہے تو مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

میری ماں نے یہ باتیں بڑے اطمینان سے سنیں اور بولی۔ ''جم شریف آدمی ہے مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ تم جیری کو بھول جاؤ گی؟''

''میں اسے بھول جاؤں گی نہیں، بلکہ بھول چکی ممّا۔''

❀ ❖ ❀

میری اور جم کی شادی بڑی خاموشی...... اور سادگی سے ہوگئی لیکن اس سے میرے معمولات میں سوائے اس کے کوئی فرق نہ آیا کہ میں اپنے گھر سے جم کے گھر منتقل ہوگئی مگر یہاں بھی جم کی خواب گاہ میں نہیں بلکہ الگ کمرے میں تنہا سوتی تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی جم نے گیسٹ روم مجھے دے دیا تھا اور کہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم تنہا سونا پسند کرو گی۔'' اور حقیقت بھی یہی تھی۔ تاہم مجھے جم کے اس رویے پر حیرت بھی ہوئی تھی اور اطمینان بھی محسوس ہوا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں جم کے بیٹوں روبن اور جانسن سے پیار کرنے لگی کہ اب میں اس گھر میں ملازمہ نہیں بلکہ ان کی دوسری ماں بھی تھی بچے بھی مجھ سے بہت مانوس ہوگئے۔ ایک بار روبن نے مجھ سے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے ڈیڈی سے شادی کر لی اور ہماری ممی بن گئیں۔'' مگر یہ کہہ کر وہ کمرے سے بھاگ گیا۔ دراصل دونوں بچے بھی اپنے دل کا درد چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم سب کو ان ہستیوں سے دکھ اور درد ملے تھے جنہیں ہم نے چاہا تھا۔ اپنا سمجھا تھا اور پیار کیا تھا مگر وہ ہمارے نہ ہوئے۔ سینڈرا نے کہا تھا کہ وہ خود مختار زندگی گزارے گی لیکن وہ کسی مرد کے ساتھ رہ رہی تھی۔

ایک روز میں گھر کی صفائی کر رہی تھی کہ مجھے جانسن کی دراز میں کپڑوں کے نیچے ایک تصویر رکھی دکھائی دی۔ میں نے وہ تصویر اٹھالی۔ یہ سینڈرا کا فوٹوگراف تھا جو بار بار دیکھنے سے خستہ حال ہوگیا تھا۔ مجھے جانسن پر بڑا رحم آیا جو بار بار ماں کی

تصویر دیکھ کر اپنے آپ کو ایذا پہنچا رہا تھا پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی کیونکہ میں خود بھی اس حرکت کی مرتکب ہو رہی تھی۔ میں نے جیری اور گلڈا کی شادی والی تصویر اخبار سے کاٹ کر رکھ لی تھی اور دن میں ایک بار اسے ضرور دیکھتی تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ اس طرح میں خود رحمی کا شکار ہو رہی ہوں۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے جیری کی تصویر نکالی اور اسے پرزے پرزے کرنے لگی۔ عین اسی وقت جانسن وہاں آ گیا۔ اس نے کہا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''میں اس آدمی کی تصویر پھاڑ رہی ہوں جس سے کبھی مجھے بے حد محبت تھی' جو کبھی میرے دل کی گہرائیوں میں رہا کرتا تھا لیکن اب جب میں اسے دیکھتی تھی تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔'' میں نے تصویر کے ٹکڑے ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

دوسرے روز میں نے جانسن کی دراز سے سینڈرا کی تصویر غائب پائی۔ رات کو جب بچے سونے چلے گئے تو میں نے جم کو یہ بات بتا دی۔

''جانسن کی یہ حرکت اس کے لیے ضرر رساں تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم بچوں کا اتنا خیال رکھتی ہو اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے میرے ساتھ شادی کی۔'' جم کے اس لہجے میں تشکر اور حلاوت کی آمیزش تھی۔

''میں آج تم سے اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے بھی اب اس شادی پر پچھتاوا نہیں ہے۔'' جم مسکرایا۔

''ہماری شادی کو ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اب ہمیں ایک بیاہتا جوڑے کی طرح رہنا چاہیے۔''

مجھے جم پر رحم آ گیا۔ مما ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ وہ بہت شریف آدمی ہے۔ اس نے اس دوران میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے میری ذرا سی بھی دل آزاری ہوتی۔ میں اس کی بات پر مسکرا دی۔ اس نے کہا۔

''تو گویا آج سے تم مہمان نہیں ہو اس لیے گیسٹ روم خالی کر دو گی۔''

میں نے اسی رات گیسٹ روم خالی کر دیا اور سوچا کہ اب ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

❁ ...... ❖ ...... ❁

وقت گزرتا رہا۔ خزاں کا موسم سردیوں میں ڈھل گیا۔ پھر کرسمس آئی تو میں نے کالج جانا چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو گرہستن عورت سمجھنے لگی۔

اپریل کی ایک صبح جب جم اپنے کام پر اور بچے اسکول جا چکے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک اسمارٹ اور خوب صورت عورت کو سامنے کھڑا پایا۔ میں فوراً اسے پہچان گئی۔ وہ سینڈرا تھی۔ وہ مسکراتے ہو بولی۔

''صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیے۔'' میں کوئی جواب دیے بغیر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کیا تم مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' میں نے سوال کیا مگر وہ میرے سوال کا جواب دیئے بغیر اندر آ گئی۔ پھر میری طرف پلٹی اور مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد بولی۔

''سب سے پہلے تو اس لیے کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جو کچھ ہوا ہے' اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں مجھے یقین ہے کہ جم تمہیں بچے کے اخراجات

دیتا رہے گا۔'' سینڈرا کی اس بات سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے کہا

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''اگر تم واقعی میری آمد کا مقصد نہیں سمجھیں تو سنو' میں واپس آ گئی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جن چیزوں کی تلاش میں' میں نے گھر چھوڑا تھا' وہ تو اسی گھر میں موجود تھیں۔ اچھا شوہر' پیارے بچے اور پرسکون زندگی کی ساری آسائشیں۔''

میں چیخ چیخ کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس نے واپسی میں بہت دیر کر دی ہے۔ اب جم مجھ سے محبت کرتا ہے زندگی کی سنہری شاہراہ پر دونوں بچے اور میں اس کے ہم سفر ہیں وہ اسے قبول نہیں کرے گا مگر میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی کہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ سینڈرا بہت حسین تھی۔ مرد اس پر اس طرح لٹو ہو جاتے تھے جیسے عورتیں جیری پر۔ اس کے شب رنگ بال لمبے تھے اور سراپا اتنا دل آویز کہ وہ سانچے میں ڈھلی لگتی تھی۔

''یہ اچھی بات نہیں سینڈرا۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ تم بہت خوب صورت ہو اسی لیے جب چاہو واپس آ سکتی ہو جیسی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب میں' جم اور بچے ایک خاندان بن چکے ہیں اور تمہیں اس خاندان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہیے۔''

سینڈرا نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں' جم اور بچے ایک خاندان ہیں۔ تم نے تو خواہ مخواہ میری جگہ لینے کی کوشش کی ہے جو کامیاب ثابت نہیں ہو سکی۔''

اس کا لہجہ اتنا پراعتماد تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سچ کہہ رہی ہو اور میں اس کی جگہ لینے میں ناکام رہی ہوں۔ پھر وہ بولی۔ ''بہرصورت میں یہیں رہوں گی اور ان کا پسندیدہ کھانا بناؤں گی۔ آج ہمارے دوبارہ ملاپ کا جشن منایا جائے گا لہٰذا تم اپنے لیے شام کا کوئی پروگرام بنا لو اور ان کے آنے سے پہلے چلی جانا۔''

میں سینڈرا کی باتوں سے بری طرح دل برداشتہ ہو گئی۔ میں نے سوچا' جم اور بچے اسے دیکھ کر اور دوبارہ پا کر اتنے ہی خوش ہوں گے جتنا جیری کی واپسی پر میں ہوتی لیکن پھر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔ ''ممکن ہے بچوں کو میری ضرورت پڑے اس لیے میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

سینڈرا نے اپنے کندھے اچکائے۔ ''میں ذرا شاپنگ کو جا رہی ہوں۔ ڈنر میں خود تیار کروں گی۔''

سینڈرا چلی گئی تو میں نے تقدیر کے بے رحم ہاتھوں میں اپنے آپ کو بے حد مجبور اور بے بس محسوس کیا۔ میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اتنا تو اس وقت بھی نہیں روئی تھی جب جیری نے مجھے اور میرے پیار کو ڈس کر زندگی کی بے درد ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑا تھا۔ تب اچانک ہی مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مجھے جیری سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی اس سے محبت کی تھی۔ دراصل مجھے جم سے پیار ہے۔ جیری کی وجاہت نے مجھے مسحور کر دیا تھا اور میں جوانی کے جذباتی تلاطم کو محبت کا نام دے بیٹھی تھی۔ تب مجھے اپنے آپ ہی یہ آگہی بھی حاصل ہوئی کہ سینڈرا بڑے کمزور کردار کی مالک ہے۔ ایک آوارہ پنچھی ہے۔ وہ خود غرض ہے ورنہ ایک عورت اپنے بچوں کو کیسے چھوڑ سکتی ہے' گھر چھوڑنے کے بعد اس نے کبھی اپنے بچوں سے ملنے یا ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ممتا کا درد اس کے دل میں نہ جاگا تھا اور اب اسے یہ توقع تھی کہ جم اور

بچوں کا مرغوب کھانا ان کے وہ سارے غم بھلا دے گا جو اس کے گھر چھوڑنے پر ان کا مقدر بن گئے تھے۔

میری یہ سوچ درست تھی اس لیے میں سینڈرا کو نیچا دکھانا چاہتی تھی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن اتنا میری سمجھ میں ضرور آ گیا کہ سب سے پہلے مجھے اسمارٹ دکھائی دینا چاہیے اور یوں ظاہر کرنا چاہیے کہ سینڈرا کی واپسی سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مجھے جم اور بچوں کے پیار پر پورا بھروسا ہے۔ یہ سوچ کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے بالوں میں کافی دیر تک برش کیا پھر آنکھوں اور چہرے کا میک اپ کیا اور اپنا سب سے بہترین لباس پہن کر جم کی پسندیدہ خوشبو فراخ دلی سے چھڑکی۔ اب جب میں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو خود حیران رہ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دوسری عورت آئینے کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ سینڈرا کو دیکھ کر میرے اندر جو احساس کمتری ابھرا تھا' وہ جاتا رہا۔

سینڈرا واپس آئی تو میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور اپنے ہونے والے بچے کے لیے سوئٹر بنتی رہی۔ سینڈرا چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر کچن میں چلی گئی اور ریڈیو پر بجنے والے نغموں کے ساتھ ہم آواز ہو کر کھانا بناتی رہی۔

کچھ دیر بعد بچے گھر میں داخل ہوئے تو سینڈرا کچن سے باہر آ گئی اور بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میرے بچو! میں واپس آ گئی ہوں۔''

روبن اور جانسن اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے سوچ رہے ہوں کہ ماں کی واپسی پر ہنسیں یا رو پڑیں۔ مجھے ان پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی چاہا کہ میں انہیں اپنی بانہوں میں بھر لوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کہ کہیں بچے شرمندگی محسوس نہ کریں۔

''ٹھیک ہے بچو!'' میں نے ان سے کہا۔ ''تمہاری ماں تم سے پیار کرتی ہے اور تمہیں دیکھنا' تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

روبن میری طرف پلٹا۔ ''اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟''

نہیں نہیں' جب تک تم مجھے اپنے پاس رکھنا چاہو گے میں یہیں رہوں گی۔''

میری اس بات پر سینڈرا کی جبین شکن آلود ہو گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہنے والی تھی لیکن اب وہ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی کہ مبادا بچے برا منائیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے بچوں سے کہا۔

''آؤ بچو! میرے پاس بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ اسکول میں کیا کرتے رہتے ہو۔''

بچے اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں سوئٹر بننے میں مگن رہی۔ سینڈرا بار بار میری طرف دیکھتی اور کھول کر رہ جاتی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے دھکے دے کر وہاں سے نکال دے۔ اپنی جگہ میں یہ چاہتی تھی کہ جونہی جم گھر پہنچے گا میں مما کے ہاں چلی جاؤں گی۔ چنانچہ جب باہر سے جم کی کار کی آواز سنائی دی تو میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بچوں سے بولی۔

''اچھا تو بچو! میں کل صبح آ کر تمہیں اسکول جانے کے لیے تیار کر دوں گی۔''

''تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔'' سینڈرا نے کہا۔ ''میں خود انہیں تیار کر دوں گی۔''

''نہیں مما!'' جان بول اٹھا۔ ''جولی ہمیں تیار کرے گی۔''

سینڈرا نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانے ہی والی تھی کہ جم اندر آ گیا۔ اس نے سینڈرا کی طرف دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ابھری جس کی مجھے توقع تھی۔

''میں واپس آ گئی ہوں جم۔'' سینڈرا نے کہا۔

''اگر تم بچوں سے ملتے رہنا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں حالانکہ تم نے کبھی اس سلسلے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔''

''تم سمجھے نہیں جم۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے اور بچوں کے پاس مستقل طور پر لوٹ آئی ہوں۔ گھر چھوڑنا میری غلطی تھی۔ مجھے جو کچھ درکار تھا وہ موجود تھا مگر میں سمجھ نہیں پائی تھی۔ مجھے بچوں کی اور تمہاری محبت کھینچ لائی ہے۔''

جم سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''میں مما کے ہاں جا رہی ہوں۔ سینڈرا نے تمہارے اور بچوں کے لیے بڑی محبت سے ڈنر تیار کیا ہے۔''

''نہیں جولی! تم نہیں جاؤ گی۔'' جم بولا۔ ''یہ تمہارا گھر ہے' تم میری بیوی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اگر تم ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوئیں تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ اگر سینڈرا تمہاری شمولیت نہیں چاہتی تو ہم دونوں کسی ریستوران میں کھا لیں گے۔ یہ بے شک اپنے بچوں کے ساتھ کھا لے۔''

سینڈرا کے لبوں پر کھیلنے والا دلآویز تبسم یکسر غائب ہو گیا۔ وہ غصے سے بولی۔ ''میں تمہارے بچوں کی آیا نہیں جم۔ میں احمق تھی جو یہاں چلی آئی۔ تم نے نہ پہلے میری قدر کی نہ اب کی ہے۔ میں خود کسی عمدہ ریستوران میں کھا لوں گی۔ مجھے کھلانے والے بہت ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی' اور تیزی سے باہر چلی گئی۔ بچے ہکا بکا سے اسے دیکھتے رہے۔

''تمہاری ممی کو کوئی اہم اپوائنٹمنٹ یاد آ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' جانسن بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ممی ہم سے ویسا پیار نہیں کرتی جیسا تم اور ڈیڈی کرتے ہیں۔''

کچھ دنوں بعد ہمیں پتا چلا کہ سینڈرا جس آدمی کے ساتھ رہتی تھی' وہ سینڈرا کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور سینڈرا یہ سوچ کر واپس آئی تھی کہ جم اسے سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ جم نے بتایا کہ سینڈرا کی آمد اس اعتبار سے بہت اہم ثابت ہوئی ہے کہ اسے یہ معلوم ہو گیا' اب اسے سینڈرا سے محبت نہیں رہی اور وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ جم کا یہ اعتراف سن کر میرا دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔

اب روبن اور جانسن کو یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کی ماں ان سے ملنے نہیں آئی تھی اور میں اور جم ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ جب جینی پیدا ہوئی تو وہ اپنی ننھی بہن کو پا کر بہت خوش ہوئے۔

جہاں تک میرا اور جم کا معاملہ ہے' ہماری محبت دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔ ہماری شادی پہلے ہوئی اور چاہت نے بعد میں جنم لیا۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت کے دامن میں ہمارے لیے ڈھیروں خوشیاں ہوں گی۔

قسط نمبر 14

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

میں اور کنیز دم سادھے عجیب سی کنڈیشن میں تھے۔ کنیز نیچے گری ہوئی تھی اور میں جھک کر اسے اٹھا رہا تھا' پٹھان چوکیدار تو پہلے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی ٹارچ روشن کرکے گیٹ کے اوپر لائٹ ڈال کر اندر دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا' ساتھ ہی ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہا تھا پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ گیٹ پر اوپر چڑھنے کی کوشش کرر ہا تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی کہ پٹھان چوکیدار گیٹ کے اوپر چڑھ کر اندر ٹارچ کی روشنی ڈال کر کسی متوقع چور کو تلاش کرے گا یا پھر اپنے احمق پنے میں اس خالی پلاٹ کے اندر کود جائے گا۔ دونوں ہی صورتوں میں ہمارے لیے خطرہ تھا' اگر چوکیدار نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ شور مچا مچا کے سارے لوگوں کو جگادے گا اور ہم احمق چوروں کی طرح پھنس جائیں گے۔

اس سے پہلے کہ چوکیدار کی نگاہ ہمارے اوپر پڑے اور وہ شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کرے مجھے اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا' میں فوراً سیدھا ہوگیا' میرا دماغ تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا' میں سیدھا ہوا اور گیٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا ہے۔

چوکیدار کی گردن جیسے ہی گیٹ کے اوپر آئی' میں الرٹ ہوگیا' وہ آدھے دھڑ کے ساتھ گیٹ کے اوپر تھا' روشن کی ہوئی ٹارچ اس نے اپنے دانتوں میں دبائی ہوئی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے گیٹ کو پکڑا ہوا تھا' بس اب کچھ ہی لمحوں میں وہ گیٹ پر جم کر کھڑا ہونے والا تھا' اور ہاتھ سے ٹارچ کو تھام کر خالی پلاٹ میں چاروں جانب اس کی روشنی ڈال کر ہمیں باآسانی تلاش کرسکتا تھا۔

میں نے نہایت سرعت کے ساتھ اچھل کر اس کی کمر کے گرد دونوں ہاتھ ڈالے اور اسے اندر کھینچ لیا۔

''اوئے خانہ خراب کا بچہ...... اوئے...... او...... آغوں......''

پٹھان چوکیدار اس اچانک حملے سے بری طرح گھبرا گیا اور اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا' میں نے تیزی سے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کرکے اس کی پشت پر جکڑ لیے اور اپنا گھٹنا اس کی گردن پر رکھ دیا۔

اسی اثناء میں کنیز بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے پٹھان کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے اور میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر اس کی کنپٹیوں پر اپنی انگلیوں کا مخصوص دباؤ ڈالا۔ چوکیدار لمحہ بھر میں انٹا غفیل ہوگیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ باریک ڈوری سے باندھے اور اس کے منہ میں ساتھ لایا ہوا کپڑا پھاڑ کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

''ویسے بھی یہ اب دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا' اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' چوکیدار سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کنیز سے کہا۔

''واہ شمروز تم نے کمال ہی کردیا' تم بہت ہوشیار ہو۔'' کنیز نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

''یار تعریفیں بعد میں کرلینا شکر کرو بال بال بچ گئے۔ اگر یہ ہمیں دیکھ لیتا تو چور سمجھ کر ہماری گردنیں دبا لیتا۔'' میں نے کہا اور عرفان رسول کے بنگلے کی باؤنڈری وال کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ایسا کرتا ہوں کہ پہلے تمہیں دیوار پر چڑھنے میں مدد دیتا ہوں پھر میں تو آ ہی جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو کنیز تیار ہوگئی' میں نے کمر سے پکڑ کر اسے اچھالا تو اس نے دیوار کے سرے کو مضبوطی سے تھام لیا' پھر میں نے اس کے دونوں پاؤں اپنے کندھوں پر رکھے' اس طرح وہ باآسانی دیوار پر چڑھ گئی اور سرعت اندر کود گئی۔ اس کے کودنے سے بہت معمولی سی دھمک سنائی دی' لیکن وہ آواز ایسی نہیں تھی کہ کسی کو اپنی جانب متوجہ کرسکتی' پھر میں نے اچھل کر اپنے دونوں ہاتھ دیوار کے سرے پر جمائے اور دو دوسری جمپ میں میں دیوار کے اوپر تھا' پھر میں بھی اندر کود گیا۔

ہم بنگلے کی سائڈ گیلری میں تھے' بنگلوں میں تین اطراف سے تین سے چار فٹ کی گیلری بنی ہوئی ہے تا کہ کھڑکیوں میں سے ہوا اندر آنے کا راستہ رہے' میں نے کنیز کو وہیں رکے رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں گیلری میں آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ جلد ہی میں سرے پر پہنچ گیا میں نے گردن نکال کر باہر کا جائزہ لیا' باہر بالکل سناٹا پھیلا ہوا تھا' میں مزید آگے بڑھا اور چلتا ہوا بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔

یہاں ایک عدد گاڑی کھڑی تھی۔ اور سامنے چھوٹے سے لان میں چارپائی بچھائے کوئی سو رہا تھا' میں سمجھ گیا کہ یہ وہی شخص ہے' وہ ملازم جس کو بے وقوف بنا کر کنیز ساری معلومات لے کر آئی تھی۔

میں تیزی سے واپس پلٹا اور کنیز کو بتایا' کنیز نے میرے خیال سے اتفاق کیا کہ یہ وہی شخص ہوسکتا ہے وہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ رات کو گیٹ پر ہوتا ہے۔

''پھر کیا کرنا چاہیے' کیونکہ میں دیکھ آیا ہوں کہ اندر کمروں کی جانب جانے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے' ایک بڑا دروازہ ہے جو یقیناً اندر سے بند ہوگا۔'' میں نے کنیز سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس شخص کو قابو کرنا ہوگا' اور اس کی مدد سے کسی بھی طرح یہ دروازہ کھلوانا ہوگا۔ یہی طریقہ ہے' اس کے علاوہ تمہارے ذہن میں اگر کچھ اور آرہا ہو تو بتاؤ۔'' کنیز نے سرگوشی میں کہا۔

''نہیں! تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے' میں ابھی اس کو قابو میں کرتا ہوں۔'' میں نے کنیز کو وہیں دروازے کے پاس رکنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں اس ملازم کی جانب بڑھا جو بے خبر پڑا سو رہا تھا۔

میں نے اپنا پستول ہاتھ میں لیا اور اس کے قریب جاکر پستول اس کی پیشانی سے ٹکا کر دو دفعہ بجائی۔

پیشانی پر چوٹ پڑنے سے وہ جاگ گیا' اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر اسے احساس ہوگیا کہ پستول اس کی پیشانی پر لگی ہے تو اس کی آنکھیں

مارے خوف کے پھٹ گئیں اور منہ کھل گیا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دانتوں کو پیستے ہوئے تیز سرگوشی میں کہا۔

"اگر منہ سے ذرا بھی آواز نکالی تو گولی تیرے بھیجے میں اتر کر سوراخ کر دے گی۔"

وہ گھگھیا کر میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑنے لگا۔ "خاموش......!" میں نے آنکھیں نکال کر غرائے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔

"کک...... کون...... کون ہو تم...... اور...... کک...... کیا...... کیا چاہتے...... ہو......!" اس نے خوفزدہ لہجے میں بمشکل کہا۔

"ہمیں تیرے صاحب سے ملنا ہے دروازہ اندر سے بند ہے۔ یہ بتا تو کسی طرح یہ دروازہ کھلوا سکتا ہے۔" میں نے دبنگ لہجے میں سرگوشی کی۔

"تت...... تم...... ڈاکو ہو......؟" اس نے بجائے جواب دینے کے سوال کیا۔

"اب اگر تو نے کوئی سوال کیا تو میرا ہاتھ نہیں رکے گا۔ مرنا چاہتا ہے سیدھی طرح میرے سوال کا جواب دے گا۔"

"مم...... میں...... کیسے...... میں کیسے کھلوا سکتا ہوں...... اتنی رات...... ہو...... ہو گئی ہے...... صاحب...... سو...... سو رہے ہوں گے۔" اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں احمق انسان...... کہ وہ سو رہے ہوں گے۔ یہ بتا کہ کبھی اس طرح ہوا ہے کہ اچانک رات میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہو اور تو نے اسے جگایا ہو۔" میں نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر گڑا کر کہا تو مارے خوف کے اس نے اپنا بستر ہی گیلا کر دیا' میرے نتھنوں نے اس گندی اسمیل کو محسوس کر کے غصے میں اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔

"نن...... نہیں......! ہاں...... ہاں...... ایک بار ایسا ہوا تھا۔" اس نے پہلے انکار پھر خوف سے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ...... وہ صاحب کا ادارہ ہے ناں 'مسکن' وہاں سے ایک آدمی آیا تھا...... ایک لڑکی وہاں سے بھاگ گئی تھی' تب میں نے صاحب کو جگایا تھا۔"

"کس طرح؟ کیا طریقہ استعمال کیا تھا؟" میں غرایا۔

"موبائل پر...... میں نے موبائل پر فون کر کے صاحب کو جگایا تھا۔" اس نے کہا۔

یہ سنتے ہی میں نے اس کی پیشانی سے پستول ہٹا لیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا' میں نے پستول کا رخ اس کی جانب کیا ہوا تھا اس سے کہا تم ایک بار پھر اپنے صاحب کو فون کرو اور اسے وہی بات بتاؤ کہ ایک لڑکی نے "مسکن" میں خودکشی کر لی ہے۔ اس لیے ایک بندہ انہیں لینے کے لیے آیا ہے لیکن پہلے اپنے حواس درست کرو۔ اگر تم نے ٹھیک اسی طرح سے کہا جیسا میں کہہ رہا ہوں تو میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ ورنہ دوسری صورت میں' میرے پستول کی صرف ایک گولی تمہارا کام تمام کر دے گی......!" میں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور تکیے کے نیچے سے موبائل نکال کر نمبر ملانے لگا۔

"رکو......!" میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ "اگر تم نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی اور کسی اور کو فون ملایا تو سمجھ...... تمہارا کام تو تمام ہو گیا۔"

"نہیں نہیں میں ایسا کچھ نہیں کروں گا......" نمبر ملا کر کال کا بٹن پش کرنے سے پہلے اس نے میری جانب موبائل بڑھایا اور بولا۔ "آپ خود دیکھ لیں کہ یہ نمبر صاحب ہی کا ہے۔"

میں نے ایک نگاہ نمبر پر ڈالی اور پہچان لیا وہ نمبر عرفان رسول ہی کا تھا۔ "یہ بتاؤ عرفان رسول کا کمرہ اوپر والی منزل پر ہے یا نیچے ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اوپر ہے جی۔" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بات کرو۔ لیکن کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے ایک بار پھر اسے تنبیہ کی تو وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔

میں نے اوپر نگاہ ڈالی سامنے ہی مجھے کھڑکی دکھائی دی' ہو سکتا ہے کہ عرفان رسول کھڑکی سے جھانک کر اپنے ملازم کے بیان کی تصدیق کرے کہ کون ہے' تو میں اس طرح سے پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا کہ اس کی نگاہ مجھ پر اس طرح سے پڑے کہ اسے نہ تو میری شکل دکھائی دے اور نہ ہی پستول۔

اس نے نمبر ملایا تو فوراً ہی عرفان رسول نے فون ریسیو کر لیا۔ میں یہ دیکھ کر بری طرح چونک گیا' سوال یہ میرے ذہن میں پیدا ہوا' کیا عرفان رسول جاگ رہا تھا جو اس نے پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا۔ اگر وہ سو رہا تھا تو فون کی کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد اسے اٹھانا چاہیے تھا۔ بہرحال میں پوری طرح الرٹ ہو کر اس کی بات سننے لگا' رشید نے دوسری جانب سے فون ریسیو ہوتے ہی کہا۔

"جناب مسکن سے ایک بندہ آیا ہے اور وہ بتا رہا ہے کہ وہاں کسی لڑکی نے خودکشی کر لی ہے' وہ آپ کو لینے کے لیے آیا ہے......!"

دوسری جانب سے شاید اس نے آنے والے کا نام پوچھا تھا تو اس نے جواب دیا۔

"صاحب میں نے اس کا نام نہیں پوچھا' لیکن میں شکل سے اسے پہچانتا ہوں' وہ ادھر ہی ہوتا ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو کر دوسری جانب سے ہونے والی باتیں سننے لگا۔ پھر "جی اچھا" کہہ کر فون بند کر دیا اور بولا۔ "یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ابھی صاحب کے پاس مسکن ہی سے فون آیا ہے' اور وہاں کسی لڑکی نے حقیقت میں ہی خودکشی کی ہے' ابھی وہاں سے فون آیا تھا تو صاحب جاگ گئے تھے۔ وہ نیچے آ رہے ہیں۔"

رشید نے جیسے ہی مجھے عرفان رسول کے نیچے آنے کی اطلاع دی' میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا' اور اس کا منہ دبا کر اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ایک ہاتھ میں جکڑ کر تیزی سے گیلری کی جانب بڑھا' جہاں کنیز کھڑی تھی۔

کنیز نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے میری جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر تیزی سے رشید کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے باندھے اور کپڑا پھاڑ کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا' پھر اسے لٹا کر اس کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیئے۔

ہمیں اس کام کو کرنے میں بمشکل دو منٹ لگے ہوں گے۔ میں اور کنیز رشید کو پچھلی گیلری میں گھسیٹ کر ڈال آئے اور تیزی سے بند دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے' ہم دونوں نے اپنے اپنے پستول اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیے تھے۔

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی' وہ تیزی کے ساتھ قریب آ رہا تھا' پھر آٹومیٹک لاک کھلنے کی آواز آئی' اور ایک پستہ قامت شخص ایک دم باہر نکل آیا' اور رشید کا نام لے کر اسے آواز دی۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے پستول اس کی کنپٹی پر لگا دی' دوسری جانب سے کنیز پستول تانے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔

ہمیں یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"کون ہو تم لوگ......؟ کیا ہمیں لوٹنے کے لیے آئے ہو......؟ رشید کہاں ہے؟"

"کوئی سوال جواب نہیں عرفان رسول بناء کوئی آواز نکالے ہمارے ساتھ اپنے بیڈ روم میں اوپر چلو۔"

"دیکھو تم لوگ تسلی رکھو' میرے گھر میں جو بھی روپیہ پیسہ ہے وہ میں تم لوگوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم یہ پستول ہٹالو۔ میں دل کا مریض ہوں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو عرفان رسول' ہمیں تمہارے روپے پیسے سے کوئی غرض نہیں ہے' ہم تمہیں لوٹنے نہیں آئے ہیں' بس تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری بیوی اور بچی کہاں ہے کیا وہ تمہارے بیڈ روم میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں وہ تو وہیں ہیں' لیکن اس کے لیے اوپر جانے کی کیا ضرورت ہے' ہم یہاں ڈرائنگ روم میں بھی اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں ہم وہ باتیں یہاں نہیں کر سکتے' اس کے لیے تمہارا بیڈ روم میں ہونا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ پھر کچھ سوچا اور بولا۔

"دیکھو تمہیں جو بھی بات یا ڈیل کرنی ہے مجھ سے کرو۔ میری بیوی اور بیٹی سے تمہارا کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔"

"خاموشی سے ہمارے ساتھ اوپر چلو۔" میں نے پستول کی نال اس کی کنپٹی پر زور سے گاڑتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر تم خاموش رہے تو سب ٹھیک رہے گا' ورنہ میرے پستول کی گولی کسی رشتے کو نہیں پہچانتی نہ تمہاری بیوی کو اور نہ ہی تمہاری بیٹی کو۔" میں نے دھیمے مگر غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی اور ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چلو......"

میں نے ایک ہاتھ سے پستول اس کی کنپٹی پر لگائی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے' جب کہ کنیز نے بدستور اس پر پستول تانا ہوا تھا اور وہ ہوشیاری سے چاروں جانب دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے' اس کے کمرے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک جوان اور حسین صورت لڑکی باہر نکلی' لیکن اس کی نگاہ جیسے ہی ہمارے اوپر پڑی' اس کے قدم وہیں جم گئے اور وہ منہ اور آنکھیں پھاڑے ہماری جانب تکنے لگی۔

کنیز نے تیزی سے آگے بڑھ کر عرفان رسول کی بیوی کے ساتھ وہی کیا جو میں نے عرفان رسول کے ساتھ کیا ہوا تھا' اس نے اس کے ہاتھوں کو جکڑا اور پستول اس کی کنپٹی پر لگادی' پھر اپنی کہنی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور لات مار کر دروازہ کھول دیا۔

اندر کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اے سی کی ٹھنڈک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

ہم اندر داخل ہو گئے اور لات مار کر دوبارہ دروازہ بند کر دیا' اندر کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے' فرش پر نرم قالین تھا' ایک صوفہ سیٹ بھی اس وسیع بیڈ روم میں تھا اور سامنے جہازی سائز کے بیڈ پر ایک ننھی سی بچی جس کی عمر ڈھائی تین سال ہوگی' بے خبر سو رہی تھی۔

میں نے اور کنیز نے دونوں میاں بیوی کو صوفے پر پھینک دیا اور ہم دونوں پستول تان کر کھڑے ہو گئے۔

"دیکھو میں تمہیں الماری کی چابیاں دے دیتا ہوں تمہیں جو چاہیے وہ لے لو اور چلے جاؤ' ہم پولیس کو بھی کمپلین نہیں کریں گے۔" خوف کے مارے زرد پڑتی ہوئی عرفان رسول کی بیوی بولی۔

میری نگاہیں تیزی کے ساتھ سارے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہمارے پاس ٹائم کم تھا' ویسے بھی "مسکن" سے عرفان رسول کے پاس فون آچکا تھا' ہو سکتا تھا کہ فون دوبارہ آئے یا پھر حقیقت میں کوئی اسے لینے کے لیے آ ہی جائے۔

میری نگاہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے دو موبائل فونز پر پڑی۔ میں نے جھٹ دونوں فون اٹھالیے اور انہیں آف کر کے جیب میں ڈال دیا' پھر میں نے وہیں پر پی ٹی سی ایل فون کا سیٹ بھی رکھا ہوا دیکھا' میں نے اس کا بھی تار کھینچ کر فون سے کنکشن جدا کر دیا' اب رہی اس کی بیٹی' وہ اچانک جاگ کر ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال سکتی تھی' اس لیے اس کا بے ہوش ہونا ضروری تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کنیز کو ان دونوں کی جانب سے الرٹ رہنے کا اشارہ کیا اور جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکال کر بہت خفیف مقدار میں بچی کو کلوروفارم سنگھادیا' پھر اس سوئی ہوئی بچی کو صوفے سے اٹھا کر بیڈ کے سائڈ میں لٹادیا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو؟ میری بچی۔!" جیسے ہی میں نے بچی کو کلوروفارم سنگھایا تو دونوں میاں بیوی ایک ساتھ بول اٹھے بلکہ اس کی بیوی تو اپنی جگہ سے اٹھ بھی گئی۔

لیکن الرٹ کھڑی کنیز نے پستول کا دستہ زور سے اس کے سر پر مارا اور غرائی ہوئی بلی کی طرح بولی۔ "خاموشی سے بیٹھ کتیا' نہیں تو تیری اس بلی کو ایک ہی فائر میں فارغ کر دوں گی۔"

"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟" بیوی اور بچی کا یہ حال دیکھ کر عرفان رسول رونے والے انداز میں بولا۔

"ابھی پتہ چل جاتا ہے تم اپنے کپڑے اتارو۔" میں نے ایک خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا مطلب......؟" وہ اپنی جگہ کسمسایا۔

"مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ تم دونوں میری بات غور سے سنو' میں جو کہہ رہا ہوں تم خاموشی سے ویسا کرتے چلے جاؤ۔ ہمارا کام ختم ہو جائے گا اور ہم یہاں سے خاموشی سے چلے جائیں گے' ورنہ دوسری صورت میں تمہیں نہ صرف اپنی جان سے بلکہ اپنی بیوی اور بیٹی کی جانوں کو بھی گنوانا ہوگا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ تم کیا چاہتے ہو' میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔" عرفان رسول نے تڑپ کر کہا۔

"ویری گڈ۔ تم تو بہت سمجھدار انسان ہو!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ میری شکل دیکھنے لگا' جب کہ اس کی بیوی صوفے پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ شاید کنیز کی زوردار ضرب کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

"اب تم یہاں اس بیڈ پر آجاؤ اور اپنا اوپری جسم ننگا کر دو!"

"کس لیے؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا' چلو فٹافٹ ادھر آجاؤ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن پہلے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا تو میں نے ڈپٹ کر اسے آگے آنے کے لیے کہا تو وہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اس کے وہاں سے ہٹتے ہی کنیز تیزی سے اس کی بیوی کی جانب مڑی اور ایک ہاتھ میں پستول تانے اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی' پھر میرے کہنے پر کنیز نے اس کی بیوی کے بھی ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا' اور عرفان رسول بے بسی کی تصویر بنا یہ سب دیکھتا رہا' اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں'

چہرے کی رنگت زرد ہورہی تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ بھی بے ہوش نہ ہوجائے۔

"دیکھو عرفان رسول ہمیں تمہاری کچھ حسین اور رنگین تصاویر اس حسینہ کے ساتھ بنانی ہیں۔ تم خاموشی سے وہ تصاویر بنوالو اگر تم شرافت سے نہ مانے تو تمہاری اس حسین اور جوان بیوی کی برہنہ تصاویر میں اپنے ساتھ بنواؤں گا اور اس طرح کہ اس میں تمہاری بیوی کا چہرہ اور جسم نمایاں ہوگا' اور میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا۔ ایک دو تصاویر اس طرح لی جائیں گی کہ اس میں تمہاری برہنہ بیوی میری بانہوں میں ہوگی اور تم بھی قریب بیٹھے یہ عجیب سین دیکھ رہے ہوگے۔

اب فیصلہ تمہارا ہے' تم اپنی تصاویر بنوانا پسند کرو گے یا اپنی بیوی کی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تم کس کے کہنے پر کررہے ہو' دیکھو میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں' تمہیں جس کسی نے بھی یہ کام کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے اور تمہیں جتنی بھی رقم دی ہے' میں تمہیں اس سے دگنی چوگنی رقم دوں گا۔ تم مجھے اس کا نام بتادو اور رقم لے کر چلے جاؤ۔" عرفان رسول نے چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بیکار کی باتوں میں وقت مت ضائع کرو عرفان رسول۔ میرا دماغ بہت جلدی خراب ہوجاتا ہے' پھر میں الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا ہوں' کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دماغ خراب ہوجائے اور تمہاری بیوی اور بیٹی میرے ہاتھوں سے ضائع ہوجائیں بولو' کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

وہ چند لمحے تذبذب کا شکار رہا' پھر روہانسا ہوکر اپنے نائٹ ڈریس کی شرٹ اتارنے لگا۔

"گڈ!" یاد ہے تمہاری بیوی اور تمہاری بیٹی میرے نشانے کی زد پر رہیں گی۔" یہ کہہ کر میں اس کی بیٹی کے بالکل نزدیک چلا گیا۔

پھر کنیز نے اپنی پستول مجھے تھمائی اور اپنی ٹی شرٹ اتاردی۔ اب وہ صرف ایک مختصر سے زیر جامہ میں تھی۔ عرفان رسول نے کنیز کو دیکھا تو نگاہیں جھکالیں۔

"ارے یار شرمانا نہیں۔" میں نے دوستانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے طنزیہ کہا۔ "ذرا جذبات اپنے چہرے پر لاؤ اور اس حسینہ کو فوراً اپنی بانہوں میں جکڑ لو' ذرا فری ہوجاؤ' بس یوں سمجھو یہ تمہاری بیوی ہے۔"

اور میرا اشارہ پاتے ہی کنیز عرفان رسول سے لپٹ گئی۔

اور میرا کیمرہ کھٹا کھٹ چلنے لگا۔ دس سے پندرہ پوز لینے کے بعد میں نے کیمرہ بند کرکے جیب میں رکھا اور کنیز اچھل کر بیڈ سے میرے نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی۔ پہلے اس نے اپنا مکمل لباس پہنا پھر دونوں پستول ہاتھوں میں تھام کر کھڑی ہوگئی۔

میں نے عرفان رسول کے بھی ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ اب یہ لوگ کس طرح آزادی حاصل کریں گے' اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی' ہاں البتہ ان کی بیٹی ہوش میں آ کر ان کی کوئی مدد کرسکتی تھی۔

بہرحال ہم نے لائٹیں آف کیں اور تیزی کے ساتھ نیچے اتر آئے' اس مرتبہ ہم سیدھے راستے سے یعنی گیٹ کھول کر باہر نکلے اور سیدھے اپنی کار کی جانب بڑھے۔

ہماری تقدیر اچھی تھی کہ ہمارا کام بناء کسی رکاوٹ کے پورا ہوگیا' اور میں نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ کار کو بھگانا شروع کردیا' ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

جیسے ہی ہم مین روڈ پر آئے وہاں کھڑی ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا کرنا شروع کردیا۔

"شہروز ایک گاڑی ہمارا پیچھا کررہی ہے۔" کنیز نے پیچھے مڑکر دیکھتے ہوئے کہا۔

"محسوس تو میں بھی کررہا ہوں' لیکن یہ کون ہوسکتا ہے اور کیوں ہمارا پیچھا کررہا ہے۔" میں نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں محسوس کررہا تھا کہ پیچھے والی گاڑی کا ڈرائیور بہت مشاق ہے' حالانکہ میں بہت تیز ڈرائیونگ کررہا تھا لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ فاسٹ ڈرائیونگ کررہا تھا اور میری اور اس کی گاڑی کا فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا' بالآخر وہ تیزی کے ساتھ مجھ سے آگے نکلا اور اپنی گاڑی کو تیزی سے آڑا کرکے میرے آگے لے آیا' میں نے فوراً تیزی کے ساتھ بریک لگایا۔ اگر مجھے لمحہ بھر دیر ہوجاتی تو میری گاڑی سیدھی اس کی گاڑی سے ٹکرا جاتی۔

جیسے ہی میری گاڑی رکی' سامنے والی گاڑی کے دروازے دھڑ ادھڑ ا کھلے اور اس میں سے آدمی باہر نکل آئے اور میں حیرانی سے ان اترنے والے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

......☆☆☆......

مجھے یہ بات جان کر بے حد خوشی تھی کہ امی کو حشام اور اس کی فیملی پسند آئی ہے' امی بھی دل سے خوش تھیں اور حشام کے ڈیڈی سے انہوں نے اپنے ماضی کے حوالے سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں' میں نے امی کو پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ وہ کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائیں گی کہ مجھے پالنے اور پرورش کرنے والی مشہور زمانہ طوائف "سرمئی بائی" تھیں۔ امی اس دنیا سے جاچکی تھیں' ان کا باب بند ہوچکا تھا' اس لیے ان کا ذکر کرنا فضول تھا۔ کون اس بات کو مانے گا کہ ایک طوائف نے جب اپنے پیشے سے توبہ کی تو اس نے کتنی پاکیزہ اور اللہ کی اطاعت میں اپنی زندگی گزاری۔ حشام کے ڈیڈی بھی اس حوالے سے سرمئی بائی کو جانتے تھے کہ ان کے نواب سطوت یعنی میرے باپ سے اپنی جوانی میں تعلقات رہ چکے تھے۔

وہ رات میری زندگی کی خوب صورت ترین راتوں میں سے ایک رات تھی' جہاں حشام موجود نہیں تھا لیکن اس کا تصور موجود تھا' وہ ساری رات میرے تصورات کی دنیا میں میرے ساتھ موجود رہا۔

میرا حشام' اپنی پوری دلکشی اور سادگی کے ساتھ میرے دل میں گھس بیٹھا تھا' نہ جانے اس نے میرے دل تک آنے کے لیے کون سا چور دروازہ استعمال کیا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ میں اسے اپنے دل کی تمام تر چاہتوں اور شدتوں کے ساتھ تکے جارہی تھی' میرے دل کی دھڑکنیں خود بخود تیز ہونے لگیں اور میری رگوں میں خون کی روانی تیز تر ہوتی چلی گئی' رات کی تنہائی اور حشام کا حسین ساتھ اس خوب صورت ماحول کا میرے اوپر اثر ہونے لگا اس نے جب بہت پیار اور نرمی سے مجھے اپنی بانہوں میں لیا تو ایک عجیب طرح کا سکون اور طمانیت کا احساس میرے رگ وپے میں سرائیت کرنے لگا۔ ایک پراثر ٹھنڈک میرے وجود میں اترنے لگی۔ اس نے نرمی سے میرے لبوں کو چھوا اور خوابناک لہجے میں بولا۔

"کتنے نرم اور گداز ہیں تمہارے لب بناء کہے ہی مے پلاتے جام...... کیا مجھے اجازت ہے کہ ان چھلکتے جاموں سے میں بھی اپنے خشک ہونٹ تر کرلوں اور میں بے خودی میں مسکرادی اور وہ سرشار انداز میں میرے اوپر جھک آیا۔

یکایک میرے سیل فون کی بیل گنگنانے لگی اور میں ایک جھٹکے سے اس حسین اور خوابناک ماحول سے باہر نکل آئی' میرا دل چاہا کہ اس سیل فون کو دیوار پر دے ماروں کہ اس نے میرا اتنا حسین تصور توڑ دیا

سے نہیں نکلتے!" امی نے آواز لگائی۔

"نہار منہ کہاں امی چائے تو پی ہے۔ اچھا اللہ حافظ۔" میں نے چلتے چلتے کہا اور انہیں اللہ حافظ کہہ کر گاڑی کو باہر نکالا۔ امی گیٹ پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہیں۔

مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا' میری زندگی میں ایک ساتھ بہت کچھ اچھا ہو گیا تھا۔ امی مل گئیں میری برسوں کی پیاس کو تسکین مل گئی۔ حشام کا پیار بھرا ساتھ تھا۔ وہ بہت پیار کرنے والا اور خیال کرنے والا تھا۔ مجھے اور کیا چاہیے۔

میں تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ دن نکل آیا تھا' سورج نے زمین پر اپنی کرنوں کا نور بکھیرا ہوا تھا' ریڈ سگنل ملتے ہی میں نے سیل فون پر راشد سے رابطہ کیا۔ راشد میرا کیمرہ مین تھا۔ وہ لوگ سارے سامان سمیت چینل کی وین میں پہنچ رہے تھے' میں اور حشام چونکہ اپنے اپنے گھروں سے آ رہے تھے اس لیے اپنی گاڑیوں میں تھے۔

نخی حسن پر ہم مل گئے۔ راشد نے مشورہ دیا کہ میں اپنی گاڑی یہیں پیٹرول پمپ پر کھڑی کر دوں اور ان کے ساتھ وین میں آ جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہاں موجود منیجر کو میں نے اپنا کارڈ دکھا کر اپنی گاڑی پارک کرنے کی اجازت مانگی جو اس نے مرعوب ہو کر جھٹ دے دی۔

جب ہم "مسکن" پہنچے تو ہم سے پہلے بہت سے نیوز چینلز کی ٹیمیں وہاں پہنچ چکی تھیں' لیکن وہاں پولیس کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی' جو کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ایمبولینس کے شور...... لوگوں کا اژدھام......

ہم نے ایک پولیس والے سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔ "وہ جی ابھی ایس پی صاحب اندر ہیں وہ باہر تشریف لائیں گے تو ان سے معلومات حاصل کر لیجیے گا۔" وہ اپنی جان چھڑا کر چلا گیا۔

ہم وہاں موجود لوگوں سے بات کرنے لگے کہ آپ میں سے کسی نے دیکھا کہ یہاں کیا ہوا ہے' وہ کون لوگ تھے لیکن کسی نے بھی ہماری بات کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا' آج کل وہ دور آ گیا ہے کہ کوئی بھی اس قسم کے معاملات میں نہیں بولتا کوئی کسی کو لوٹ رہا ہو' یا جان سے مار رہا ہو۔ اغوا ہو یا آبروریزی۔ لوگ دیکھتے ہوئے چپ چاپ آنکھیں اور کان بند کر کے گزر جاتے ہیں۔

کافی انتظار کے بعد ایس پی صاحب باہر نکلے اور انہوں نے سارے میڈیا والوں سے بات کی۔

"بات یہ ہے جناب کہ رات کو ساڑھے تین بجے یہاں چند افراد زبردستی گھس آئے۔ انہوں نے فائرنگ کی بندوں کو زخمی کیا' مارا۔ دو افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ چار افراد شدید زخمی ہیں۔ وہ چار لڑکیوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور جاتے جاتے باآواز بلند ایک پیغام بھی دے گئے ہیں کہ "عرفان رسول کو بتا دینا کہ تم سے ایک لڑکی مانگی تھی اور تم نے نہیں دی۔ ہم چار لے جا رہے ہیں۔" انہوں نے بہت غنڈہ گردی مچائی ہے۔ اب یہ بات تو عرفان رسول صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ ایسی فرمائش ان سے کس نے کی تھی۔ فی الحال تو انہیں سریس قسم کا ہارٹ اٹیک آیا ہے اور وہ آئی سی یو میں ہیں لیکن ان کے ساتھ بھی کچھ برا ہوا ہے' کیونکہ ان کے بنگلے میں بھی وہ خود ان کی بیگم اور ملازم رسیوں سے بندھے ہوئے ملے ہیں۔ ان کی بیگم بھی شاک کی کیفیت میں ہیں اور کوئی بیان نہیں دے رہی ہیں۔ دیکھیں ابھی تو بہت انوسٹی گیشن باقی ہے' سارے معاملات آہستہ آہستہ کھلتے گے تو کوئی واضح صورت حال سامنے آئے گی پھر ہم بھی کارروائی کریں گے آپ لوگ بھی اپنی

طرف سے خبریں مت بنائیے گا۔ ابھی کچھ بھی واضح نہیں ہے۔ شکریہ۔" ایس پی نے جانا چاہا تو اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔

"سر یہ بتائیں کہ اغواء کی جانے والی لڑکیاں کون سی ہیں؟ کیا اندر موجود خواتین نے اس بارے میں کچھ بتایا۔ ان آنے والے غنڈوں نے کسی خاص لڑکی کا نام لیا تھا۔"

"جی ہاں انہوں نے آتے ہی ایک لڑکی شمائلہ کا نام لے کر پوچھا تھا کہ تم میں شمائلہ کون ہے؟ پھر شمائلہ کے سامنے آنے پر انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس کے علاوہ تین اور جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس سے پہلے وہ فائرنگ کر کے بندوں کو زخمی کر کے اپنا راستہ صاف کر چکے تھے۔"

ایس پی نے جواب دیا اور مزید سوالوں کے جوابات دیے بغیر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ اندر مسکن کی ویڈیو بنائیں یا وہاں موجود خواتین سے بات کریں لیکن پولیس نے ہمیں اندر جانے ہی نہیں دیا۔

ہم نے یہ بھی پوچھا کہ عرفان رسول صاحب کس ہاسپٹل میں ہیں تو ہمیں اس بارے میں بھی نہیں بتایا گیا۔

ہمیں انہیں تلاش کرنا تھا' ان کی بیگم ہاسپٹل میں ان کے پاس تھیں' اگر ہم ان سے مل لیتے تو ہمیں خاصی معلومات مل سکتی تھیں۔

بس پھر تو ہمارے کافی سارے ساتھی کراچی کے ہسپتالوں کو چھانتے رہے لیکن کہیں اطلاع نہیں ملی' ایک مشہور نجی ہاسپٹل میں آئی سی یو سے باہر پولیس کا پہرہ تھا' وہاں کسی غیر متعلقہ فرد کو جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔

میں نے دور سے دیکھا باہر کرسی پر ایک جواں سالہ لڑکی ایک ڈھائی تین سالہ بچی کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ خوف و وحشت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

میں نے حشام سے کہا۔ "حشام مجھے لگتا ہے کہ عرفان رسول صاحب یہیں ایڈمٹ ہیں' یہاں پولیس کسی کو آگے جانے نہیں دے رہی ہے۔ اور وہ دیکھو سامنے اس لڑکی کو۔ لگتا ہے یہی ان کی بیگم ہیں۔"

"لیکن یہ تو جوان لڑکی ہے' اور عرفان رسول صاحب تو پچاس پچپن کے ہیں۔" عزیز نے اعتراض کیا۔

"بھئی میں نے سنا تھا کہ ان کی یہ دوسری بیوی ہے۔ یہی ہے بس......" میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

پھر ہم پولیس والوں سے بحث کرنے لگے کہ ہمیں پانچ منٹ کے لیے مسز عرفان رسول سے بات کرنے کی اجازت دے دیں لیکن انہوں نے صاف منع کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں' ہمارے لیے بہت سخت آرڈر ہیں۔ ابھی آپ پولیس کو اپنا کام کرنے دیں۔ تا کہ مجرموں پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔ جب تک پولیس اپنا کام مکمل نہیں کر لیتی' ان لوگوں سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اچھا عرفان رسول صاحب کی حالت اب کیسی ہے وہ خطرے سے تو باہر ہیں ناں۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابھی ان کی حالت اچھی نہیں ہے اندر پولیس موجود ہے وہ بیان دینے کے قابل ہوں گے تو سب سے پہلے پولیس ان کا بیان لے گی۔" اس نے کہا۔

"اچھا ان کی بیگم کیا بتا رہی ہیں کہ رات کو کیا ہوا تھا۔ کون ان کے بنگلے پر آیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ان سے بھی جی ہمارے افسران نے بات کی ہے۔ ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم' اب یہاں سے جاؤ کیوں ہماری نوکری کے پیچھے پڑی

ہو۔“ پولیس والے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اور ہم نے جتنی خبر ملی وہ اپنے نیوز چینل کو دے دی اور پھر میں نے نجی حسن کے پیٹرول پمپ سے اپنی گاڑی لی اور نیوز چینل واپس آ گئے۔

سارا دن اس بھاگ دوڑ کی نذر ہو گیا۔ میں صبح سے بھوکی تھی' رات کا کھانا کھایا ہوا تھا اور رات بھر کی جاگی ہوئی بھی۔ اس لیے کافی حالت ڈاؤن ہونے لگی۔

ہم لوگوں نے کھانا منگوایا اور مل کر کھایا' پھر چائے پیتے ہوئے ہم آپس میں عرفان رسول کے بارے میں ڈسکس کرتے رہے۔ اسی وقت میں نے گھر فون کر کے امی سے بات کی اور انہیں تسلی دی کہ میں اپنے نیوز چینل کے دفتر واپس آ گئی ہوں۔ یہاں سے سیدھی گھر آ جاؤں گی۔

میں اور حشام اٹھ کر اپنے روم میں آ گئے۔ تب ہی اچانک انکل وہاں آ گئے' انہوں نے بتایا کہ انہیں رمضانی صاحب سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملاقات کرنی تھی وہ اس لیے یہاں آئے تھے تو ہمارے روم میں بھی آ گئے' میں نے انکل کے لیے چائے منگوائی' باتوں کے دوران عرفان رسول کا ذکر نکل آیا تو انکل نے کہا کہ تم گھر چلو تمہیں اس کے بارے میں ضروری انفارمیشن دیتا ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں' میں فوراً تیار ہو گئی۔ گھر فون کر کے بتایا' رمضانی صاحب کو اطلاع دی اور میں انکل اور حشام اپنی اپنی گاڑیوں میں حشام کے گھر روانہ ہوئے۔

میں یہ سوچتے ہوئے بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی کہ انکل سے مجھے اپنی رپورٹ بنانے میں کافی ہیلپ مل سکتی ہے' ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہی پہنچ گئے' آنٹی غیر متوقع طور پر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ضد کرنے لگیں کہ اب آئی ہو تو ڈنر کر کے جانا۔ میں نے لاکھ بہانے بنائے کہ امی گھر پر انتظار کر رہی ہوں گی لیکن آنٹی کے ساتھ انکل او[ر] حشام بھی شامل ہو گئے تو مجھے ہار ماننی ہی پڑی آنٹی نے یہ کہہ کر مجھے مزید تسلی دے دی کہ میں روشن آرا [کو] فون کر دیتی ہوں' تم اطمینان سے بیٹھ کر اپنے انکل سے باتیں کرو۔ میں فون کرنے کے بعد ڈنر کا انتظا[م] کرتی ہوں۔ حالانکہ یہاں دو ملازم بھی تھے لیکن کچن کے سارے انتظامات آنٹی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے وہ کافی سلیقہ مند اور وضع دار تھیں۔ وہ تھیں ہی ایسی کہ خود بخود ان کا ادب کرنے کا دل چاہے۔

میں اور حشام انکل کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں تھے' تب انکل بولے۔ ”بیٹا میں عرفان رسول [کو] بذات خود اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ ہاں یہ ضرو[ر] ہے کہ عہد جوانی میں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا [کہ] آج سے دس بارہ سال قبل تک عرفان رسول کوئی اچ[ھا] انسان نہیں تھا اور سب سے اہم بات تمہیں بتاؤں [کہ] عرفان رسول تمہارے والد نواب سطوت......!“

”انکل پلیز اس شخص کو آپ میرا والد کہہ کر مخاطب نہ کریں!“ میں نے انکل کی بات درمیان میں کاٹ کر کہا۔

”کیا فرق پڑتا ہے بیٹا جی! آپ اسے اپنا والد تسلیم کرو یا نہ کرو' وہ رہے گا تو تمہارا باپ ہی۔ ہاں اگر تمہیں پسند نہیں ہے تو یہ اور بات ہے۔ چلو اچھا ہے میں بھی کھل کر تم سے بات کر سکتا ہوں۔“ انکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل انکل! آپ نواب سطوت کے اندر موجود ہر برائی کا ذکر میرے آگے بلا جھجک کر سکتے ہیں' مجھے قطعی [برا] نہیں لگے گا۔“ میں نے کہا تو انکل چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ دس بارہ سال قبل جب خود عرفان رسول ایک اچھا انسان نہیں تھا اس کی دو[ستی] نواب سطوت سے تھی اور وہ ان کی عیاشیوں میں ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

پھر عرفان رسول کی زندگی میں اللہ کی جانب سے ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ اس کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اس کی بیوی مر گئی۔ بیٹی اپاہج ہو گئی اور کچھ عرصے کے بعد انتقال کر گئی۔ بیٹا دراصل اللہ اگر کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کسی آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور اس آزمائش میں مبتلا ہو کر اس کا دل پلٹ جاتا ہے' عرفان رسول کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ رب اللہ نے اس کا دل پلٹ دیا اور وہ نیکی کی راہوں پر چل نکلا۔

اس نے اپنی ساری دولت غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینے اور ان کی فلاح و بہبود پر لگا دی۔ ابھی کچھ عرصے قبل اس نے ایک شادی بھی کی ہے اس کی یہ دوسری بیوی ایک جوان لڑکی ہے' عرفان رسول اس سے دوگنی عمر کا ہے یا شاید اس سے بھی چند سال زیادہ ہی ہوگا۔

یہ لڑکی بے سہارا تھی اور اس نے خود عرفان رسول سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا' عرفان کو بھی ایک ساتھی کی ضرورت تھی اس لیے اس نے دوبارہ سے گھر بسا لیا' اس کی یہ دوسری بیوی اچھی ہے' دونوں خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔

کچھ عرصے سے نواب سطوت دوبارہ عرفان رسول سے تعلق بنانے کی کوشش کر رہا تھا' یہ بات خود مجھے عرفان نے بتائی تھی۔

عرفان سے میری دو تین ماہ سے ملاقات نہیں ہوئی کہ نواب سطوت اور ان کے درمیان تعلقات بحال ہوئے یا نہیں لیکن رات جو کچھ بھی ہوا ہے اس سلسلے میں میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ اس میں نواب سطوت کا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں یکا یک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور انکل کی چیئر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیوں کا اغواء نواب سطوت نے کروایا ہے اور وہ شمائلہ نامی لڑکی اسی کی ڈیمانڈ تھی۔“

”اطمینان سے بیٹھ جاؤ بیٹا! میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں کہ میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں۔“ انکل نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی' تو انکل نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

”میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ کچھ عرصہ قبل نواب سطوت نے عرفان کو اس کے ادارے ”مسکن“ کے لیے ایک خطیر رقم چندے کے طور پر دی تھی اور اس نے ”مسکن“ کا دورہ بھی کیا تھا۔ وہ ٹھہرا ایک بدنگاہ اور عیاش انسان' مسکن کے دورے میں یقیناً اس نے شمائلہ نامی لڑکی کو دیکھا ہوگا اور عرفان سے اس کے حصول کی ڈیمانڈ کی ہوگی اور عرفان نے ظاہر ہے ناگواری سے انکار کر دیا ہوگا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ عرفان نے غصے میں آ کر نواب سطوت کو اس کا چیک واپس کر دیا تھا اور کہا تھا۔ ”میں نے ان بچیوں کو باعزت تحفظ دیا ہے' نا کہ تم جیسے عیاش مردوں کی تسکین کے سامان کے طور پر انہیں رکھا ہوا ہے' تمہیں اگر پیسے کا لالچ دے کر لڑکی حاصل کرنی ہے تو ایسے بہت سے بازار کھلے ہیں وہاں سے بہت کم رقم خرچ کر کے تم کوئی بھی لڑکی حاصل کر سکتے ہو' آئندہ نہ تو مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنا اور نہ ہی ایسی کوئی توقع رکھنا۔“

اور نواب سطوت جیسا انسان اپنی اتنی بڑی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے غنڈوں کو بھیج کر نہ صرف شمائلہ کو اٹھوا لیا بلکہ اس کے ساتھ تین لڑکیوں کو اور اٹھا لیا۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آ رہی ہے لیکن عرفان کے بنگلے پر کیا ہوا۔ وہ کون لوگ تھے

جواس کے بنگلے پرآئے اور انہیں باندھ کر چلے گئے۔ یہ ڈکیتی کی واردات بھی نہیں لگتی' کیونکہ ان کے گھر سے کوئی شے نہ تو غائب ہوئی ہے اور نہ ہی کسی شے کو ہاتھ لگایا گیا ہے' سوائے اس کے کہ ان دونوں میاں بیوی اور ملازم کے موبائل فونز وہ اپنے ساتھ لے گئے اور گھر کے فون کے تار بھی نکال دیئے تھے آخر وہ کیا کرنے آئے تھے اور کیا کر کے چلے گئے......

اور ہاں ایک اور اہم خبر ہے......شاید تمہیں اس کے بارے میں ابھی پتہ نہیں چلا ہے' حالانکہ سارے نیوز چینل پر یہ خبر نشر ہو رہی ہے کہ شاہراہ فیصل پر دو گروپوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور دو تین آدمی جو "مسکن" کے ملازم تھے وہ اس واردات کے بعد وہاں سے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے' فون کا رابطہ نہ ہونے پر وہ عرفان کے بنگلے پر خود گئے تب انہوں نے ایک عورت اور ایک مرد کو اس کے بنگلے سے نکل کر فرار ہوتے ہوئے دیکھا' انہوں نے اندر جا کر ایک آدمی کو وہاں چھوڑا اور خود اس کار کا پیچھا کیا۔ اور بالآخر انہیں پکڑ لیا۔ اسی اثناء میں ایک اور کار وہاں پہنچی' جنہوں نے فائرنگ شروع کر دی' دوسری آنے والی کار کے افراد اس عورت اور مرد کو وہاں سے نکال لے جانا چاہتے تھے۔ فائرنگ میں دو تین افراد ہلاک بھی ہوئے ہیں اور کچھ زخمی بھی ہوئے ہیں۔

بعد میں عرفان کے بنگلے میں جو شخص گیا تھا اس نے ساری صورت حال دیکھ کر پولیس کو اطلاع کی' عرفان اور اس کی بیوی اور بچی بے ہوش تھے' جبکہ ملازم ہوش میں تھا' اس نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت یہاں آئے تھے اور اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دینے کے بعد ایک جھوٹا فون عرفان کو کروایا تھا کہ وہ گھبرا کر دروازہ کھول دے۔ ملازم نے یہ بھی بیان دیا ہے کہ وہ لڑکی ایک دن قبل کسی شبیر نامی شخص کا پتہ ڈھونڈتے ہوئے آئی تھی۔"

اتنا کچھ بتا کر انکل خاموش ہو گئے اور ہم تینوں سوچ میں گم ہو گئے۔ تب میں نے کہا۔

"انکل مجھے تو وہ دونوں افراد وہ مرد اور عورت نواب سطوت کے بندے ہی لگ رہے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہوں نے عرفان صاحب کے بنگلے میں آدھی رات کو آ کر کیا کیا' پھر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر چلے گئے' ور بچارے عرفان صاحب انہیں تو سیریس ہارٹ اٹیک ہی ہو گیا۔ اللہ کرے وہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں۔ اس سارے راز سے تو وہی پردہ اٹھا سکتے ہیں۔" میں نے عرفان صاحب کے لیے اپنے دل میں ترحم آمیز جذبات لیے ہوئے کہا۔ "ویسے انکل آپ ان کی بیوی سے تو بات کریں وہ بھی بتا سکتی ہیں۔" میں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"ابھی تو بیٹا ان سے بھی ملنا مشکل ہے' وہ بھی پولیس کسٹڈی میں ہیں اور کسی کو بھی ان سے ملنے نہیں دیا جا رہا۔" انکل نے کہا پھر وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور بولے۔

"تمہاری بات میں مجھے وزن نظر آ رہا ہے کہ "مسکن" پر حملہ کرنے والے افراد' عرفان کے بنگلے پر آنے والے افراد اور پھر شاہراہ فیصل پر عرفان کے بندوں سے تصادم کرنے والے افراد کا آپس میں تعلق ہے۔ خیر اللہ سے دعا کرو کہ عرفان کی حالت جلد بہتر ہو جائے اور وہ خطرے سے باہر آ جائے اور پولیس کا چکر ختم ہو تو میں عرفان سے ایک ملاقات کروں گا اور اس سے ساری صورت حال معلوم کروں گا۔ مجھے امید ہے وہ مجھے ضرور بتا دے گا۔" انکل نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

عرفان صاب کا موضوع ختم ہوا تو ہم دوسرے سیاسی ایشوز پر بات کرنے لگے' آنٹی نے ایک دو چکر لگائے ذرا دیر ہمارے ساتھ بیٹھیں اور بور ہو کر یہ کہتی ہوئی چلی گئیں "توبہ ہے آپ تو میری بیٹی کو گھیر کر بیٹھ گئے اور وہی سیاسی موضوع' ہمیں اس سے کیا کہ حکومت میں لوگ کیا کیا دھاندلیاں کر رہے ہیں' ہمیں تو اپنے گھر کی سکھ شانتی سے مطلب ہے۔"

"آپ نہیں سمجھیں گی بیگم صاحبہ! دیکھا بیٹا تم نے ہمیں کتنی بور بیگم ملی ہیں۔" انکل نے آنٹی کو جواباً چھیڑا تو وہ جاتے جاتے پلٹیں اور یہ کہہ کر چھپاک سے نکل گئیں۔ "بور میں ہوں یا آپ......اب میری بیٹی کو بھی بور کر رہے ہیں۔" اور میں اور انکل زور سے ہنس پڑے۔

"ویسے انکل دس از ناٹ فیئر آپ کو آنٹی کو بھی ٹائم دینا چاہیے' کچھ ان کی دلچسپی کی گفتگو بھی ان سے کیا کریں۔ وہ بچاری بھی کیا کریں' سارا دن گھر میں تنہا ہوتی ہیں' آپ لوگوں کا انتظار کرتی ہیں' اور آپ لوگ گھر آ کر پھر اپنے موضوعات لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے انکل سے کہا۔

"کیا کریں بیٹا ہمارا شعبہ ہی ایسا ہے' برسوں بیت گئے اس دشت کی سیاحی میں' اس نے تمہیں دل سے بیٹی مانا ہے' سوچتی ہو گی کہ تم گھر آؤ گی تو اس سے باتیں کرو گی تو اس کا دل بہلے گا اور تمہارے آتے ہی میں تمہیں لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ویسے وہ خود ایک بہترین عورت اور بیوی ہے اس نے مجھ جیسے خشک انسان کے ساتھ بہت صبر سے گزارہ کیا ہے۔" انکل کے لہجے میں آنٹی کے لیے بہت عزت واحترام اور پیار چھپا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل مجھے آنٹی کے پاس جانا چاہیے۔" میں یہ کہہ کر اٹھنے لگی' مجھے بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ آنٹی مجھے اتنے پیار محبت سے اپنے گھر انوائیٹ کرتی ہیں کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں گی ان سے باتیں کروں گی اور میں انکل کے ساتھ بیٹھ کر اپنی دلچسپی کی باتیں شروع کر دیتی ہوں۔ اب میں بھی کیا کہتی' ہم ایک ہی شعبے جرنلزم سے تعلق رکھتے تھے۔

"ارے نہیں سرمئی بیٹا' تم ذرا دیر کو میرے پاس رکو مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" انکل نے کہا تو میں رک گئی جب کہ حشام انہیں چونک کر دیکھنے لگا' پھر وہ حشام سے بولے۔

"حشام بیٹا جاؤ تم جا کر دیکھو ڈنر ریڈی ہوا یا نہیں' اپنی امی کی تھوڑی ہیلپ کرو' برتن وغیرہ ٹیبل پر لگواؤ۔"

انکل کی بات پر میں نے اور حشام نے حیران ہو کر انکل کو دیکھا کہ آخر ایسی کون سی بات انہیں مجھ سے کرنی ہے جو وہ حشام کی موجودگی میں نہیں کر سکتے' کیونکہ جس طرح بہانہ کر کے وہ حشام کو بھیج رہے تھے ہم سمجھ گئے تھے۔

حشام خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا تو میں انکل کی جانب متوجہ ہو گئی اور کہا۔ "کہیے انکل! آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہے تھے۔"

انکل چند لمحے خاموش رہے' جیسے وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کر رہے ہوں۔ نہ جانے کیوں میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا کہ انکل مجھ سے کیا بات کرنے کے لیے اتنی سوچ بچار کر رہے ہیں' پھر انکل اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور میرے نزدیک آ گئے تو میں بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ چند لمحوں تک ان کی جانب دیکھا' وہ میری ہی جانب دیکھ رہے تھے' تو میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ تب وہ بولے۔

"سرمئی بیٹا یہ حقیقت ہے کہ ہماری ایک حشام کے علاوہ کوئی اور اولاد نہیں ہے' تمہیں پتہ ہے مجھے شروع ہی سے ایک بیٹی کی خواہش تھی' مجھے بیٹیاں

ہمیشہ سے اچھی لگتی تھیں شاید اس لیے کہ میں بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا، بہن نہ بھائی کوئی بھی نہیں، پھر جب تم ہمارے گھر آئیں تو میرے دل نے تمہیں دل سے اپنی بیٹی مان لیا۔ تمہاری آنٹی بھی تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے......!"

انکل نے جب آخری فقرہ ادا کیا تو میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"وہ اس لیے ممکن نہیں ہے کہ تمہارا اپنا گھر ہے ماں ہیں، بھلا کوئی کسی کی بیٹی کو یوں اٹھا کر اپنے گھر تو نہیں رکھ لیتا۔ ہاں اس کی ایک قانونی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ہم بہو کی صورت میں تم سے رشتہ بنائیں اور بیٹی بنا کر اپنے گھر لے آئیں اور ایسی بیٹی جس کے گھر سے جانے کی تمہیں کبھی کوئی فکر نہ ہو......!"

انکل بول رہے تھے اور میرا دل ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے دھڑک رہا تھا، حیا کی لالی خود بخود میرے گالوں پر بکھر گئی۔

"اب جب میں نے دل سے تمہیں اپنی بیٹی مانا ہے تو میرا فرض ہے کہ تمہاری امی سے تمہیں مانگنے سے پہلے میں تمہاری مرضی معلوم کروں کہ تمہیں میرا نالائق حشام اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر قبول ہوگا یا نہیں۔"

"حشام نالائق تو نہیں ہیں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو انکل ہنس پڑے اور بولے۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بیٹا اگر تم اس رشتے کو ناپسند بھی کرو گی، تب مجھے دکھ تو ہوگا، لیکن تم ہمیشہ میری ایسی ہی بیٹی رہو گی جیسی اب ہو۔"

"آپ نے بیٹی کہا ہے اور میرے بزرگ بن کر میرے بارے میں سوچ رہے ہیں تو جو آپ کا فیصلہ ہوگا وہ مجھے منظور ہوگا اب آپ خود سوچ لیں مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔" میں نے سر اور نگاہیں جھکا کر کہا تو انکل نے خوشی سے لرزتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور بولے۔

"ہمیشہ خوش رہو! اللہ تمہیں بہت خوشیاں عطا کرے۔"

میں چند لمحوں تک کھڑی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی رہی پھر اسٹڈی سے باہر نکل آئی۔ سیدھی واش بیسن پر گئی اور اپنے سرخ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ مجھے کچھ سکون ملا تو میں کچن کی جانب چلی گئی۔ آنٹی حشام سے مسلسل بول رہی تھیں۔ انہیں انکل پر غصہ آرہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے نہیں چھوڑا ہے۔

"میں آگئی ہوں آنٹی جان!" میں نے پیار سے پیچھے سے جا کر آنٹی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا اور اپنا سر ان کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"ارے آگئیں تم، فارغ کر دیا تمہارے انکل نے۔" جواباً انہوں نے مصنوعی خفگی بھرے لہجے میں کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"سوری آنٹی! مجھے معلوم ہے آپ کو غصہ آ رہا ہے لیکن انکل سے مجھے بہت ضروری ڈسکشن کرنی تھی۔ لیجیے کان پکڑ لیے۔ اب سے آئندہ پہلے آپ سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی بعد میں انکل کے پاس جاؤں گی۔" میں نے شرارت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنے کان پکڑے تو انہوں نے محبت سے میرے ہاتھ تھام کر انہیں چوم لیا۔

"دہائی ہے دہائی ہے عالی جاہ، جب سے ان محترمہ کا ہمارے گھر آنا جانا ہوا ہے۔ اس بندہ ناچیز کو لوگوں نے گھاس ڈالنا بند کر دیا ہے۔" حشام نے دیکھا تو شرارت سے بولا۔

"باہر لان میں ڈھیر ساری گھاس ہے جتنی دل چاہے چر لیجیے۔" میں نے کہا تو وہ آنکھیں نکال کر مجھے مکا دکھانے لگا۔ میں بھی تیزی سے اس کے قریب گئی اور آہستہ سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے ناں میں سر توڑ دیا کرتی ہوں۔"

اور اس سے پہلے کہ حشام کچھ کہتا انکل باہر آگئے اور سیدھے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھے اور بولے۔ "بیگم یہ بتائیے کہ آپ نے سوئیٹ ڈش میں کیا بنایا ہے۔"

"آپ کو سوئٹ ڈش سے کیا مطلب؟ اگر بنی ہے تو سرمئی بیٹی کے لیے۔ آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کا شوگر لیول آج کل ہائی ہے اور ڈاکٹر نے سختی سے سوئیٹ لینے کی ممانعت کی ہے۔" آنٹی نے ٹیبل کے قریب آ کر کہا۔

اتنے میں ہم سب اپنی اپنی چیئر پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ تب انکل نے معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی آج کسی ڈاکٹر کی نہیں سنی جائے گی، خوب جی بھر کے منہ میٹھا کریں گے۔ ہماری بیٹی سرمئی نے ہاں کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کس لیے؟" حشام نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"بھئی میری نگاہ میں ایک بہت اچھا رشتہ تھا میں نے اس سلسلے میں سرمئی بیٹی سے رائے مانگی اور اس نے ہاں کر دی۔" انکل نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو آنٹی ہکا بکا انکل کا منہ دیکھنے لگیں اور حشام نے غصے سے کھڑے ہو کر کرسی کو لات ماری اور اٹھ کر تیزی سے جانے لگا، تب انکل با آواز بلند بولے۔ "ہاں بھئی میری نگاہ میں میرے حشام سے بہتر رشتہ اور کسی کا ہو سکتا تھا۔"

یہ سنتے ہی حشام کے تیزی سے چلتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئے، اس نے وہیں سے مڑ کر حیرت سے انکل کو دیکھا اور جب انکل کی کھلی ہوئی بانہیں دیکھیں تو دوڑتا ہوا آیا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

کھانے کے دوران انکل نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے میرے لیے ایک ڈرائیور سے کہہ دیا ہے، ایک دو روز میں وہ آجائے گا۔ تمہارا یوں رات کو اکیلے نکلنا مناسب نہیں ہے، ویسے بھی حالات کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا کبھی بھی اور کہیں بھی خراب ہو جاتے ہیں اور میں نے سعادت مندی سے ان کی بات مان لی۔

چلتے وقت آنٹی نے کہا کہ وہ اسی ہفتے میری امی سے ملنے کے لیے آئیں گی ہمیشہ کی طرح حشام میری گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی لے کر گھر تک آیا گھر پر اس نے اپنی گاڑی روک کر مجھ سے کہا۔

"سرمئی تم خوش ہو ناں۔" اور جواب میں میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

......☆☆☆......

اس کار سے تین افراد اتر کر آئے ان کے ہاتھوں میں پستول تھے جو انہوں نے ہم پر تانی ہوئی تھیں، وہ بولے۔ "کون ہو تم لوگ اور آدھی رات کو اس بنگلے میں کیا کر رہے تھے؟"

"کس بنگلے پر تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ہم تو اپنے گھر سے ہاسپٹل جا رہے ہیں میری بیوی کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" میں نے بات نہ بڑھانے کے لیے یہ بہانہ گھڑا۔

"بکواس نہ کرو باہر نکلو تیری تو؟ عرفان رسول کے بنگلے میں کیا کرنے گئے تھے!"

ان میں سے ایک شخص نے جو سب سے زیادہ توانا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے آ کر کہا اور میری سائیڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے

بھی اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا۔ کنیز بھی ذرا دیر کو حواس باختہ ہوگئی لیکن اس نے مجھے پستول نکالتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے زبردستی ہمیں روکنے کی کوشش کی تو ہم انہیں یہیں ٹھنڈا کر دیں گے۔ نہ جانے کون لوگ تھے یہ اور انہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم عرفان رسول کے بنگلے میں تھے۔

اور اس سے پہلے کہ مزید کچھ ہوتا' کہیں سے اچانک ایک اور کار آ گئی اور اس میں سے فائرنگ ہونے لگی۔

ان لوگوں کی جانب سے ہونے والی فائرنگ میں ان کا ایک بندہ زخمی ہوگیا۔ وہ تیزی سے اپنی کار کے پیچھے ہوگئے اور وہاں سے پوزیشن سنبھال کر فائر کرنے لگے۔ میں اور کنیز سامنے بیٹھے تھے' ہمیں بھی کسی بھی وقت کوئی بھی گولی لگ سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ ایک اور کار کہاں سے آ گئی اور اس میں کون لوگ سوار ہیں اور کیوں ان لوگوں پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ جو لوگ بھی تھے' میرے لیے رحمت ہی تھے۔

"کنیز ہمیں بھی کار سے اتر کر کار کے پیچھے پوزیشن سنبھال لینی چاہیے' کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔" میں نے سرعت سے اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے زمین کی جانب لوٹ لگائی اور پھر زمین پر کرالنگ کرتا ہوا کار کے پیچھے جانے لگا۔

اچانک ہی ایک فائر ہوا اور مجھے کنیز کی چیخ سنائی دی۔ میں لمحہ بھر کو رکا لیکن پھر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ کار کے پیچھے جا کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں نے کار کے دوسری جانب جھانکا۔ کنیز زمین پر گری ہوئی تھی' اور اس کی مزید کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کنیز ان میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن گئی ہے۔

پھر زبردست فائرنگ سنائی دینے لگی۔ میں نے اس فائرنگ میں حصہ نہیں لیا۔ میں صرف ان کا جائزہ لے رہا تھا' پھر فائرنگ کی آوازیں رک گئیں۔ پھر کسی کے تیز اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز میری جانب آئی تو میں الرٹ ہوگیا۔

پھر کوئی شخص میرے نزدیک آیا تو میں نے پستول تان لی وہ شخص ہاتھ اوپر کرتا ہوا بولا۔ "دس آر فرینڈز۔"

"کون ہو تم لوگ!" میں نے پستول نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"بیکار سوچوں میں وقت ضائع مت کرو' تم ٹھیک تو ہو ناں" اس نے تیزی سے کہا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن وہ زخمی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے تم چھوڑو اور خود یہاں سے فوراً نکلو۔ ہم بھی جا رہے ہیں۔ اتنی فائرنگ ہوئی ہے یہاں کسی بھی وقت پولیس آ سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن وہ!" میں نے زخمی کنیز کی جانب اشارہ کیا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ بس تم یہاں سے نکلو، اسے ہم دیکھتے ہیں۔" اس نے کہا تو میں نے اس بات کا احساس ہوتے ہی کہ واقعی پولیس یہاں کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' پھر میں تیزی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا کلفٹن پہنچ گیا۔

اندر جا کر میں نے جیکٹ اتار کر کرسی پر ڈالی اور بیڈ پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ میں تو بہت مطمئن آ رہا تھا کہ میرا کام خاصی آسانی سے ہوگیا لیکن راستے میں جو کچھ ہوا وہ میری سمجھ سے باہر تھا' پھر میں بیٹھ کر سوچنے لگا اور حالات کی کڑیاں ملانے لگا۔ میں اس معاملے سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنے ذہن میں

لانے لگا کہ یہ سب کیا معاملہ تھا۔ پہلے کچھ لوگوں نے ہمیں روکا۔ سمجھ میں یہ آیا کہ ان لوگوں کا تعلق عرفان رسول سے ہو سکتا ہے' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمیں کب اور کہاں سے دیکھا' کیونکہ باہر آ کر میں نے سب جانب دیکھا تھا' تو مجھے ارد گرد کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر وہ لوگ میرے پیچھے کہاں سے آ گئے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ علاقے کے گارڈز ہوں اور انہوں نے ہمیں عرفان رسول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو لیکن اگر انہوں نے ہمیں وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا تو انہیں ہم پر یہ شک کیسے ہوا کہ ہم اس گھر سے کچھ ٹھیک کر کے نہیں نکلے ہیں۔ وہ ہمیں یہ سوچ کر بھی نظر انداز کر سکتے تھے کہ ہم ان کے کوئی ملنے والے یا رشتہ دار ہو سکتے ہیں اور ان سے مل کر اپنے گھر جا رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ پورے یقین کے ساتھ ہمارے پیچھے آئے تھے اور ہمیں روکا تھا۔ وہ اسلحہ بردار تھے۔ انہوں نے گارڈز کی وردیاں بھی نہیں پہنی ہوئی تھیں۔ یقیناً ایسا کچھ تھا جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور پھر وہ دوسرے لوگ جو ہمیں ان سے بچانے کے لیے آئے تھے' کنیز کو کس کی گولی لگی یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ کنیز اب اس دنیا میں نہیں رہی...... اچانک مجھے نواب کی بات کا خیال آیا' اس نے کہا تھا کہ کنیز کو کلفٹن والی کوٹھی میں واپس نہیں آنا ہے' اسے لینے کے لیے کچھ لوگ ہوں گے اور وہ ان کے ساتھ چلی جائے' اور یہ بات میرے بھی ذہن سے نکل گئی اور کنیز کے بھی......

دوسری آنے والی پارٹی یقیناً وہی تھی جسے نواب نے کنیز کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ہماری کار کو نکلتا ہوا دیکھ کر وہ بھی ہمارے پیچھے ہی آ رہے تھے اور پھر انہوں نے مجھے اور کنیز کو ان لوگوں سے بچانا چاہا' لیکن کنیز گولی کا نشانہ بن گئی۔

اور پھر ایک اور بات میرے دماغ میں آئی اور میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی کہ کنیز کس کی گولی کا نشانہ بنی اور ان لوگوں نے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ تم جاؤ' ہم کنیز کو دیکھ لیں گے یقیناً کنیز کو نواب کے لوگوں نے نشانہ بنایا ہوگا اور نواب نے اسی لیے کنیز کو کوٹھی آنے سے منع کر دیا ہوگا کہ اس کام کے بعد نواب سارے ثبوت مٹا دینا چاہتا ہوگا' وہ ان تصاویر کے ذریعے عرفان رسول کو باآسانی بلیک میل کر سکتا تھا اور نواب یہ بات بھی اچھی طرح سے جانتا ہے کہ عرفان رسول پولیس کو کبھی بھی یہ شرمناک بات نہیں بتائے گا اور اگر اس نے ہمت کر بھی لی تو ہو کہیں سے بھی کنیز کو برآمد نہیں کر سکیں گے۔

نواب اتنا ہی کمینہ انسان ہو سکتا ہے۔ اپنے مفاد کے لیے وہ کسی کی بھی عزت اور جان سے کھیل سکتا ہے۔ اسے ہر حال میں اپنا مفاد عزیز ہے۔ مجھے اس نے اس لیے بچایا ہے کہ ابھی اسے میری مزید ضرورت ہے' جس دن اسے اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ میں بھی اب اس کے کسی کام کا نہیں رہا وہ مجھے بھی کتے کی موت مروا دے گا اور میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں وہ وقت آنے سے پہلے اس کو موت کی نیند سلا دوں گا۔ ایک اس ابن ابلیس کے مرجانے سے خلق خدا کا بھلا ہی ہوگا۔

وہ کل رات ہی کو یہاں سے کہیں چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں واپس آیا یا نہیں پھر مجھے خیال آیا کہ باہر نہ تو اس کے گارڈز موجود تھے اور نہ ہی اس کی لینڈ کروزر...... وہ یقیناً واپس نہیں آیا ہے۔ اس وقت میرے علم میں نہیں تھا کہ اس وقت جب میں عرفان رسول کے بنگلے پر اس کی شرمناک اور حیا سوز تصاویر کنیز کے ساتھ بنا رہا تھا اس شہر کراچی میں اور کیا کیا ستم ہوگیا ہے۔

میں نے جیکٹ کی جیب کی زپ کھول کر ڈیجیٹل کیمرہ نکالا اور عرفان رسول کی تصاویر دیکھیں' ساری تصاویر بالکل صاف اور واضح تھیں' ہر تصویر میں عرفان رسول کا چہرہ بالکل واضح تھا' البتہ کنیز کا چہرہ اتنا واضح نہیں تھا البتہ ان کے جسم کے خطوط واضح تھے۔

میں نے کیمرہ سنبھال کر رکھا۔ دروازہ اندر سے لاک کیا اور بیڈ پر لیٹ کے سو گیا۔

گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو سر کافی بھاری ہو رہا تھا' میں تھوڑی دیر تک تو بستر پر لیٹا رہا پھر رات کے سارے واقعات ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے' میں نے یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے کہ نیوز میں کوئی خبر آ رہی ہو' ریموٹ اٹھا کر لیٹے لیٹے ٹی وی آن کر دیا۔

نیوز چینل پر جو خبر نشر ہو رہی تھی اسے سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور نواب کے لیے میرے منہ سے گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔

میں سمجھ گیا کہ عرفان رسول کے ''مسکن'' پر ہونے والا حملہ نواب کے آدمیوں کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔ یقیناً عرفان رسول کے پاس ''مسکن'' سے فون آ چکا تھا جب ہی وہ بلا سوچے سمجھے تیزی سے نیچے آ گیا اور میرے چنگل میں پھنس گیا۔

نواب جیسے عیار شیطان نے بہت سوچ سمجھ کر پلان بنایا تھا' اس کے خفیہ بندے ہمیں مسلسل واچ کر رہے تھے اور اس کا سارا پلان کامیاب رہا۔

نواب کی جانب سے ابھی تک میرا بلاوا نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ شیطان واپس آیا یا نہیں۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا اور لیٹ گیا۔ یکا یک مجھے اپنے آپ پر شدید شرمندگی ہونے لگی میں کتنا برا انسان ہوں' میں نے شیطان کا ساتھ دیا' میرا شمار بھی اس کے ٹولے میں ہوگا۔ قیامت کے دن میں اپنے رب کو کیا منہ دکھاؤں گا...... میں نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں کیا؟ میں ندامت اور شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے اماں اور بابا کا پڑھایا ہوا وہ سارا سبق یاد آنے لگا جو ساری زندگی وہ مجھے پڑھاتے رہے تھے' ایمان داری اور شرافت کا سبق اور میں نے اندھے جذبات کا شکار ہو کر کتنی جلدی وہ سب بھلا دیا۔ کیا انسان اتنا ہی کمزور ہے؟

میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال ابھر رہا تھا' پھر بابا کی ایک بات یاد آئی انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔

''بیٹا انسان بہت کمزور ہے لیکن طاقت ور وہی شخص ہوتا ہے جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اور ایمان دار شخص کی کوئی کمزوری نہیں ہوتی کیونکہ شیطان انسان کو اس کے کمزور ترین حصوں سے گرفت میں لیتا ہے' اور اسی لیے میرے بچے تم کسی بھی چیز کو کبھی بھی اپنی کمزوری بننے مت دینا۔ نہ مال نہ اولاد اور نہ ہی ماں باپ یا بہن بھائی' صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی تمہارے سامنے رہنی چاہیے۔''

پھر مجھے یاد آیا کہ میرے اندر غصہ تھا' انتقام تھا۔ میں غصے اور انتقام میں اندھا ہو گیا اور یہ انتقام ہی تو تھا جس نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ ملا دیا' جو سوائے یعنی صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے تھے۔ میں کیا تھا اور کیا بن گیا تھا۔ میرے بابا نے تو مجھے مسیحا بنایا تھا اور میں قاتل بن کر رہ گیا نہ صرف قاتل بنا بلکہ زانی بھی بن گیا۔

میں نے اللہ سے انصاف کیوں نہ مانگا کیوں نہ اس پر بھروسہ کر کے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا۔ اللہ پر سب کچھ چھوڑ دینا۔ بے غیرتی نہیں ہے اس کے آگے اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار ہے' اب میں کیا کروں۔ کس طرح اس دلدل سے باہر نکلوں' اب تو میں نے یہ گھٹیا کام کر لیا ہے' لیکن میں نواب کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس کے ساتھ رہ کر اس کی جڑیں کاٹوں گا۔ اور اس کام کے لیے مجھے سرمئی کا خیال آیا۔

ہاں وہ یقیناً اس کام میں میری مدد کرے گی۔ میں فی الحال تو یہ کیمرہ نواب کے حوالے کر دوں گا' اور اس پر قطعی یہ ظاہر نہیں کروں گا کہ میں اس کا پلان سمجھ گیا ہوں یا مجھے ''مسکن'' کے حوالے سے کسی خبر کا علم بھی ہے۔ کنیز کے بارے میں البتہ پریشانی کا اظہار ضرور کروں گا کہ پتہ نہیں وہ کیسی ہوگی۔

یکا یک مجھے اپنے جسم پر لگی ہوئی ڈھیر ساری گندگی اور نجاست کا احساس ہونے لگا مجھے اتنی زیادہ بدبو کا احساس ہوا کہ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ یہ گندگی سے لوگوں کے بہتے ہوئے خون کی زناکاری کی۔

میں بھاگتا ہوا باتھ روم کی جانب گیا اور شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ یہ پانی اس گندگی کو دھونے کے لیے ناکافی ہے۔ اس پانی سے یہ گندگی دور نہیں ہوگی اور نہ میں یہ ناپاک اور گندہ جسم لے کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوسکتا ہوں۔

پھر میں کیا کروں!

میں گھٹنوں کے بل باتھ روم کے فرش پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اوپر سے میرے سر پر پانی گر رہا تھا اور میں گھٹنوں میں منہ دیئے آنسو بہا رہا تھا۔

پھر میرے دل سے آواز ابھری۔

''یہی ندامت کے اشک' یہ ندامت اور شرمندگی سے لبریز نمکین پانی ہی میری نجاست کو دھو سکتا ہے۔ شاہ زمان یہی پانی تمہیں اللہ کے آگے سجدے میں رہ کر بہانا ہوگا اتنا کہ ان اشکوں کے سیلاب میں تمہارا سارے کا سارا وجود تنکا بن کر بہہ جائے۔

اللہ رحیم و کریم ہے' غفور الرحیم ہے' غفور و رحیم ہے اس نے اپنے بندوں کے لیے توبہ کے دروازے کھلے رکھے ہیں' تم ایک بار اس دروازے سے اندر داخل ہو کر دیکھو شاہ زمان تمہارا ربّ سچے دل سے کی گئی تمہاری توبہ کو قبول کر کے کیسے تمہیں اپنی رحمتوں کی پناہوں میں لے لے گا۔ اسے اپنے بندوں کے پلٹ آنے اور رجو کرنے والے بندوں کا انتظار ان کی آخری سانس تک رہتا ہے۔

کوئی تھا جو میرے اندر بول رہا تھا اور میں سن رہا تھا پھر میں نے اپنا بھیگا ہوا لباس اتار پھینکا اور میں نے اس لمحے ایک اہم فیصلہ کر ڈالا......

میں غسل کر کے باہر آیا تو کوئی میرا دروازہ زور زور سے بجا رہا تھا' میں نے اپنے جسم کے گرد تولیہ لپیٹا ہوا تھا' میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو سلمان کھڑا تھا' مجھے دیکھ کر بولا۔

''اوہو...... سوری...... تم نہا رہے تھے۔''

''ہاں کیا ہوا ...... کیا بات ہے؟'' میں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

''نواب صاحب ابھی ابھی آئے ہیں اور تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''تو اس طرح کیوں بول رہے ہو۔'' میں نے اسے سرگوشی میں بولتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''وہ کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں اور آتے ہی تمہیں بلوا لیا۔'' اس نے کہا۔

''میں کپڑے بدل کر آ رہا ہوں...... اور ہاں تم ذرا میرے لیے چائے اور ناشتے کا کہہ دو۔'' میں نے کہا۔

''یہ بتاؤ نواب صاحب کا کام تو ہو گیا ناں۔'' اس نے پھر سرگوشی میں پوچھا۔

''کون سا کام؟'' میں نے الماری سے کپڑے

نکالتے ہوئے پوچھا۔

”وہی جو تم رات کو کرنے گئے تھے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”تم میری اتنی خبر مت رکھا کرو ورنہ تمہاری نواب صاحب سے شکایت کردوں گا۔“ میں نے اس کی جانب پلٹ کر نروٹھے لہجے میں کہا۔

”ارے یار میں تو مذاق کررہا تھا تم تو برا ہی مان گئے۔“ اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

”میرا اور تمہارا اس قسم کا کوئی مذاق نہیں ہے اپنے کام سے کام رکھو سمجھے۔“ میں نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

”ارے یار تم تو بڑے روکھے ہورہے ہو۔“ اس نے عجیب سا منہ بنا کر کہا۔

”اچھا باہر جاؤ مجھے کپڑے چینج کرنے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے عجیب سے انداز میں دیکھتا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ ”وقت وقت کی بات ہے بھئی آج تمہارا ستارہ اونچا ہے۔“

جب تک میرا سلمان سے مطلب رہا میں اس سے خوشامد سے ملا لیکن اب مجھے اس کی خوشامد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت فری ہونے لگا تھا اس لیے میں نے اس انداز اور لہجے میں اس سے بات کی۔

سلمان سے میں نے چائے اور ناشتے کے لیے کہا تھا میرے اس برے رویے اور انداز کے باوجود اس نے یقیناً ناشتے کے لیے کہہ دیا ہوگا میں ڈریس اپ ہوکر تیار ہوا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔

”آجاؤ......!“ میں نے کہا تو ایک ملازم ناشتے کی ٹرالی لیے اندر آگیا۔ اگر یہ نہ آتا تو میں اسی وقت نواب سے ملنے کے لیے نکل جاتا لیکن اب ناشتہ آہی گیا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے ناشتا کرلیا جائے رات کا کھانا میں نے بہت لائٹ لیا تھا یعنی صرف سلاد پر ہی گزارہ کیا تھا میں نے ٹرالی اپنی جانب کھسکائی کیتلی سے چائے نکالی اور بوائل انڈوں کی سفیدی کھائی ایک سلائس بالکل سادہ چائے کے ساتھ لیا۔ یہی میرا ناشتہ ہوتا تھا بچپن میں اماں کے ہاتھ کے پراٹھے ناشتے میں کھائے تھے لیکن جب سے تعلیم کے لیے پنڈی شفٹ ہوا تھا میرا یہی ناشتہ تھا۔

میں جانتا تھا کہ میری یہ تاخیر نواب کو بہت گراں گزررہی ہوگی لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اچھا ہے غصہ کرے اپنا بلڈ پریشر بڑھائے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ میرے اوپر ناراض ہوگا اس کے ناراض ہونے پر میرا تو کچھ نقصان نہیں ہے غصہ میری کمزوری تھی اور آج سے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ شیطان کے اس ہتھیار کو اپنے اوپر آزمانے کا موقع نہیں دوں گا۔

اطمینان سے ناشتہ کرنے کے بعد میں ٹہلتا ہوا اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا نواب کے کمرے کی جانب چل دیا۔ ساری راہ داریاں سنسان پڑی تھیں نواب کی موجودگی میں ہر کوئی الرٹ ہی رہتا تھا اس لیے مجھے باہر سوائے گارڈز کے کوئی اور دکھائی نہیں دیا کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں اپنی جیکٹ پہننا نہیں بھولا تھا۔ جس کی جیب میں ڈیجیٹل کیمرہ موجود تھا۔ میں چاہتا تو کیمرہ ہاتھ میں لے کر بھی جاسکتا تھا لیکن میں نے دانستہ طور پر ایسا نہیں کیا کیمرہ جیکٹ کی جیب میں ہی رہنے دیا اور خالی ہاتھوں کے ساتھ نواب سے ملنے گیا۔

نواب کی فطرت کو جس حد تک بھی میں جان سکا تھا اس سے میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے کیا سوال کرے گا اور میں نے خود ہی سے اس کا بہترین جواب بھی تلاش کرلیا تھا میں نواب کا اعتماد اس حد تک جیتنا چاہتا تھا کہ وہ حقیقت میں مجھ پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کرے اور یہی صورت تھی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوسکتا تھا۔

میں نے نواب کے بند کمرے کے دروازے پر اپنے مخصوص انداز میں انگلی سے ناک کی وہ میری دستک پہچانتا تھا اس لیے اس کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

”کم آن شہروز......“

میں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا......وہ لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھ رہا تھا یا کام کررہا تھا میری جانب دیکھے بنا اس نے لیپ ٹاپ پر نگاہیں جماتے ہوئے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا تو میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ دو تین منٹ تک لیپ ٹاپ پر مصروف رہا۔ پھر اسے بند کرکے میری جانب متوجہ ہوا اور بولا۔

”ہاں شہروز کیا خبر ہے؟“

”خبر آپ کی توقع کے عین مطابق ہے سر!“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”واقعی۔“ اس نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

”آپ نے مجھ پر اعتماد کرکے یہ کام میرے سپرد کیا تھا تو پھر بھلا ایسے کیسے ہوسکتا تھا کہ آپ کی حسب منشاء کام نہ ہوا اور آپ نے یقیناً اب تک مجھے اتنا تو جان لیا ہوگا کہ چاہے شہروز کی جان چلی جائے شہروز اپنے وعدے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔“ میں نے بہت متانت سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

”یہ بتاؤ تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ اس نے اپنی تیز اور عقابی نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑ کر پوچھا۔

”کام میں تو مسئلہ نہیں ہوا لیکن واپسی میں تھوڑا سا مسئلہ ہوگیا تھا کچھ لوگوں سے مار اماری ہوگئی اور کنیز زخمی ہوگئی......پھر شاید وہ اپنے ہی بندے تھے جنہوں نے مجھے وہاں سے نکل جانے کے لیے کہا اس لیے میں کنیز کو زخمی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے خیریت سے واپس آگیا۔“

”اوہ! اچھا۔“ اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں جنہوں نے تمہارا راستہ روک کر تم سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی۔“ اس نے بڑی معصومیت اور فکر مندی کے لہجے میں پوچھا۔

جب وہ مجھے احمق سمجھ کر بے وقوف بنا رہا تھا تو میں کیوں پیچھے رہتا اس لیے میں نے بھی بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”میرے خیال میں وہ اس علاقے کے گارڈز تھے اور شاید ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں میری ان پر نگاہ نہیں پڑی اور ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا حالانکہ میں نے باہر آتے ہوئے چاروں جانب دیکھ کر ہی گیٹ سے باہر قدم نکالے تھے۔“

”ہوں! ایسا ہوسکتا ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلائی پھر بولا۔

”لاؤ ذرا دکھاؤ تو سہی ہم بھی تمہاری کارگزاری دیکھیں......!“ اس نے کہا تو میں نے کھڑے ہوکر جیکٹ کی جیب کی زپ کھولی اور اس میں سے کیمرہ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے میرے ہاتھ سے کیمرہ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اتنی احتیاط کی کیا ضرورت تھی تم تو کوٹھی میں ہو......ہاتھ میں بھی کیمرہ لے کر آسکتے تھے۔“

”بالکل لاسکتا تھا۔“ میں نے اس مرتبہ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”میں آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا میرے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ میں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں

کہ ہمیں دیکھنے والی ہر آنکھ دوستی کی آنکھ نہیں ہوتی کون کس وقت کسی لالچ میں آ کر پینترہ بدل جائے ہمیں کیا معلوم اس کا حل صرف اور صرف حد درجہ احتیاط ہے سر' اس بند کمرے میں صرف میں اور آپ' تیسری وہ کنیز تھی۔ ارے ہاں اس کا کچھ پتہ چلا اس کا کیا حال ہے۔" آخری جملہ میں نے اس طرح ادا کیا جیسے اچانک مجھے کنیز کا خیال آ گیا۔

"بس یوں سمجھو کہ اس کے گواہ اب صرف تم ہو' کنیز اس دنیا میں نہیں رہی۔ اس وقت اس کی لاش پولیس کے مردہ خانے میں موجود ہے اور ایک دو دن میں لاوارث سمجھ کر دفنا دی جائے گی۔"

نواب کے چہرے اور آنکھوں سے اس وقت اس کے اندر کی تمام تر خباثت اور مکاری پوری طرح عیاں تھی۔

"چلیں یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔" میں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اندر سے میرا دل اس کی اس موت پر افسردہ تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ کنیز کی موت ہمارے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔" نواب نے میری آنکھوں کے ذریعے میرے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل سر!" میں نے اعتماد سے کہا۔

"تو تم نے اسے اپنے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہلاک کر دیا۔" اس نے پوچھا۔

"آپ نے مجھے اس کام کا حکم نہیں دیا تھا۔" میں نے نگاہیں اور سر جھکا کر کسی تابعدار غلام کی طرح کہا۔

وہ میرے جواب سے بہت خوش ہوا اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"بیٹھو!"

میں بیٹھ گیا تو وہ کیمرہ آن کر کے تصاویر دیکھنے لگا۔ تصویریں دیکھ کر تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے میرے قریب آ کر میرے کندھے پر تھپکی دی بولا۔ "ویل ڈن شہروز!"

"تھینک یو سر!" میں نے نیاز مندی سے سر... کر کہا۔

"یار تم منہ سے انعام مانگو...... جو مانگو گے... گا۔" اس نے ترنگ میں کہا۔

"میرا انعام تو ابھی آپ نے دے دیا... سر...... آپ کے منہ سے نکلے ہوئے "ویل ڈن"... الفاظ ہی میرا سب سے بڑا انعام ہیں...... اس... علاوہ مجھے کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے۔" ... نے کہا تو وہ مزید ہنسنے لگا۔ پھر میز کی دراز کھینچی... میں سے چیک بک نکالی اور اس کو لکھ کر میری جا... بڑھا دیا اور بولا۔ "یہ رکھ لو۔ انسان کی ہزار... ضروریات ہوتی ہیں اور کچھ بولو۔"

"تھینک یو سر! یہ بھی آپ کی عنایت اور نواز... ہے ورنہ میں تو سر تا پا آپ کا خادم ہوں۔" میں... چیک لے کر جیب میں بناء دیکھے رکھتے ہوئے ا... دل میں گالی دی۔

"تم مجھے بہت پسند ہو شہروز! یقین جانو... دوسرے لوگوں پر بہت کم اعتماد کرتا ہوں اور انہیں پ... کرتا ہوں اور تمہاری تو میں دل سے قدر کرتا ہوں... ویسے آج کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟" اس نے... لہجے میں کہا۔

"جو آپ کا حکم ہو سر!" میں نے کہا۔

"یار جوان آدمی ہو۔ ذرا اپنا دل بہلاؤ کام تو... تو تمہیں ہی یاد کریں گے۔" اس نے دوستانہ لہجے... کہا تو میں سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ آج تک کوئی دل کو بھائی بھی یا... یوں ہی کورا ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں سر! میری لائف میں ان خرافات کا نام...

ہے۔ میں کسی ایک سے دل لگانے کا قائل نہیں ہوں بس وقتی ضرورت کے طور پر جو اچھی لگ جائے اور بس اتنی ہی دیر کے لیے۔ اس کے بعد میں اس چہرے ہی کو بھلا دیتا ہوں۔" میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔

"گڈ! مجھے تمہاری یہ ادا بھی پسند آئی۔" بھنورا صفت نواب نے میرا جواب سن کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

"میری دسترس میں کچھ انمول ہیرے ہیں تمہیں بھی دوں گا۔"

نواب کی بات سن کر میں نے ندیدوں کی طرح دانت نکال دیئے۔ نواب ہنس پڑا اور بولا۔

"تمہارے ذمے ایک اور کام لگا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ میری ای میلز چیک کرو۔ جو ضروری ہوں ان کے بارے میں مجھے بتاؤ اور مجھ سے پوچھ کر جواب میل کر دو اس کے علاوہ ابھی تک میری بیٹی کی موت کے تعزیتی میلز بھی آ رہی ہیں تم ان کے شکریے کے جوابات دے دو۔"

"ٹھیک ہے سر! میں یہ کام کر لیتا ہوں' لیکن یہ کام اپنے کمرے میں کروں یا یہیں بیٹھ کر۔" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم یہیں یہ میلز دیکھو پھر مجھے بتانا اور اس سلسلے میں بھی میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں۔"

اس نے تیز نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

"آپ کا خادم ہوں سر! آپ بے فکر رہیں۔" میں نے سر جھکا کر کہا' پھر اس کا آئی ڈی ایڈریس پوچھا اور میلز دیکھنے لگا۔

میں لیپ ٹاپ پر میلز دیکھ رہا تھا اور نواب اتنی دیر میں اپنے روم میں موجود الماری میں گھسا کچھ کرتا رہا' شاید وہ الماری کے کسی خفیہ خانے میں کیمرے کو محفوظ کر رہا تھا' اس کام سے فارغ ہو کر وہ بیڈ پر لیٹ گیا اور بولا۔

"کل رات بھر جاگتا رہا ہوں' سر بھاری ہو رہا ہے اور لگتا ہے بی پی بھی بڑھا ہوا ہے۔"

"رات بھر جاگنے والی بات پر میں نے کچھ نہیں کہا البتہ بی پی کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کیا اور اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی نبض چیک کی اور کہا۔

"آپ کی نبض تیز چل رہی ہے۔ آپ زیادہ اسٹریس مت لیا کریں۔ اسٹریس آپ کی صحت کے لیے بہت خطرناک ہے مجھے لگتا ہے کہ آپ کا بی پی کافی زیادہ ہائی ہے۔ آپ نے میڈیسن لی۔" میں نے اسے فکر اور تشویش میں مزید مبتلا کر دیا۔

"ہاں لی تھی۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا پھر میں نے اس کی دوائیں چیک کیں' دوائیں تو وہ ٹھیک لے رہا تھا' میں نے اطمینان کا اظہار کیا اور ایک بار پھر لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس کی میلز پڑھنا شروع کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ اس سے کتنے اور کس طرح کے کام نکلواتے ہیں۔ بہت سی میلز ایسی تھیں اور ان لوگوں کی جانب سے تھیں کہ میں ان کے نام اور کام پڑھ کر بری طرح چونک گیا۔ لیکن میں نے اپنے چہرے سے اس بات کا اندازہ نہیں ہونے دیا۔

ہر میل اور ہر مسئلے کے آخر میں میل کرنے والے نے لکھا تھا۔ "سائیں آپ کی دعا سے ہمارا یہ کام ہو جائے تو بندہ دل سے ممنون ہو گا اور نذرانہ لے کر خود آپ کے در پر حاضری دوں گا۔"

میں نواب کے بارے میں اب بہت اچھی طرح سے جان چکا تھا' کہ لوگوں کے کام کس طرح "پیر سائیں" کی "دعاؤں" سے نکلتے ہیں' ان دعاؤں کو پورا کرنے کے لیے ہم جیسے موکل جو پیر سائیں

کے پاس موجود ہیں۔ وہ لوگ جو نواب صاحب کو پیر سائیں سمجھ کر اعتماد کرتے ہیں وہ اپنے کام ہونے پر بڑے بڑے نذرانے اس کی نذر کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس کا اعتماد مزید بڑھ جاتا ہے۔

لاتعداد میلز اس کی بیٹی کی موت کی تعزیت کے لیے تھیں۔ اس کا یہ ای میل ایڈریس عام تھا اور کوئی بھی اپنے مسئلے کے حل کے لیے پیر سائیں سے میل کے ذریعے رابطہ کرسکتا تھا۔

میں تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں تک لیپ ٹاپ پر مصروف رہا اور جوابات دیتا رہا' بہت سی اہم میلز اسے پڑھ کر سنائیں اور کچھ خاص لوگوں کی خاص خاص میلز کو میں نواب کے کہنے پر Save کرتا رہا' باقی تعزیتی میلز ڈیلیٹ کردیں۔

اس کام سے فارغ ہوا تو نواب نے کہا۔ ''میرا خیال ہے شہروز کہ تم کچھ دنوں کے لیے میری کوٹھی سے کہیں اور شفٹ ہوجاؤ اور باہر مت نکلنا اور کوئی نہیں تو عرفان رسول اس کی بیوی اور ملازم تمہاری صورت سے آشنا ہوچکے ہیں۔ ویسے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن احتیاط کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''بہت بہتر ہے سر! یہاں ملیر میں' میری ایک رشتے کی خالہ موجود ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں وہاں چلا جاؤں' کچھ دن رہ کر واپس آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا وہاں جانا بہتر رہے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں سر! وہ ایک غریب خاتون ہیں' بیمار بھی ہیں۔ کوئی اولاد نہیں ہے۔ اچھا ہے کچھ پیسوں سے ان کی مدد کردوں گا تو وہ خوش ہوجائیں گی۔ دو چار دن میں میں واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی میں چہرے پر تھوڑا میک اپ کرکے ٹیکسی یا رکشے سے ان کے گھر جاؤں گا تاکہ انہیں مجھ پر کسی بھی قسم کا کوئی شک وشبہ نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے چلے جاؤ لیکن اپنا فون آن رکھنا' میں کسی بھی وقت تم سے رابطہ کرسکتا ہوں۔'' نواب صاحب نے کہا تو میں اس کے روم سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے باہر ہی الرٹ اسلحہ بردار گارڈ ٹہل رہا تھا اور اس راہ داری میں بھی مزید دو گارڈ چہل قدمی میں مصروف تھے۔

اف موت کا یہ خوف بظاہر دبنگ اور اندر سے نہایت خوف زدہ' مٹی کے شیر نواب کے اوپر دل ہی دل میں ہنستا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

دروازہ لاک کرکے میں نے سرمئی کا سیل فون نمبر ملایا میری دوسری بیل پر اس نے فون ریسیو کرلیا اور خوش دلی سے مجھ سے بات کی۔

میں نے سرمئی سے کہا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں اس کے گھر آنا چاہتا ہوں تاکہ آنٹی سے بھی ملاقات ہوجائے...... ان سے بھی مجھے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں تو اس نے کہا کہ کیا ضروری بات کرنی ہے تو میں نے کہا کہ ان کے شوہر کے بارے میں بہت سی باتیں میرے علم میں آئی ہیں وہ انہیں بتانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنا ایڈریس مجھے سمجھادیں۔ تو اس نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد مجھے اپنا ایڈریس سمجھادیا اور کہا کہ میں شام چار بجے اس کے گھر پہنچوں کیونکہ اس وقت وہ اپنے نیوز چینل پر ہے' میں نے بہت شکریہ ادا کرکے فون بند کردیا اور اس کا نمبر ڈیلیٹ کردیا۔

میں نواب کا دیا ہوا چیک بینک میں جمع کرانا چاہتا تھا' اس لیے بڑے اطمینان سے کوٹھی سے نکلا میں نے کوٹھی میں کھڑی گاڑیوں میں سے کوئی گاڑی نہیں لی اور ایک ٹیکسی کرکے بینک پہنچا اور چیک جمع کروایا۔ کچھ رقم نکلوائی بھی۔ میں وہ رقم آنٹی کو دینا

چاہتا تھا' سرمئی کے گھر میں نے انہیں اس کا زبردستی کا مہمان بنایا تھا اور پھر میں اپنے معاملات میں اس طرح پھنسا کہ ان کی خبر بھی نہ لی۔

نواب کی ای میلز چیک کرتے ہوئے اور ان کے جوابات دیتے ہوئے میرے ذہن میں نواب کی اسٹریس کو بڑھانے کا زبردست آئیڈیا آیا تھا جو میں ان سے شیئرز کرنا چاہتا تھا' سرمئی بھی بنیادی طور پر ایک اچھی لڑکی تھی' اس لیے اس نے مجھ سے آنٹی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

بینک سے باہر نکل کر میں ایک ریسٹورنٹ میں گیا اور کھانا کھایا' دراصل میں ٹائم پاس کررہا تھا۔ تین بجتے ہی میں ریسٹورنٹ سے نکلا...... اور پھر دو ٹیکسیاں کرکے شاہ فیصل کالونی جا پہنچا۔ میں ٹیکسی سے اس کے گھر سے خاصا دور اترا تھا' پھر شمع شاپنگ سینٹر میں گھس گیا...... یہ سب میں اس لیے بھی کررہا تھا کہ اگر نواب کا کوئی بندہ مجھے واچ کر بھی رہا ہوگا تو اسے میری حرکات مشکوک نہیں لگیں گی۔

میں پیدل ہی بے پروا انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے من موجی انداز میں چلا جارہا تھا' اس وقت مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جو مجھے واچ کررہا ہو۔

جس وقت میں نے سرمئی کے گیٹ پر پہنچ کر کال بیل پر انگلی رکھی' ساڑھے چار کا ٹائم ہورہا تھا' میں نے سرسری انداز میں اس گھر کا جائزہ لیا' وہ دو سو گز کا ایک دو منزلہ مکان تھا' آگے ایک چھوٹا سا گارڈن تھا' جس میں امرود' آم اور جامن کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔

بیل بجانے کے بعد میں اطمینان سے کھڑا ہوگیا۔ تب ہی باہر لگے انٹر کام کے اسپیکر پر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

''شہروز!'' میں نے چاروں جانب گردن گھماتے ہوئے اسپیکر کے قریب ہوکر جواب دیا۔

''ون منٹ پلیز......'' اس نے جواب دیا' اب میں سمجھا کہ یہ سرمئی کی آواز تھی' پھر چند لمحوں کے بعد قدموں کی آواز آئی اور گیٹ کھل گیا۔ میرے سامنے ایک بائیس تئیس سال کا لڑکا کھڑا تھا۔

''اندر تشریف لے آیئے۔'' اس نے تیزی سے کہا اور مجھے گیٹ سے ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیا تو میں اندر داخل ہوگیا اور اس سے پوچھا۔

''سرمئی صاحبہ تشریف رکھتی ہیں؟''

''جی ہاں باجی موجود ہیں۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ملازم لڑکا ہے' اس نے مجھے اندر ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا اور خود اندر چلا گیا۔

ذرا دیر کے انتظار کے بعد کمرے میں آنٹی اور سرمئی ایک ساتھ داخل ہوئیں تو میں احتراماً اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے بہت شفقت سے میرے سلام کا جواب دیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا...... سرمئی نے مجھے سلام کیا۔

میں نے آنٹی کو دیکھا ان کی صحت پہلے سے بہت شاندار دکھائی دے رہی تھی اور وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ہی مجھے ایک احساس ہوا اور میں چونک پڑا۔

مجھے آنٹی اور سرمئی کی شکل میں اتنی زیادہ مماثلت دکھائی دی کہ مجھے ایسا لگا جیسے سرمئی کی شکل میں' میں آنٹی کی جوانی دیکھ رہا ہوں۔

دونوں نے میرے چہرے پر پھیلی حیرت اور استعجاب کو محسوس کرلیا' تب سرمئی بولی۔

''شہروز صاحب میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ انجانے میں' آپ نے میرے اوپر ایک اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اگر میں آپ کا یہ احسان اتارنا بھی چاہوں تو کبھی نہیں اتار سکوں گی۔''

''مطلب......!'' میں نے سرمئی کے الفاظ سے

بہت کچھ سمجھ لیا اور چاہتا تھا کہ وہ خود اپنے منہ سے مجھے وہ خوش گوار حقیقت بتائے۔

''مطلب یہ کہ آپ نے جس خاتون کو امانتاً میری پناہ میں دیا تھا' وہ میری گمشدہ ماں نکلیں۔ اگر آپ اس روز مجھے نہ ملتے اور امی کو میرے حوالے نہ کرتے تو شاید زندگی بھر میں ان کے لیے ترستی رہتی اور کبھی تلاش نہ کر پاتی۔

''واقعی......'' میں نے یہ جان کر کہ سرمئی آنٹی کی وہ بیٹی ہے جسے وہ برسوں پہلے کسی کے حوالے کر آئی تھیں اور اب تو اس کے ملنے کی آس بھی نہیں تھی' میرے ذریعے انہیں مل جائے گی' بے پناہ دلی مسرت ہوئی' شاید قدرت کو ہی ان کا یہ ملاپ منظور تھا اور اس نے مجھے ذریعہ بنا دیا اور شاید اب وقت آ گیا تھا کہ اس موذی سانپ کا سر کچل دیا جائے' جس نے ایک نیک نامی کا لبادہ شیطانی چہرے پر اوڑھا ہوا تھا۔

''آپ دونوں کو یہ ملاپ بہت بہت مبارک ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے یہ جان کر کتنی مسرت ہوئی ہے کہ آپ کو آپ کی بیٹی مل گئی۔'' میں نے کہا اور آنٹی کے لیے لایا ہوا تحفہ ان کی نذر کیا۔

پھر ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں نے سرمئی سے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نواب سطوت آپ کے والد ہیں۔''

''ہوں گے' لیکن میں انہیں اپنا باپ کہہ کر باپ جیسے پیارے اور پاکیزہ رشتے کی توہین نہیں کر سکتی۔'' سرمئی نے انتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے سرمئی کے جذبے کو سراہا اور کہا۔ ''میں ایک بہت اہم بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا باس کون ہے؟ میں نواب کے لیے ناجائز کام کرتا ہوں اور اس کی کلفٹن والی کوٹھی میں رہتا ہوں۔'' میرا یہ انکشاف سن کر دونوں بری طرح چونک گئیں۔ ذرا دیر کے لیے کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ پھر اس سناٹے کو آنٹی نے توڑا۔

''پھر تو بیٹا تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم نے یہاں آ کر بہت بڑا رسک لیا ہے اور ہمیں بھی خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔'' آنٹی نے گہری فکر اور تشویش سے کہا۔

''ہاں مجھے بھی اس بات کا احساس اب ہو رہا ہے' ویسے آپ بے فکر رہیں آپ کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں ہے' میں نواب کو یہ بتا کے آیا ہوں کہ میں اپنی ایک رشتے کی خالہ سے ملنے کے لیے جا رہا ہوں اور رات ایک واردات کے بعد نواب نے مجھے خود چند دنوں کے لیے روپوش رہنے کے لیے کہا ہے۔''

''واردات......کون سی واردات۔؟'' سرمئی نے چونک کر کہا تو میں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

اور پھر میں نے عرفان رسول کے بنگلے پر اور اس کے ادارے ''مسکن'' پر ہونے والے حملے کی ساری روداد اسے سنا دی۔

وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے میری بات سنتی رہی اور بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ عرفان صاحب کے بنگلے پر آپ نے واردات کی تھی لیکن یہ بتائیں کہ وہاں آپ کس لیے گئے تھے اور آپ کے ساتھ وہ لڑکی کون تھی؟''

میں آنٹی کے سامنے سرمئی کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا تو سرمئی نے بے چینی سے کہا۔

''کیا بات ہے شہروز صاحب آپ خاموش کیوں ہو گئے؟ بتائیں ناں' یہ تو ایک معمہ ہے اور مجھے اس کا جواب جاننے کی بہت بے چینی ہے۔''

''وہ دراصل میں آنٹی کے سامنے وہ بات نہیں کر سکتا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ وری! آپ امی کے سامنے ہر بات بلاجھجک کر سکتے ہیں' انہیں بھی ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔'' سرمئی نے کہا تو میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ساری بات بتا دی......

''اوہ آئی سی......یعنی بلیک میلنگ......!'' سرمئی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی اور اس نے پرجوش انداز میں کہا۔

پھر ہم نے دیر تک بیٹھ کر اس سارے معاملے کا تجزیہ کیا اور پھر ساری بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ پھر میں نے کچھ ای میلز کا بھی ذکر کیا جو میں نے تھوڑی دیر قبل پڑھیں تھیں۔ سرمئی بہت زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی' وہ سب باتیں جو وہ جاننا چاہتی تھی اسے میرے ذریعے ان باتوں کا علم ہو رہا تھا۔ میں نے سرمئی سے یہ بھی کہا کہ میں ایک دو دن آپ کے گھر قیام کرنا چاہتا ہوں' اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اس نے بہت خوش دلی سے مجھے آفر کر دی۔

پتہ نہیں کیوں اس پیاری سی لڑکی کو دیکھ کر مجھے بار بار اپنی بہن فائزہ کی یاد آ رہی تھی' میرا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے فائزہ کہہ کر پکاروں۔ لیکن میں اپنی اس خواہش کو اپنے دل میں دبا کر بیٹھ گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ہم دوبارہ بیٹھے تو سرمئی نے مجھ سے کہا۔ ''شہروز بھائی اگر میں آپ سے ایک بات پوچھوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''نہیں بالکل نہیں......تم بالکل میرے لیے چھوٹی بہنوں کی طرح ہو' تمہارے دل میں جو بھی سوال آ رہا ہے تم بلا کھٹکے مجھ سے کر سکتی ہو۔'' میں نے صاف دلی سے کہا تو اس نے پوچھا۔

''آپ نواب سطوت جیسے انسان کے چنگل میں کیسے پھنس گئے۔ کیوں کہ بظاہر تو آپ ایسے دکھائی نہیں دیتے کہ آپ وہ سارے کرائمز اپنے دل کی خوشی سے کریں' یا وہ کیا مجبوری تھی جو آپ کو یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔''

سرمئی کی بات سن کر میں سوچنے لگا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں' چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔

''میرا اصل نام شہروز نہیں' بلکہ ڈاکٹر شاہ زمان ہے۔''

''ڈاکٹر!'' اس نے شدید استعجاب سے دہرایا۔

''ہاں ڈاکٹر! میں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی ہے اور میں پنڈی کے ہاسپٹل میں جاب کرتا تھا۔ نتھیا گلی میں میرا گھر تھا' جہاں اماں تھیں بابا تھے' ارمان تھا اور میری ننھی اور گڑیا سی بہن فائزہ تھی۔'' اتنا کہہ کر میں رک گیا۔ ان سب کی یاد اتنی شدت سے آئی کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز بھرا گئی۔

''پھر......پھر......'' وہ ایکسائٹمنٹ میں مزید میرے قریب کھسک آئی۔

پھر میں نے شروع سے اپنی ساری داستان اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ سارے حالات و واقعات پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیئے' صرف غیر ضروری باتیں حذف کر دیں' جیسے نتھیا گلی میں شیر افضل کی بیٹی شہزادی کا قصہ میں گول کر گیا۔

میں خاموش ہوا تو آنٹی اور سرمئی دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ماحول میں بہت گمبھیر سنجیدگی چھا گئی۔

''شہروز بھائی! نہیں شاہ زمان بھائی! میں آپ کو شہروز نہیں شاہ زمان کہوں گی......آج سے آپ مجھے فائزہ سمجھ سکتے ہیں۔'' سرمئی نے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے سرمئی تمہیں دیکھ کر میرا شدت سے دل چاہا تھا کہ میں تمہیں فائزہ کہہ کر پکاروں' لیکن میں دل میں ہی اپنی یہ خواہش دبا کر رہ گیا لیکن

اب تم نے اجازت دی ہے تو میں اللہ کو گواہ بنا کر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم میرے لیے میری مرحومہ بہن فائزہ سے بھی بڑھ کر قابل عزت واحترام ہو۔" میں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بہت شکریہ بھائی! میری زندگی میں ایک بھائی کی کمی تھی جو آپ نے پوری کردی۔" اس نے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا پھر بولی۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے' آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

پھر میں نے اسے اپنے ارادوں کے بارے میں بتایا اور اس خیال کا بھی اظہار کیا جو ای میل دیکھ کر میرے ذہن میں آیا تھا' میرا آئیڈیا سن کر وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ آنٹی کو بھی میرا آئیڈیا بہت پسند آیا۔

رات بہت زیادہ ہوگئی تھی اور ہم باتوں میں مصروف تھے' دو مرتبہ سرمئی کے سیل فون پر کال آئی اور وہ اسے اٹینڈ کر کے جلد ہی میرے پاس لوٹ آئی' پھر بولی۔

"شاہ زمان بھائی میں کل آپ کو کسی سے ملوانا چاہتی ہوں' آپ ملیں گے۔؟"

"کون ہے گڑیا۔؟" میں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہے کوئی!" اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوگیا کہ وہ کون ہوسکتا ہے' اس لیے مسکرا کر خاموش رہا۔

آدھی رات کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹے اس دن آنٹی سرمئی کے کمرے میں لیٹیں اور اپنا روم انہوں نے میرے لیے خالی کردیا' میں ان دونوں افراد یعنی شمسو بابا اور اماں حمیدہ سے بھی ملا جن کی سرمئی کی زندگی میں ایک خاص اہمیت تھی۔

اگلے دن صبح نو بجے سرمئی اپنے نیوز چینل چلی گئی' میں نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ ابھی وہ عرفان رسول کے حوالے سے کسی بات کا کسی سے بھی ذکر نہ کرے۔ سرمئی ہی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ عرفان رسول کے "مسکن" پر حملہ بھی نواب سطوت ہی کی کارستانی ہے۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ اس نے اپنے لیے کیا تھا یا اپنے کسی کے لیے "دعا" کی تھی۔ اتنے بڑے کام کا معاوضہ بھی یقیناً اسے بہت تگڑا ملا ہوگا۔ سرمئی نے مجھے عرفان رسول کی تشویش ناک حالت کے بارے میں بھی بتایا' اور اس سلسلے میں' میں بے حد شرمندگی اور ندامت محسوس کررہا تھا اور میں نے دل سے دعا کی کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہوجائیں۔

سارا دن میں نے روشن آنٹی کے ساتھ گزارہ۔ وہ مجھ سے اور میں ان سے اپنے دل کی باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے' کیونکہ ہمارا دشمن ایک تھا' اور اس دشمن کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ہمارا عزم بھی ایک ہی تھا۔

شام کو سرمئی آگئی' میں نے اس سے پوچھا کہ کچھ عرفان رسول کی خبر ملی کہ اب ان کا کیا حال ہے تو اس نے یہ خوش خبری سنائی کہ "ہاں خبر ملی ہے کہ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور وہ ہوش میں آگئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹرز نے ابھی بھی پولیس کو ان سے ملنے نہیں دیا ہے۔ شاید اس کام میں بھی مزید ایک یا دو دن لگ جائیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ پولیس کو بتادیں گے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے سرمئی سے پوچھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ اس بات کا چرچا بالکل نہیں کریں گے' کیونکہ یہ ایک بہت ہی شرمناک بات ہے۔ اور پھر بقول آپ کے کہ جب آپ ان کی تصاویر لے رہے تھے تو ان کی بیگم بھی بے ہوش تھیں۔ تو یہ بات سوائے ان کے یا آپ لوگوں کے کسی کو بھی نہیں معلوم۔ اب نواب سطوت کسی طرح سے انہیں بلیک میل کرے گا یہ بات بھی وہ کسی سے شیئر نہیں کریں گے لیکن میرا خیال ہے۔" اس نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ "شاید انکل کو وہ یہ راز بتادیں۔"

"انکل! یہ کون ہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ نے سینئر صحافی جناب طلال واحدی صاحب کا نام سنا ہے۔" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں شاید...... ایک دو مرتبہ میں نے ٹی وی پر ان کا حالات حاضرہ پر تبصرہ سنا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"انہوں نے مجھے بیٹی بنایا ہوا ہے اور میرے ان سے گھریلو ٹرمز ہیں۔ بلکہ آج رات میں نے حشام اور انکل کو تم سے ملوانے کے لیے گھر پر بلایا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ میرے بارے میں کسی کو بھی نہ بتانا تو پھر بھی تم نے......" میں نے قدرے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں شاہ زمان بھائی ان کی جانب سے آپ قطعی بے فکر رہیں۔ انکل اور حشام تو وہ ہستی ہیں کہ جن سے میں ہر بات شیئر کرتی ہوں' آپ کے علاوہ صرف ان لوگوں ہی کو معلوم ہے کہ نواب سطوت میرا باپ......!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اور شام کو حشام کی پوری فیملی مجھ سے ملنے کے لیے آئی' ان کی بیگم تو روشن آنٹی کے ساتھ اندر چلی گئیں' اور ڈرائنگ روم میں' میں طلال واحدی صاحب اور حشام اور سرمئی وہاں بیٹھے رہ گئے' اس سے پہلے چونکہ روشن آرا مجھے یہ بات بتا چکی تھیں کہ سرمئی کو انہوں نے "سرمئی بائی" کے حوالے کیا تھا اس لیے سرمئی نے مجھے منع کردیا تھا کہ میں طلال واحدی اور حشام کے آگے اس بات کا قطعی ذکر نہ کروں۔ مجھے سرمئی کی ذات کے متعلق گفتگو کرنی بھی نہیں تھی۔ ہماری گفتگو کا موضوع تو نواب سطوت کی ذات تھی۔

طلال واحدی اور حشام مجھ سے کرید کرید کر نواب کے متعلق ساری باتیں پوچھتے رہے اور میں انہیں جوابات دیتا رہا' اب نواب سطوت کی ذات ہمارے سامنے پوری طرح عیاں ہوگئی تھی۔

اس دوران نواب کا فون میرے پاس نہیں آیا' تقریباً دو تین دن کے قیام کے بعد میں وہاں سے چلا آیا لیکن وہاں سے چلتے ہوئے میں نے سرمئی کو خاص ہدایت کی کہ ای میل والا کام وہ اس وقت کرے جو وقت اور ٹائم میں اسے بتاؤں...... کیونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ سرمئی کی ای میل والا کام وہ اسوقت کرے جو وقت اور ٹائم میں اسے بتاؤں...... کیونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ سرمئی کی ای میل روشن آراء کی جانب سے اس وقت نواب کو ملے جب میں اس کے پاس موجود ہوں تا کہ اس کاری ایکشن اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔

بعد میں مجھے روشن آنٹی نے حشام اور سرمئی کے بارے میں بھی بتایا کہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ ان دونوں کی منگنی کردیں۔ مجھے یہ خبر سن کر بے حد مسرت ہوئی' میرے خیال میں وہ فیملی اور حشام جیسا لڑکا ہی سرمئی جیسی لڑکی کے لیے موزوں ہوسکتے تھے۔

تین دن سرمئی کے گھر گزارنے کے بعد جب میں کلفٹن میں واقع نواب کی کوٹھی پر پہنچا تو میرا دل ودماغ بہت فریش تھا' اپنی فیملی کو کھودینے کا دکھ کافی کم ہوگیا تھا' مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے مجھے میرے کھوئے ہوئے رشتے دوبارہ مل گئے ہوں۔ طلال واحدی صاحب' حشام' روشن آنٹی اور سرمئی۔ سب نے مجھے میرے کھوئے ہوئے رشتے دوبارہ لوٹا دیئے تھے۔ پہلے جو میں خود کو بھری دنیا میں تنہا سمجھ رہا تھا' اب وہ احساس قطعی نہیں تھا' میرے اندر ایک نیا عزم اور نیا

ولولہ تھا۔

کوٹھی کے باہر نواب کے سیکیورٹی گارڈ کی موجودگی یہ بتا رہی تھی کہ نواب کوٹھی میں موجود ہے۔ میں وہاں گیا تو نواب کو اس بات کی فوری اطلاع مل گئی۔ اور اس نے مجھے فوراً ہی بلوا لیا۔ وہ اپنے کمرِ خاص میں موجود تھا' میں جب اس سے ملنے کے لیے گیا تو وہ خاصا تھکا ہوا اور بیمار دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے سر آپ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے......کیسی طبیعت ہے؟" میں نے حددرجہ فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں......بی پی کنٹرول میں نہیں آ رہا......تم نہیں تھے تو میں نے ڈاکٹر اعتزاز فاروقی کو بلوایا تھا۔ وہ تو ضد کر رہے تھے کہ میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو جاؤں لیکن میں نے منع کر دیا کہ جو علاج کرنا ہے یہیں کر دو مجھے ہاسپٹل نہیں جانا ہے۔"

"کیا حرج تھا سر چلے جاتے ہاسپٹل' آپ کی صحت تو ٹھیک ہو جاتی۔" میں نے کہا۔

"تم اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہاں رہے ان دنوں۔" وہ ایک دم اپنی پرانی جون میں واپس آ گیا۔ اس کی تیز نگاہوں کی کاٹ نے مجھے لمحہ بھر میں بتا دیا کہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں شاہ فیصل کالونی کے کسی گھر میں تھا اس لیے تھوڑا سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا۔

"میں نے اپنی خالہ کو بہت تلاش کیا' ایک دو لوگوں سے ان کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے ایک اور رشتہ دار انہیں اپنے گھر شاہ فیصل کالونی میں لے کر آ گئی ہیں۔ تو میں وہیں چلا گیا تھا' جاتے ہوئے ان کے لیے ساڑھی بھی خرید لی' اور کچھ رقم بھی انہیں دے آیا' خوش ہو گئی بے چاری۔" میں نے بتایا تو نواب کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی اور نواب کی مسکراہٹ دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ نواب کے علم میں تھا کہ میں شاہ فیصل کالونی گیا ہوں لیکن مجھے حیرت اس اپنے تعاقب کرنے والے شخص پر ہو رہی تھی کہ وہ کوئی بہت ہی ہوشیار شخص تھا جس نے مجھے پتہ ہی نہیں لگنے دیا اور میرے پیچھے لگا رہا' بہرحال میں نے نواب کو یہ تھوڑا سا سچ بتا کر یقیناً مطمئن کر دیا تھا۔ اب یہ بات مجھے نہیں معلوم تھی کہ میری نگرانی مسلسل ہوئی یا نہیں اور یہ بھی کہ نواب کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ گھر مشہور نیوز رپورٹر سرمئی کا ہے۔

پھر میں نے اپنی سوچوں کو سر سے جھٹک دیا کہ کسی بھی مرحلے پر میں نے یہ محسوس کیا کہ نواب کو اس بات کی اطلاع ہے تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر یہ بات سرسری انداز میں اسے بتا دوں گا۔

"کیا سوچنے لگے؟" اس نے مجھے خاموش بیٹھے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں سر! آپ کی صحت کے بارے میں مجھے بڑی تشویش ہو رہی ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔" میں نے اپنے چہرے پر فکر و تردد کے آثار لاتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہنکاری بھری۔

"میری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ ہوا ہے کوئی خاص پریشانی۔" میں نے کہا۔

"ہنہ! پریشانی اور نواب سطوت کو ابھی کوئی ایسا پیدا ہی نہیں ہوا جو نواب سطوت کو پریشانی میں مبتلا کرے۔ ارے ہم تو بیٹھے ہی لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے ہیں۔" اس نے نہایت تمسخرانہ لہجے میں ہنہ کہا اور بولا۔

"آپ بجا ارشاد فرما رہے ہیں۔ بے شک ایسا ہی ہے' میں نے تو یہ صرف اس لیے کہا تھا کہ آپ کی طبیعت مجھے پہلے سے زیادہ خراب لگ رہی ہے۔" میں نے حددرجہ مودب لہجے میں کہا تو وہ فخریہ انداز میں مسکرانے لگا پھر بولا۔

"تم بھی کیا یاد کرو گے' ہم تمہیں ایک دن اپنی نشست میں اپنے ساتھ لے جائیں گے' پھر تم وہاں ہمارا جلوہ دیکھنا۔"

"نشست!" میں نے حیرت سے یہ لفظ دہرایا۔ "کیسی نشست؟"

"ہم مہینے میں ایک بار یعنی چاند کی تاریخ کی پہلی جمعرات کو نشست لگاتے ہیں' وہاں لوگ ہماری باتیں سننے کے لیے اور اپنے مسئلے مسائل کے حل کے لیے ہمارے پاس آتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اور یہ جو ای میلز کا سلسلہ ہے وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ای میلز ان لوگوں کی ہوتی ہیں' جو ہم تک نہیں پہنچ سکتے' بیرون ملک یا پاکستان ہی کے دوسرے شہروں کے لوگ ہوتے ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ سے غیر حاضر ہوتے ہوئے پاکستان میں موجود اپنے مسائل ہمارے ذریعے حل کروا سکیں۔" اس نے ایک گہری معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اگلا ایک ہفتہ مزید کوئی خاص کام نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی خاص بات ہوئی۔ میں بھی زیادہ تر یا تو نواب کی دیکھ بھال کرتا......اس کی ای میلز چیک کرتا اور جو اس کی ہدایت ہوتی ان کے جوابات دے دیتا۔

سرمئی سے البتہ میرا فون پر رابطہ رہا' اس نے مجھے عرفان رسول کے بارے میں بتایا کہ وہ اب کافی بہتر ہے اور اب وہ ہاسپٹل سے اپنے گھر میں شفٹ ہو گیا ہے' البتہ اس نے پولیس کو اس رات والے واقعے کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں بتایا کہ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کے گھر آنے والے وہ مرد اور عورت اس کے گھر کس لیے آئے تھے۔ وہ تو فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا اور جب اس کی بیوی اس کو دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی تو اس نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا' جس سے وہ بھی بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد ہاسپٹل میں اس کی آنکھ کھلی ہے اس کی بیوی بھی اس کے پاس ہے' اب گھر جا کر دیکھیں گے کہ گھر کی الماریوں سے کرنسی' گولڈ یا دوسرے اہم جائیداد کے کاغذات میں سے کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔

اس وقت تو پولیس خاموش ہو گئی۔ بعد میں ان کے گھر شفٹ ہونے کے بعد پولیس نے ایک بار پھر ان سے رابطہ کیا تو ان کی بیوی نے یہ بیان دیا کہ ان کی تجوری سے پیسے اور گولڈ غائب ہے' وہ شاید ان کے گھر ڈکیتی کی نیت سے داخل ہوئے تھے اور ڈاکہ ڈال کر چلے گئے۔

"ہاں وہ شرمناک حقیقت پولیس کو بتا ہی نہیں سکتے تھے انہیں ایسا ہی جواب دینا چاہیے تھا۔" میں نے شرمسار انداز میں کہا پھر سرمئی سے سوال کیا۔

"اور ان کے "مسکن" سے جو لڑکیاں اٹھائی گئی تھیں ان کا کوئی سراغ ملا یا نہیں۔" تو سرمئی نے جواب دیا۔

"ان کا سراغ کیسے ملے گا' وہ بچاریاں تو ایک بار اس عیاش شخص کے چنگل میں پھنس گئیں تو پھنس گئیں اب تو مر کر ہی جان چھوٹے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ان کی نچڑی ہوئی لاشیں پولیس کو کسی گندے نالے یا کسی پارک یا کسی ویران قبرستان سے مل جائیں۔"

"ہماری یہ پولیس بھی ناکارہ ہی ہے وہ ابھی تک ان کا سراغ نہیں لگا سکی۔" میں نے تپ کر کہا۔

"کیا بات کر رہے ہیں بھائی! ہماری پولیس اور ناکارہ۔ ایسا ہرگز نہیں ہے' پولیس کو اگر سراغ مل بھی گیا ہو گا تو ان کا منہ ڈھیر سارے نوٹوں کے ذریعے بند

کر دیا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو اس بات کا پورا یقین ہے کہ پولیس سب جانتی ہے لیکن وہ مجرموں تک پہنچے گی نہیں کیونکہ جب کتے کے آگے ہڈی ڈال دو تو وہ اسے بھنبھوڑنے میں لگ جاتا ہے اور ادھر ادھر نہیں دیکھتا اور نواب جیسے لوگ تو ہماری پولیس کو جیب میں لیے پھرتے ہیں۔" سرمئی کا لہجہ حد درجہ زہر آلود ہو رہا تھا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو سرمئی! بالکل ایسا ہی ہے۔" میں نے تاسف سے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا پھر کہا۔ "تم بتا رہی تھیں کہ عرفان رسول طلال انکل کے اچھے دوستوں میں سے ہیں تو وہ گئے ان سے ملنے میرا مطلب ہے ان کی مزاج پرسی کے لیے!" میں دراصل یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اگر طلال انکل عرفان رسول سے ملنے کے لیے گئے تھے تو کیا عرفان رسول نے انہیں وہ شرمناک بات بتا دی۔

"نہیں! ابھی تو وہ ان سے ملنے کے لیے نہیں جا سکے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹرز نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ وہ کسی سے بھی نہ ملیں۔ ورنہ ان کی مزاج پرسی کے لیے آنے والے لوگ ان کے لیے باعث زحمت بن سکتے ہیں۔ شاید ابھی اللہ تعالیٰ ان سے مزید نیکیوں کے کام کروانا چاہتا ہے اسی لیے اتنے سیریس ہارٹ اٹیک کے بعد بھی ان کی جان بچ گئی لیکن ابھی بھی وہ اتنے ٹھیک نہیں ہوئے ہیں کہ لوگوں سے مل سکیں۔ انہیں اتنے زبردست شاک سے باہر نکلنے میں کچھ وقت تو لگے گا اور ان کی سب سے بڑی ٹینشن یہ ہوگی کہ نواب ان کی تصاویر کو لے کر انہیں کس طرح بلیک میل کرے گا' کون سا کام ان سے لے گا' ویسے بھی اب تو انہوں نے اپنے گھر میں سیکیورٹی گارڈز رکھ لیے ہیں۔ اس احمق ملازم کو نکال دیا گیا ہے اور ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی سے کچھ گارڈز ہائر کیے ہیں۔" سرمئی نے مجھے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا پھر بولی۔ "بھائی میں نے اس کام کی پوری تیاری کر لی ہے جو آپ نے بتایا تھا' آپ نے جیسا کہا تھا میں نے ویسا ہی کیا ہے' اب یہ آپ کو بتانا ہے کہ مجھے وہ کب تھرو کرنا ہے۔"

"ہاں اب اس کام کا وقت بھی سمجھو آ ہی گیا ہے نواب کو ایک زبردست جھٹکا دیتے ہیں۔ مجھ سے بڑے تمسخرانہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ ایسا ابھی تک کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے جو مجھے ٹینشن دے سکے۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ب

"بھائی پھر کب؟" سرمئی نے بے صبر لہجے میں پوچھا۔

"صبر کرو گڑیا!" میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "کل جب وہ صبح اور دوپہر کو مجھے اپنے روم میں طلب کرے گا تو میں تمہیں کال کر کے بتا دوں گا۔ میرے کال کرنے کے دس پندرہ منٹ کے بعد تم وہ کام کرنا تاکہ میں اس کے پاس موجود ہوں۔"

"ٹھیک ہے بھائی میں بے صبری سے اس وقت کا اور اس کے بعد آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین رہوں گی کہ اس انکشاف کے بعد اس کی کیا حالت ہوتی ہے' آپ بھی مجھے زیادہ انتظار مت کروائیے گا۔" سرمئی نے کہا۔

"کال تو میں تمہیں جب کروں گا ناں جب اس کے پاس سے اپنے کمرے میں واپس آ جاؤں گا' انتظار تو تمہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے دھیمے سے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں یہ بات بھی ہے۔" اس نے ناچار کہا تو میں نے آنٹی اور حشام کی خیریت پوچھنے کے بعد فون بند کر دیا اور ساتھ ہی اس کا نمبر بھی ڈیلیٹ کرنا نہ بھولا۔

اگلی صبح کا تو میں بھی شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ نواب مجھے کب بلاتا ہے لیکن انتظار کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ میں نے جھنجلاہٹ میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا' ملازم کھانا لایا تو میں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔

تین بجے کے قریب وہ کال آ ہی گئی جس کا میں شدت سے انتظار کر رہا تھا' نواب نے مجھے فوراً اپنے روم میں بلوایا تھا' میں نے جانے سے پہلے سرمئی کو کال کی کہ میں نواب کے روم میں جا رہا ہوں تم دس پندرہ منٹ بعد وہ کام کرنا۔ سرمئی نے اوکے کہا اور میں نواب کے کمرے کی جانب چل دیا۔

میں اندر گیا تو وہ اپنی مخصوص شاہانہ کرسی پر براجمان تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑے پرجوش اور معنی خیز انداز میں بولا۔

"آؤ آؤ شہروز! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"خیریت ہے سر! کوئی خاص کام تھا۔" میں نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"بیٹھو۔" اس نے قریبی صوفے کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں بیٹھ گیا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک اپنے لبوں پر گہری اور معنی خیز مسکراہٹ سجائے میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تم تو بڑے چھپے رستم ہو یار! بڑے بڑے کام کر جاتے ہو اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔"

"کیا مطلب سر!" لمحے میں میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ اللہ جانے اسے کیا معلوم ہو گیا اور یہ کس بات کے بارے میں کہہ رہا ہے' کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے روشن آراء اور سرمئی کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو اس سے آگے مجھ سے سوچا نہ گیا کہ اگر ایسا ہوا ہے تو پھر میرے پاس کیا جواب ہوگا؟

"ارے یار تم تو پریشان ہو گئے' میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا ہرگز نہیں تھا' بس ایک نیوز دینی تھی تمہیں۔" اس نے نارمل لہجے میں کہا وہ میرے چہرے پر آئی پریشانی کے آثار بھانپ گیا تھا۔

"کیسی نیوز سر!" میں نے فوراً اپنے آپ کو نارمل کر کے مسکرا کر کہا۔

"تم باپ بننے والے ہو!" اس نے خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اس خبر کو سنتے ہی میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا کہ یہ کس کی بات کر رہا ہے۔

"اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میں تو مذاق کر رہا تھا' تم باپ بننے والے تھے لیکن اب سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"آپ کیا اور کس کی بات کر رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے' آپ کھل کے بتائیں گے۔" میں نے الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا' واقعی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہیں راکھی تو نہیں کیونکہ راکھی کے ساتھ میرے تعلقات!

"اچھا مذاق چھوڑو' میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم نتھیا گلی گئے تھے ناں!" اس نے نتھیا گلی کا نام لیا تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور شہزادی کی شکل فوراً میری آنکھوں کے سامنے آ گئی اور میں ساری بات سمجھ گیا' لیکن انجان بنا رہا۔

"جی ہاں میں نتھیا گلی گیا تھا' آپ کو بھی معلوم ہے تو پھر!" میں نے کہا۔

"تم نے بوڑھے پیر کے بھیس میں شیر افضل کی بیٹی شہزادی کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے اس کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔" اتنا کہہ کر نواب اپنا لیپ ٹاپ کھولنے لگا۔

"میں سمجھا نہیں سر......!" میں نے ایک بار پھر معصوم بننے کی اداکاری کی۔

"اب یہ بات بھی میں ہی تمہیں سمجھاؤں کہ تمہاری کارستانی کے نتیجے میں شہزادی ماں بننے والی تھی۔ یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے اندر تک

سے ہلا کر رکھ دیا تھا' لیکن میں نے فی الحال بات سے انکار کرنا بہتر سمجھا۔

"لیکن سر میں نے تو اس قسم کی کوئی حرکت۔"

"شٹ اپ شہروز۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "کیوں میرے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔ غیر مرد کی صورت میں اس کے ساتھ رات کی تنہائی میں تم ہی اس کا جن اتارنے کے لیے اس کے کمرے میں ٹھہرے تھے ناں' تم شاید جانتے نہیں ہو کہ ان حویلیوں میں جوان لڑکیوں کے لیے کتنے کڑے پہرے ہوتے ہیں......" اس نے اپنی تیز نگاہوں کی برچھیاں میرے اندر اتارتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

"وہ سر...... وہ میں...... میں مجبور ہو گیا تھا سر...... وہ خود ہی...... اور ویسے بھی سر وہ ایک انتہائی حسین اور جوان لڑکی تھی...... وہ تو خود ہی کسی بھوکی بلی کی طرح میرے اوپر جھپٹ پڑی تھی تو پھر میں کیا کرتا......" میں نے گھبرا کر اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

"کم ان شہروز! مجھے صفائیاں دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں تمہیں اس کام کے لیے سرزنش نہیں کر رہا۔ جوانی چیز ہی ظالم ہے' ایسا ہو جاتا ہے۔ لذیذ کھانا دستر خوان پر چنا ہو تو ایک بھوکا کیوں کر برداشت کر سکتا ہے۔ میں تو تمہیں اس بات کی اطلاع دے رہا ہوں۔" اس نے اس طرح کہا جیسے شیر افضل کی جوان اور کنواری بیٹی میرا حق تھی اور میں نے سوائے اپنا حق وصول کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔

"سر! اب کیا ہوگا؟ کیا شیر افضل کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ شخص میں ہوں۔" میں نے اس طرح نواب کے سامنے اظہار کیا کہ جیسے اب نواب ہی مجھے اس مشکل سے چھٹکارہ دلا سکتا ہے۔

"اب کیا ہوگا کچھ بھی نہیں۔ شیر افضل کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی کنواری بیٹی ماں بننے والی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام اسی پیر کا تھا اور پیر کے بھیس میں کوئی جوان آدمی تھا' اس کی ساری ذمہ داری اس نے اپنی بیوی پر ڈال دی۔ شیر افضل اور اس کی بیوی ہکا بکا یہ دیکھتے رہ گئے' فوراً ہی شیر افضل نے اپنی بیوی کو بھی گولی مار دیا اور قصہ ختم!"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا' ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" میں نے شدید صدمے کی کیفیت میں تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ جو ہوا بالکل ٹھیک ہوا' تمہیں کیوں افسوس ہو رہا ہے' بھول جاؤ ان باتوں کو۔ مردوں کی لائف میں اس قسم کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔" نواب نے بے پرواہ لہجے میں کہا پھر بولا۔

"اچھا ساری باتیں چھوڑو' تم ذرا میل بکس کھولو اور آج کی ای میلز چیک کرو۔"

حالانکہ میں بہت بڑے شاک کی کیفیت میں تھا' شہزادی کی من موہنی صورت بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی لیکن نواب نے جب مجھ سے ای میلز چیک کرنے کے لیے کہا تو میں سب کچھ بھول کر لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ابھی ابھی جو ای میل آئی تھی' میں نے بھیجنے والے کا نام پڑھا۔ روشن آراء کی جانب سے یہ ای میل آئی تھی' میں نے میل کھولی اور ساری پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر نواب سے کہا۔ "سر کسی روشن آراء کی جانب سے یہ میل آئی ہے آپ خود اسے ملاحظہ کریں......!"

(باقی آئندہ)

گرداب زندگی

جناب ایڈیٹر نئے افق'
السلام علیکم!

جاگیردارانہ معاشرہ میں عورت ہر روپ میں ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایسی جنس جسے جب چاہو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دو۔ کبھی اسے ستی کر دیا جاتا ہے تو کبھی جائیداد بچانے کے لیے اسے قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے اور کبھی بلکہ عموماً اسے رسم و رواج' جھوٹی شان اور انا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسی ہی دوشیزہ کی ہے۔ جسے رسم و رواج پر قربان کیا جا رہا تھا یقیناً یہ قارئین کے مزاج و معیار پر پورا اترے گی۔

غزالہ جلیل راؤ
اوکاڑہ

عشق و محبت کی ہزاروں کہانیاں تاریخ کے صفحات میں زندہ ہیں' حیران کن بات یہ ہے کہ وہ بزرگ جوان کہانیوں کے مورخ ہیں' راوی ہیں انہیں ادب میں مقام دیتے ہیں۔ اس جذبے کے دل سے قائل ہیں مگر کبھی خود سے واسطہ پڑنے پر وہی سب کچھ کیوں کرنے لگتے ہیں جو ان کہانیوں کے نیگیٹو کرداروں نے کیا تھا اور جن میں انہیں شکست اور محبت کو فتح حاصل ہوئی تھی وہ پیار کی اس فتح کو تو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں جو کہانیوں کے ہیرو اور ہیروئن کو کبھی جان دے کر اور کبھی مل کر حاصل ہوتی ہے اس پیار کو نہیں مانتے جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ شاید زندگی کے اس حصے میں وہ ولن کے کردار کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس کا اندازہ اس گفتگو سے ہوتا ہے۔

"ارے بوڑھے منہ مہاسے' بچوں کے سامنے شرم نہیں آتی۔"

"لو ہم نے ایسا کیا کیا' نوکری چھوڑ دی تھی تمہارے لیے بیروزگار ہو کر تمہارے شہر میں آ پڑے تھے۔"

"ابا میاں نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا تھا میرا' پتا ہے۔"

"املی کے درخت پر بسیرا کس نے کر لیا تھا اور تم نے چھت پر رہائش اختیار کر لی تھی فرخندہ بیگم جب دیکھو کپڑے سکھائے جا رہے ہیں' جھاڑو لگائی جا رہی ہے۔"

"ارے چلو ہٹو بے کار باتیں......"

ایسی کہانیاں عام ہیں خوش مزاج بزرگ اپنی بیگمات کو اکثر ماضی یاد دلاتے نظر آتے ہیں مگر اپنی بچیوں میں سے کسی کو کھڑکی کے قریب دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

......☆☆☆......

میرا نام تیمور ہے' ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ بڑی مشکلوں سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی پھر میں نے ہاؤس جاب مکمل کیا تھا کہ ہم میں سے چھ افراد سے پوچھا گیا۔

"دبستی شاہ گڑھی جانا کون پسند کرے گا؟"

"میں سر۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں خصوصی مراعات اور الاؤنس ملیں گے۔ یہ بستی دریا پار ہے اور یہاں سرکاری ڈسپنسری موجود ہے' آبادی چھ ہزار افراد پر مشتمل ہے غربت ہے'

بیماریاں ہیں' گرمی ہے وغیرہ وغیرہ۔"
"میں وہاں جاؤں گا سر۔"
"انتظام کرلو۔" میں نے خوشی سے تیاری شروع کردی' خدا کا قرض تھا۔ مجھے مرحوم والد کی آرزو یاد تھی' میں نے میٹرک اے ون گریڈ میں کیا تو انہوں نے کہا۔
"کیا ارادہ ہے؟"
"ابو میں بری میڈیکل میں داخلہ لوں گا۔"
"مشکل ہوگی۔"
"محنت کروں گا۔"
"دیکھو تیمور! تمہاری عمر کم ہے بیٹے' زمانے کے گرم وسرد ابھی سمجھ میں نہیں آئیں گے' یہ دور میرٹ کا نہیں ہے' سفارش اور روپے کا دور ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے' ہم ڈونیشن نہیں دے سکتے' میڈیکل میں گئے تو مشکل ہوگی جب کہ اور بہت سے راستے ہیں جن میں تعلیم حاصل کرکے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔"
"قسمت آزمانا چاہتا ہوں ابو!"
"قسمت! ہاں زندگی میں اس کا بڑا دخل ہے' قسمت بنانے والے سے عہد کرو اگر اس نے تمہیں کامیاب کردیا اور تم ان مشکلات کے باوجود ڈاکٹر بن گئے تو تمام عمر اس کا قرض ادا کرو گے غریبوں اور ناداروں کو نظر انداز نہیں کرو گے۔"
اور میں نے قسمت بنانے والے سے قرض مانگا جو مجھے مل گیا' زمانے کی ہر مشکل راستے میں آئی' والد صاحب دنیا سے چلے گئے مگر اس قرض نے مجھے ڈاکٹر بنادیا' اب ادائیگی کرنا تھی۔
شہروں میں ہزاروں ڈاکٹر تھے' لاکھوں روپے تھے مگر میں مقروض تھا۔ بستی شاہ گڑھی آکر میں نے قرض ادا کرنا شروع کیا۔ لوگ اکھڑ تھے' غربت و افلاس نے انہیں بدمزاج کردیا تھا غیر تعلیم یافتہ تھے بات نہ سمجھ پاتے تھے اگر میں ان سے بددل ہوجاتا تو بات نہیں بنتی تھی۔ میں نے اپنے دن رات ان کے لیے وقف کردیئے۔ وہ بے چارے ڈاکٹروں کے عادی نہیں تھے مگر مجھے اپنا کام کرنا تھا' ایک ایک گھر میں گھسنا شروع کردیا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مریض نکالے' یہاں علاج تعویز گنڈوں جھاڑ پھونک یا جڑی بوٹیوں سے ہوتا تھا' میں نے مثال قائم کردی' میرے ساتھ سرکاری تعاون تھا۔ سارا نظام میری خواہش کے مطابق بنادیا گیا۔ مخالفت بہت ہوئی لیکن میرا اسہارا مضبوط تھا اور پھر جواب ملنا شروع ہوگیا اور سرکش رام ہوگئے اور اس کے بعد میری عزت کسی دیوتا کی مانند ہونے لگی' یہی میرا انعام تھا۔
بستی کے سب سے بڑے آدمی چوہدری اکرام پشتینی جاگیردار تھے۔ بستی شاہ گڑھی کے مالک' ان کے پاس وسائل تھے' بجیر وتھی' گو تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن بڑے ٹور تھے۔ جوڑوں کے درد کا شکار تھے بہت سے علاج کرائے تھے فائدہ نہیں ہوا تھا۔
"بڑا رنگ جمالیا ہے ڈاکٹر! کیا ارادہ ہے؟"
"آپ کی بستی کی خدمت کرنا چاہتا ہوں چوہدری صاحب!"
"ہمارا علاج کرو گے۔"
"کیا تکلیف ہے آپ کو؟"
"خود معلوم کرو' پرانے حکیم تو ہاتھ میں ڈوری باندھ کر نبض دیکھتے تھے اور نسخہ بتادیا کرتے تھے۔ تم ویسے ہی اوتار بنے ہوئے ہو۔" مغرور چوہدری صاحب نے کہا۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ کمتر درجے کے آدمی کو نگاہ بھر کر دیکھنا بھی نہیں پسند کرتے تھے' میں نے ان کی نبض دیکھی' جوڑ سوکھے ہوئے تھے یورک ایسڈ بڑھا ہوا تھا' علاج کیا' فائدہ ہوگیا اور

چوہدری صاحب دوست بن گئے۔ عنایات کی بارش شروع ہوگئی اور بڑا خیال رکھنے لگے۔
پھر ایک شام سورج ڈھلنے کے بعد دو عورتیں اور ایک عمر رسیدہ صاحب ایک لڑکی کو لے کر میرے پاس آئے' عمر رسیدہ شخص کو میں جانتا تھا۔ چوہدری صاحب کے سالے محمود صاحب تھے۔
"خیریت محمود صاحب؟"
"ہاں ڈاکٹر صاحب! ذرا الگ آکر بات سن لیجیے۔"
ڈسپنسری بند ہوچکی تھی' سب لوگ جاچکے تھے الگ آکر محمود صاحب نے کہا۔
"اس کا نام سعدیہ ہے' چوہدری صاحب کی سگی بہن ہے' سیانے اور بڑے بوڑھے کہتے ہیں جن ہے اس پر سایہ ہے۔ بڑی مشکل سے چوہدری صاحب کو راضی کیا ہے کہ آپ کو بھی دکھالیں۔ آپ جن اور سائے کے قائل ہیں۔" میں ہنس دیا مریضہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چادر اتاری تو ششدر رہ گیا۔ سبک نقوش' ہرنی جیسی آنکھیں' پیلا رنگ' خشک گلابی ہونٹ' میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی' چہرے پر کرب تھا۔
"کیا تکلیف ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔
"ویران ہوں' کھنڈر ہوں' گھر کی دیواروں میں چنی ہوئی ہوں' انارکلی ہوں' سمجھے وحشی جلاد! تمہاری زندگی کے دن ختم ہوچکے ہیں' مرجاؤ' مرجاؤ۔ یہ تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے' جاؤ صحراؤں میں گم ہوجاؤ۔ لوٹ کے صحراؤں میں جاؤ' جاؤ......!" وہ وحشیانہ انداز میں چیخنے لگی اور میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا' آنکھیں سارے وجود کا آئینہ ہوتی ہیں اور میں اس کی آنکھیں پڑھ رہا تھا' اس کی حرکات اس کے الفاظ دیوانگی ظاہر کرتے تھے لیکن آنکھیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے خود کو بھنبھوڑنا شروع کردیا' اپنے بازو کو دانتوں سے کاٹ لیا' رخسار زخمی کرلیا' عورتیں گھبرا گئی تھیں۔ میں نے اس کی کلائیاں پکڑلیں اور آہستہ سے کہا۔
"بری بات ہے' خود کو داغ دار کیوں کررہی ہو؟"
مگر اس کی وحشت کم نہ ہوئی' وہ اول فول کہتی رہی' مجبور ہوکر اسے خواب آور انجکشن لگانا پڑا تھا۔
"کب سے یہ حال ہے؟" میں نے محمود صاحب سے پوچھا۔
"کوئی دو سال ہوگئے۔"
"اچانک یہ کیفیت ہوئی؟"
"ہاں!"
"چوہدری صاحب نے کیا کہہ کر علاج کی اجازت دی ہے؟"
"بس ڈاکٹر صاحب! وہ بھی اس کی بیماری سے تنگ آگئے ہیں' ماں باپ مرچکے ہیں اور...... اور......" محمود صاحب خاموش ہوگئے۔
"یہ خواتین کون ہیں؟"
"گھر کی نوکرانیاں ہیں؟"
"لے جائیں انہیں' ابھی دوائیں نہیں دوں گا۔ کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے اس کے بعد جواب دے سکتا ہوں۔" وہ لوگ چلے گئے' رات کو دیر تک لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا' بہت خوب صورت تھی۔ ہسٹیریا کی علامات بھی نہیں ملتی تھیں' دوسرے دن چوہدری صاحب سے ملا۔
"عذاب بن چکی ہے وہ میرے لیے' اسے تو زہر کا انجکشن ہی لگائیں تو بہتر ہے۔"
"آپ اسے شہر کیوں نہیں لے گئے علاج کے لیے؟"
"مرض بھی تو پتا چلے خود کو تماشا بنادوں دوسروں

کے سامنے۔" چوہدری صاحب سے اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں میں نے کہا۔

"آپ مجھے اس کے علاج کی اجازت دیتے ہیں۔"

"کچھ کر سکو گے؟"

"جی ہاں! کوشش......"

☆......☆......☆

ایک زخمی کو میرے پاس لایا گیا' سر پھٹ گیا تھا۔ بینڈیج کردی اور پوچھا کہ چوٹ کیسے لگی۔

"وہی ڈاکٹر صاحب اسی بھوت کو دیکھ لیا تھا' ارے وہی بجو! بالکل سامنے آ گیا تھا' بڑی مشکل سے جان بچائی' ٹھوکر لگی تو گر پڑا۔" زخمی نے بتایا۔

میں یہ کہانی پہلے بھی سن چکا تھا' لوگوں میں مشہور تھا کہ بستی کے واحد قبرستان سے پرے ایک جگہ تھی وہاں ایک مردہ' جس کا نام ساجد تھا اور سب لوگ اسے بجو کہتے تھے کو دیکھا جاتا تھا جو کبھی چہل قدمی کرتا نظر آجاتا تھا' لوگ سر شام ادھر سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بہر حال ایسی بستیوں میں اس طرح کی کہانیاں عام ہوتی ہیں۔

میری فرمائش پر سعدیہ کو دوبارہ میرے پاس لایا گیا۔

"ایک ملازمہ کے ساتھ اسے یہاں چھوڑنا پڑے گا۔" میں نے محمود صاحب سے کہا۔

"چوہدری صاحب کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

"پوچھ آئیں۔" میں نے کہا۔

چوہدری صاحب نے اجازت دے دی تھی۔ میرا رہائشی حصہ کافی وسیع تھا' ایک کمرے میں میں نے سعدیہ کو رکھا تھا۔ ملازمہ بڑی گھاگ تھی وہ مجھ پر بھی نگاہ رکھ رہی تھی لیکن اسے سنبھالنا مشکل کام نہیں تھا۔ دوٹرینکولائزر نے اسے اتنا غفیل کردیا تھا۔ اس کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے سعدیہ سے بات کی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں سعدیہ! تم جانتی ہو میرا تعلق یہاں سے نہیں ہے' نا ہی تمہارے بھائی چوہدری اکرام کا ملازم ہوں۔ اس لیے پہلے تو اطمینان کرلو کہ تمہارا راز کبھی میری زبان سے باہر نہیں نکلے گا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے' دوسری بات یہ ہے کہ تم پر کوئی جن یا آسیب نہیں ہے' نا ہی تمہیں کوئی بیماری ہے' ہاں کوئی غم تمہیں ضرور ہے' جس کے نتیجے میں تم یہ سب کچھ کررہی ہو' مجھے اپنا دکھ بتادو' ہوسکتا ہے میں تمہارا دکھ دور کردوں۔"

"مجھ سے چالاکی کررہا ہے ڈاکٹر! بھون کر کھا جاؤں گا۔" سعدیہ نے خونی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے مردانہ آواز بنانے کی کوشش کی' میں ہنس پڑا تھا۔

"تم بستی شاہ گڑھی کے رہنے والے بے وقوف بن سکتے ہیں سعدیہ! میں نہیں۔ تم کو صحیح طور پر مردانہ آواز بھی بنانا نہیں آئی' چلو پہلے تم مجھے بھون کر کھا جاؤ اس کے بعد میں تم سے بات کروں گا۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں خوب صورت لڑکی' مجھ پر بھروسا کرو' اپنے جسم اور چہرے کو داغ دار کیوں کررہی ہو؟"

"ڈاکٹر! ہوش میں آ' بے موت مارا جائے گا۔" وہ بولی۔

"بے موت تم ماری جاؤ گی اگر تم نے زبان نہ کھولی۔ تمہیں معلوم ہے چوہدری اکرام نے تمہارے لیے کیا فیصلہ کیا ہے' غور سے سنو! برابر کی بستی کے ایک ساٹھ سالہ مولوی صاحب ہیں جن کا نام رحمت علی ہے۔ چوہدری صاحب ان سے تمہارا نکاح کردینا چاہتے ہیں' مولوی صاحب تیار ہوگئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نکاح کے بعد وہ خود اس جن سے نمٹ لیں گے' یہ کام تین دن کے اندر اندر ہوجائے گا۔" میرا یہ وار کاری تھا' وہ بلک بلک کر رو پڑی' اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب...... نہیں! خدا کے لیے ایسا نہ ہونے دیں...... مجھے بے موت نہ مرنے دیں...... خدا کے لیے...... خدا کے لیے......"

"میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں' مگر تم مجھ سے بھی وہی اداکاری کررہی ہو' مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو' میں تمہاری مدد کا وعدہ کرتا ہوں۔" مجھے خوشی تھی کہ میری تدبیر کارگر ہوگئی تھی' اس نے آنسو خشک کرکے کہا۔

"بھائی جان بہت بے رحم ہیں' ماں باپ مرگئے اور مجھے ان کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ بھائی جان بُرے آدمی نہیں ہیں اور انہوں نے میرے ساتھ کبھی بُرا سلوک بھی نہیں کیا لیکن وہ بے حد سخت مزاج اور ظالم انسان ہیں' ساجد ہمارے ہاں بچپن سے نوکر تھا۔ اس کے ماں باپ بھی یہیں ملازمت کرتے تھے اور پشتوں سے ہمارا نمک کھارہے تھے۔ ساجد بچپن ہی سے میرے ساتھ رہتا تھا اور میں اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب! میرے دل میں ساجد کے لیے دوسرے جذبات پیدا ہوگئے تھے' وہ خود بھی بہت اچھا انسان ہے اور ہمیشہ اس نے اپنی اوقات کو مدنگاہ رکھا لیکن ڈاکٹر صاحب! غلطی تو میری تھی میں نے ساجد کے ساتھ زندگی گزارنے کے وعدے کیے تھے' میں تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی ہوں' ڈاکٹر صاحب! یہ بات جانتی ہوں کہ مذہب نے نہ کسی کو نیچ کہا ہے نہ اونچی ذات' یہ سب ہمارا اپنا کھیل ہے اور ہم ہی کسی کی غربت اور کسی کی دولت سے متاثر ہوکر اونچ نیچ کا فرق پیدا کرلیتے ہیں۔ مذہب نے عورت کو بھی تو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے اپنی پسند کا اظہار کرے۔ میں اگر ساجد سے محبت کرنے لگی تھی اور اس کے ساتھ جینا چاہتی تھی تو کون سا جرم کر ڈالا تھا میں نے' مگر اسے بہت بڑا جرم تصور کیا گیا۔ بھائی جان کی ناک کا معاملہ درمیان میں آگیا۔ ایک مرتبہ جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو وہ دیوانے ہوگئے' مجھ سے بھی سختی کی گئی لیکن ان کی نگاہ میں ساجد بہت بڑا مجرم تھا۔ اسے قبرستان لے جایا گیا' وہاں لاٹھیوں سے مار مار کر شدید زخمی کردیا گیا اس کے بعد اسے وہیں قبرستان کے ایک اندھے کنوئیں میں ڈلوادیا گیا لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ مارنے والے سے بچانے والی ذات بڑی ہے' ساجد کی بھی زندگی تھی وہ بچ گیا نا جانے کس طرح وہ زخمی حالت میں ہی اندھے کنوئیں سے باہر نکل آیا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا سوائے خدا کے اور خدا نے ان زخموں کے باوجود اسے زندگی دی۔ وہ بچ گیا اور دیکھنے والوں نے اسے بھوت سمجھ لیا۔

ساجد کے ماں باپ بھی مرچکے تھے' وہ کس منہ سے حویلی آتا' یہاں تو اس کی زندگی کو خطرہ ہی تھا چنانچہ اس نے وہیں رہنا شروع کردیا' بے چارہ نجانے کیا کھاتا ہے' کیا پیتا ہے' لوگ اسے بھوت سمجھتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہوگیا ہے' سب ہی اس سے نفرت کرتے تھے' کوئی بھی اس کا نہیں تھا اور اس کا یہ حال چوہدری صاحب کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایک بار میں یہ ساری کہانیاں سن کر اس سے ملنے کے لیے گئی تو اس نے مجھے پوری تفصیل بتائی' میں نے اس سے یہی کہا کہ وہ کہیں چلا جائے یا پھر بھوت بن کر ہی رہے۔ ان لوگوں پر اپنی اصلیت کبھی ظاہر نہ کرے' ساجد نے کہا کہ جب ہم مرجائیں گے تو ہماری قبریں بھی ساتھ ساتھ ہی بنیں

گی۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا اور اس وقت سے وہ وہیں رہتا ہے، زندگی کی تمام آسائشوں سے دور قبرستان کے ویرانوں میں وہ تنہا پڑا رہتا ہے۔ مجھے اگر کبھی موقع مل جاتا ہے تو میں چھپ کر اس کے پاس چلی جاتی ہوں، ہم لوگ چند باتیں کرتے ہیں اور پھر واپس آ جاتی ہوں۔ بھائی جان اس واقعے کے بعد اس چکر میں پڑ گئے ہیں کہ کہیں میری شادی کر دیں، مجبوری کی حالت میں مجھے یہ ڈھونگ رچانا پڑا۔ میں نے اپنا حلیہ خراب کرنا شروع کر دیا تاکہ کوئی مجھے قبول نہ کر پائے، یہ سارے کام میں اسی سلسلے میں کر رہی ہوں۔ مرا نہیں جاتا مجھ سے، موت سے ڈر لگتا ہے ڈاکٹر صاحب! لیکن کسی اور کے پاس جانے کے بجائے میں ہر قیمت پر موت قبول کر لوں گی اگر آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو بس اتنا کریں کہ بھائی جان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ بھی نہیں دے سکتی آپ کو لیکن دعائیں ضرور دوں گی۔ بچا لیجیے مجھے اس مصیبت سے، میری شادی نہ ہونے دیں، جتنی بھی زندگی ہے، جی لوں گی اور اس کے بعد، اس کے بعد مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا، میں جانتی ہوں کہ جس دن میری موت کی خبر ساجد کے کانوں تک پہنچے گی وہ بھی مر جائے گا، بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں ہم دونوں۔"

بڑی دردناک کہانی تھی، میرا دل ہی پسیج گیا تھا مجھے ویسے بھی یقین تھا کہ یہ کوئی ایسا کیس ہی ہے اس کی آنکھوں سے مجھے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس حسین لڑکی کی بے بسی مجھے بہت دکھ دے رہی تھی اور میں اس قسم کے لوگوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ چوہدری اکرام کے چہرے ہی سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا تھا کہ وہ سنگدل انسان ہیں اور میری کسی بھی تجویز کو نہیں مانیں گے۔ کوئی ایسی ہی ترکیب کرنی چاہیے مجھے کہ بات بن جائے۔ میں نے سعدیہ کو بہت سی تسلیاں دیں اور کہا کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرتی رہے اگر اس نے گردن اٹھائی تو مصیبت کا شکار ہو جائے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اسی طرح اپنے آپ کو پاگل بنائے رکھے اور وقت گزارتی رہے۔ میں کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لوں گا پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم ساجد کے ساتھ یہاں سے نکل جانا پسند کرو گی؟" میرے اس سوال پر اس کی گردن جھک گئی اور اس نے آنسو بھری آواز میں کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب! اس طرح میرے بھائی کی بے عزتی ہوگی اور وہ بستی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے، زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔ موت کی بات دوسری ہے اور پھر بات میرے بھائی تک ہی نہیں، ماں باپ تک بھی پہنچے گی۔ میرے اس طرح چلے جانے سے لوگ میرے ماں باپ کو بھی برا بھلا کہیں گے، یہ کرنا ہوتا تو کب کی کر چکی ہوتی، ساجد بھی ایسا نہیں کرے گا۔"

"لیکن اس کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا خیر تم انتظار کرو، جو کچھ میں کہوں اس سے ایک بات بھی ہٹ کر نہ ہو ورنہ ذمہ داری تم پر ہوگی۔" اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا۔

☆......☆......☆

میں خاصی الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا کر سکتا ہوں میں اس لڑکی کے لیے؟ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں؟ وہ رات سوچوں میں گزر گئی تھی۔ دوسرے دن میں نے ایک منصوبہ بنا لیا، منصوبے کے مطابق میں [illegible] کے چہرے پر ایک دو جگہ نشان بنائے، دوسرے دن چہرے پر دو تین جگہ مزید نشان بنائے اور دور سے دیکھنے پر بھی صاف نظر آتے تھے اور بے حد عجیب لگتے تھے۔ سعدیہ کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ بالکل خاموش رہے۔ ملازمہ نے بھی ان نشانوں کو دیکھا تھا اور ردعمل کے طور پر محمود صاحب شام تک میرے پاس مرض کے بارے میں معلوم کرنے پہنچ گئے تھے۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق انہیں وہ دل دہلا دینے والی کہانی سنائی، میں نے محمود صاحب سے کہا کہ وہ کوئی آسیب وغیرہ نہیں بلکہ سعدیہ برین کینسر کا شکار ہو گئی ہے، اسے دماغ کا کینسر ہے، میں نے محمود صاحب کو مزید دہلاتے ہوئے کہا۔

"بات یہیں تک محدود نہیں ہے محمود صاحب! بلکہ اس کے جسم میں کچھ ایسے غدود بھی نمودار ہو رہے ہیں جو بہت ہولناک ہیں۔ ان غدود سے جو جراثیم برآمد ہو رہے ہیں وہ چھوت کے جراثیم ہیں اور ان سے دوسرے لوگوں کے بھی متاثر ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ عمل اس کے چہرے سے شروع ہوا ہے میرا خیال ہے اب اس کی زندگی چند روز سے زیادہ نہیں رہ گئی وہ یقیناً مر جائے گی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں چوہدری صاحب کو یہ تفصیل کیسے بتاؤں۔"

لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی، محمود صاحب نے چوہدری صاحب کو جو کہانی سنائی تھی اس کے تحت چوہدری صاحب نے خود ڈسپنسری تک آنا پسند نہیں کیا بلکہ مجھے ہی بلوا لیا اور تنہائی میں مجھ سے اس کے بارے میں تفصیلات پوچھیں، میں نے وہی ساری باتیں چوہدری صاحب کو بھی بتا دیں۔

"یہ تو بڑی مشکل ہو گئی اگر ہم اسے واپس حویلی میں لے آتے ہیں تو یہاں دوسرے لوگوں کے بھی متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔"

"بہت زیادہ چوہدری صاحب! ویسے بھی یہ افسوسناک خبر مجھے آپ کو دیتے ہوئے بڑا دکھ ہے کہ وہ اب چند دن کی مہمان ہے اور زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔"

چوہدری صاحب نے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"بہت پیار تھا مجھے اس سے، بہت چاہتا تھا میں اسے لیکن اس نے خود اپنا یہ حال بنایا، میں کیا کر سکتا ہوں؟ وہ جو کچھ چاہتی تھی وہ میں نہیں کر سکتا تھا اگر ایسا ہو جاتا تو مجھے اپنے خاندان سمیت خودکشی کرنا پڑتی، ہم لوگوں کی ایک روایت ہے، ایک شان ہے۔ اس شان کو ہم متاثر نہیں کر سکتے تھے، اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا ڈاکٹر صاحب! سو ہو گیا لیکن اب مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت ہے، مجھے بتائیے میں کیا کروں، کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"چوہدری صاحب! میں نے اسے آبزرویشن میں رکھا ہوا ہے، آپ چاہیں تو اسے واپس بلا لیں لیکن اس خطرے کو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اس کی بیماری بہت ہولناک ہے اور دوسروں کا بھی اس سے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! اس سلسلے میں آپ کو میری مدد کرنا پڑے گی۔ آپ جس طرح ممکن ہو سکے اسے وہیں رکھیں، اگر آپ کوئی اور مشورہ دیں تو میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس کے لیے جتنا روپیہ آپ چاہیں خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن جو کچھ وہ چاہتی تھی وہ میں نہیں کر سکتا تھا اور اب اب تو اس کا موقع ہی نہیں رہا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے چوہدری صاحب! اب اسے چند روزہ زندگی کے لیے پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اسے وہیں ڈسپنسری میں رہنے دیں اگر آپ چاہیں تو اس عورت کو بھی وہاں سے ہٹا لیں کیونکہ وہ آپ کی ملازمہ ہے اگر وہ جراثیم لے کر حویلی

واپس آ ئی تو خطرات بڑھ سکتے ہیں۔"
"اسے فوراً وہاں سے ہٹا دیں، مگر آپ کو بھی خطرہ ہوگا ڈاکٹر صاحب!" چوہدری صاحب نے ہمدردی سے کہا۔
"میری فکر نہ کریں، یہ تو میری ذمہ داری ہے۔"

☆......☆......☆

بڑی دل چسپ صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ چوہدری صاحب نے میری ساری باتیں مان لی تھیں، اس ملازمہ کو بھی واپس بلوالیا تھا اور مجھے اپنے منصوبے میں ایک حد تک کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ دوسرے مرحلے کے لیے میں نے دوسری رات کو قبرستان جانے کا فیصلہ کیا اور رات کی ہولناک تاریکی میں اس علاقے میں جا نکلا۔ بلاشبہ بڑی خوف ناک جگہ تھی اور اس جگہ مجھے ساجد کو تلاش کرنا تھا لیکن کچھ تقدیر ہی کی خوبی تھی کہ ساجد مجھے مل گیا۔ وہ بھی شاید اب لوگوں کو ڈرانے کا عادی ہوگیا تھا، ایسے خوف ناک انداز میں ٹہلتا ہوا میرے پاس پہنچا تھا کہ میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا، پھر میں نے اس سے کہا۔
"تم ساجد ہو؟" وہ خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا، میں نے اس سے کہا۔ "ساجد! شاید تمہارے کانوں تک میرے بارے میں اطلاع پہنچ چکی ہو، میں بستی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے آیا ہوں اور یہاں کے لوگوں کا ہر طرح کا علاج میرا فرض ہے۔ سنو اگر تم ساجد ہو تو مجھے بتاؤ، میں کسی بھوت ووت سے نہیں ڈرتا اور میں جانتا ہوں کہ تم بھوت نہیں ہو، تم اندھے کنوئیں سے زندہ سلامت واپس نکل آئے تھے شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ یہ ساری باتیں مجھے سعدیہ نے بتائی ہیں اور وہ میرے زیر علاج ہے۔"
ظاہر ہے ساجد بھی ایک دیہاتی ہی تھا، اس نے بہت زیادہ مدافعت نہیں کی اور میں نے اس کی زبان کھلوائی، ساری باتیں وہی تھیں جو سعدیہ نے بتائی تھیں، میں نے ساجد سے کہا۔
"تو پھر اب تم تیار ہو جاؤ، تمہیں سعدیہ کے ساتھ یہاں سے نکل جانا ہے اور میں اسی کے لیے تیاریاں کر رہا ہوں۔"
ساجد کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں اس کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے، بمشکل تمام سمجھا بجھا کر میں نے اسے اپنے مقصد کے لیے آمادہ کیا تھا، دل ڈر رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ چوہدری اکرام کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، الٹے دماغ کا ہے اگر اسے میری سازش کا علم ہوگیا تو پھر میری خیر نہیں ہے لیکن بس دل چاہ رہا تھا کہ اس مسئلے میں اتنا آگے بڑھ کر کام کروں بعد کے حالات میری مرضی کے مطابق ہی رہیں گے۔ بالآخر پانچویں دن میں نے سعدیہ کی موت کا اعلان کردیا۔ چوہدری صاحب کی حویلی میں رونا پیٹنا شروع ہوگیا لیکن میں نے خدشہ اب بھی ان کے سامنے رکھا تھا اور یہ اظہار کیا تھا کہ سعدیہ کی تدفین میں زیادہ لوگ نہ ہوں تاکہ کسی کو جراثیم نہ لگیں۔ میں نے اور بہترین کام کیا تھا، سعدیہ کا چہرہ میک اپ کے ذریعے اتنا بگاڑ دیا تھا جیسے واقعی وہ کسی بدترین بیماری کا شکار ہو پھر میں نے اسے ایک انجکشن دیا تھا، جس سے وہ بالکل بے سدھ ہوگئی تھی پھر میں نے اسے غسل دینے والی عورتوں کے حوالے کردیا، انہوں نے اسے غسل دیا تھا۔ اب ان بے چاری معصوم عورتوں کو اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ اس کی نبض اور تنفس کا جائزہ لے سکتیں، وہ اس کا چہرہ دیکھ کر بری طرح ڈری ہوئی تھیں۔ جلدی جلدی اپنا کام کرکے فرار ہوگئیں۔ میرا کام اور آسان ہوگیا تھا، مجھے یہاں سعدیہ کی لاش تبدیل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اس کے لیے بھی تمام انتظامات کرلیے تھے اور ایک ایسی کفن شدہ لاش تیار رکھی تھی جس میں روئی کے گڈ بھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان پتھر رکھے ہوئے تھے، چہرے کو بھی چھپا دیا تھا، ظاہر ہے اس بیماری کی وجہ سے چوہدری یا کوئی اور قریبی عزیز اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکتے تھے لیکن پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ میں نے سعدیہ کو ایک اندرونی کمرے میں پہنچایا اور اس کے بعد گہوارے میں موجود اس لاش کو تدفین کے لیے لے جایا گیا۔ لوگ بہت وہمی تھے غالباً یہ خبر عام ہوچکی تھی کہ سعدیہ کسی چھوت کی بیماری کا شکار ہوئی ہے چنانچہ تدفین کرنے والوں نے بھی احتیاط رکھی اور مجھے اپنے ہاتھوں سے سعدیہ کی لاش قبر میں اتارنا پڑی اور اس کے بعد یہ قصہ ختم ہوگیا۔ لوگ تدفین کرکے واپس چلے گئے لیکن میری ذمے داریاں ابھی باقی تھیں۔
چنانچہ آدھی رات کو ساجد اور سعدیہ کو لے کر وہاں سے چل پڑا۔ بڑا جان جوکھم کا کام تھا لیکن میں نے اسے سرانجام دیا اور پھر اسٹیشن جا کر انہیں ٹرین میں بٹھا دیا، سعدیہ کو میں نے ساری صورت حال بتادی تھی اور اس سے کہہ دیا کہ تھا اب اس کے اس طرح جانے سے چوہدری اکرام کی کوئی بے عزتی یا بدنامی نہیں ہوگی، بس اس کی کہانی شاہ گڑھی سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس کام کی تکمیل نے جہاں مجھے ایک ذہنی خلجان کا شکار کیا تھا کہ میں نے تھوڑی سی سازش کی ہے، وہاں اس کے ساتھ ساتھ ہی دو انسانی زندگیوں کو بچا بھی لیا تھا اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں اسے ناجائز کام قرار نہیں دیتا تھا، چوہدری اکرام تو ہر قیمت پر سعدیہ کی زندگی کے درپے تھے، کیسے سمجھایا جاتا انہیں، ساجد کو میں نے کچھ پیسے وغیرہ بھی دے دیئے تھے جہاں اسے شہر جا کر اپنے لیے نئی زندگی تلاش کرنا تھا۔ چوہدری اکرام یا شاہ گڑھی کے کسی بھی فرد کے کانوں کان اصل واقعہ کی خبر نہ ہوسکی، بس یہ چرچے ضرور عام ہوئے تھے کہ سعدیہ کی موت کے بعد ہی ساجد عرف تجو کا بھوت بھی غائب ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

اس واقعے کو تقریباً پانچ سال گزر گئے۔ پانچ سال کے بعد ڈسپنسری میں ایک اور ڈاکٹر کو بھیج دیا گیا اور میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ سعدیہ کا واقعہ تقریباً میرے ذہن سے ختم ہی ہوگیا تھا لیکن شہر میں اپنی ذمے داریاں پوری کرتے ہوئے ایک بار میری ملاقات ساجد سے ہوگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا، مجھے دیکھتے ہی میرے قدموں سے لپٹ گیا اور پھر زبردستی مجھے اپنے چھوٹے سے گھر میں لے گیا جو ہر قسم کے سازوسامان سے آراستہ تھا، اس نے بتایا کہ وہ ایک مل میں کام کرتا ہے اور سعدیہ اور وہ خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سعدیہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس نے میرے قدموں میں سر رکھ دیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔
"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہر قسم کی بیماری کا علاج تو میرا فرض ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ان دونوں کو ایک پرمسرت زندگی دینے میں کامیاب ہوا۔" میں نے خلوص سے اپنی یہ آپ بیتی آپ کو سنادی۔ اگر اس میں میں نے کوئی جرم کیا ہے تو آپ بھی دعا کیجیے گا کہ خدا مجھے معاف کرے لیکن دو انسان خوش و خرم ہیں اور ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

□
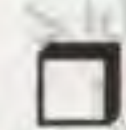
نیت مراد

محترم عمران احمد قریشی'
سلامات!
ایک وقفے کے بعد نیت مراد کے ساتھ حاضر ہوں۔ یقیناً حسب سابق آپ پزیرائی بخشیں گے۔ ہمارے معاشرے بد قسمتی سے ہمارے طبقے میں میرا مطلب ہے خواتین میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے منفی طرز عمل عام ہوگیا ہے۔ وہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز سمجھتے ہوئے اپنا ایمان تک فروخت کردیتی ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسی خاتون کی ہے جس نے اپنے محبوب کو پانے کے لیے اپنے ایمان کا سودا کیا تھا مگر وہ اسے پانے کے باوجود اس کا پیار نہ پا سکی تھی۔ یہ کہانی بہت سی خواتین کے لیے راہ نما ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے اسے ضرور شائع کیجیے گا۔

ریحانہ سعیدہ

''شانزے تم آج بھی پریشان ہو۔ آخر تم نے اپنے آپ کو کیوں یہ روگ لگا لیا ہے۔ اگر تمہارا کزن تمہیں پسند نہیں کرتا تو کیوں اس کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کررہی ہو۔''

''امی تم میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتی۔ اسے حاصل کرنا میری ضد ہے۔''

''لو جی پہلے پیار تھا اب ضد بن گیا کیا ہوگیا ہے تمہیں......؟''

''ایمان تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گی تم اچھی خاصی پیاری ہو تمہارے رشتے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ تم اکلوتی بھی ہو۔ جبکہ میں عام شکل وصورت کی ہوں اور میری بہنوں کا بھی ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور میری خالہ کا یہ بیٹا بہت خوب صورت بھی ہے اور پڑھا لکھا بھی بھی تو میرا دل اس پر آ گیا۔''

''تو اب ضد کیسے شامل ہوگئی؟''

''میری امی نے خالو سے رشتے کی بات کی ہے تو انہوں نے کہا ابھی چھوٹے بچے پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے چھ مہینے سال تک نہیں کرسکتا۔ جبکہ امی کو جلدی ہے اس لیے اب اسے حاصل کرنا میری ضد بن گئی۔''

''لیکن یار لڑکا بھی تو راضی نہیں تو پھر تم یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہو۔''

''میری امی مجھے پیر صاحب کے آستانے پر لے کر گئی تھیں اور تمہیں معلوم ہے کہ ان کے آستانے پر لکھا تھا ایک رات کے عمل سے محبوب آپ کے قدموں میں۔ میں اب ان سے وہی عمل کرواؤں گی پھر دیکھنا گھر والے مانیں یا نہ مانیں لڑکا کچے دھاگے سے بندھا میری طرف آئے گا۔''

''لیکن شانی جادو ٹونہ تو ایمان ختم کردیتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا میری دوست کا نام جو ایمان ہے۔ سو شانزے ایمان تم سے لے لے گی۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں امی آواز دے رہی ہیں۔''

ایمان اور شانزے بچپن کی دوست تھیں۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے اور چھتیں بھی آپس میں ایک چھوٹی سی دیوار سے ملی ہوئی تھیں اس لیے دونوں اکثر چھت پر باتیں کرتی اور پڑھتی تھیں۔ ایمان صاف ستھرے اور سلجھے ذہن کی لڑکی تھی۔ جبکہ شانزے ضدی اور کسی حد تک احساس کمتری کی ماری تھی۔ اس لیے ایک دن اپنے سے چھوٹے کزن کو دیکھا تو دل ہار بیٹھی۔ جبکہ وہ اس بات سے بے خبر تھا۔

☆☆

''پھر تمہارا کیا بنا؟'' دوسرے دن ایمان شانزے سے ملی تو پوچھنے لگی۔

''بننا کیا ہے' پیر صاحب نے تعویذ دیا ہے کہ کسی طرح اپنے کزن کو پلا دو۔ اب مجھے انتظار ہے چھوٹی خالہ کی بیٹی کے عقیقے کا۔ اس میں پورا خاندان اکٹھا ہوگا۔ میرا وہ کزن بھی آئے گا تو میں اسے تعویذ پلادوں گی۔ پھر دیکھنا وہ کیسے میرا مطیع ہوگا۔''

''تعویذ تو بہت مہنگا ہوگا۔''

''ہاں پیر صاحب نے پانچ ہزار اب لیے ہیں باقی ضرورت کے مطابق لیں گے۔ کچھ پیسے امی نے جمع کیے ہوئے تھے کچھ میں نے سوٹ ملا کے کام ہوگیا۔''

☆☆

''ایمان آج کل تم کہاں ہوتی ہو۔'' شانزے نے چھت پر ایمان کو دیکھا تو بولی۔

''کام ہوتا ہے یار پھوپھو اپنے بیٹے کے ساتھ آئی ہوئی ہیں اس لیے مہمان داری سے فرصت ہی نہیں۔ تم بتاؤ تمہارا مسئلہ کہاں تک حل ہوا۔''

''ایمان میں آج کل بہت خوش ہوں جب سے تعویذ پلایا ہے اب ہم گھنٹوں موبائل پر باتیں کرتے ہیں۔''

''کیا واقعی اس طرح مسئلے حل ہوجاتے ہیں؟''

''ہاں کیوں نہیں ویسے ایمان تمہارے گھر کے دروازے پر ایک خوب صورت ڈیشنگ لڑکے کو دیکھا تھا وہی تمہاری پھوپو کا بیٹا ہے۔''

''ہاں وہی احسن بھائی ہے۔''

''یار تم دونوں کا کپل بڑا اچھا لگے گا اسے پٹا لو۔''

''نہیں احسن بھائی کا رجحان میری طرف نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا تم بھی پیر جی کے آستانے سے تعویذ لے آنا۔ خود بخود اس کا رجحان تمہاری طرف ہوجائے گا۔''

''نہیں شانزے میں ایسا کام نہیں کرسکتی۔ جو میرا مقدر ہے وہ مجھے ضرور ملے گا اور وہی میرے لیے بہتر ہوگا۔''

''یار اس دنیا میں مقدر بنانا پڑتا ہے۔ اب دیکھو میرا مقدر میرے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

''ایمان بیٹا نیچے آؤ۔ پھوپو کو چائے بنا کر دو۔'' ماں کی آواز پر ایمان نیچے آ گئی۔

پھوپو اور احسن سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایمان نے ایک نظر احسن کو دیکھا واقعی شانزے صحیح کہہ رہی ہے احسن بھائی واقعی خوب صورت

پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ اگر پھوپو کی طرف میرا رشتا ہو گیا تو میری خوش نصیبی ہو گی۔ چائے بنا کر ایمان نے پھوپو کو دی اور پھر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"بیٹا تم نے اپنے بھائی کے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈنی ہے تاکہ میں جلد از جلد اس کی شادی کر دوں۔ تم کالج جاتی ہو کسی اچھی لڑکی کو دیکھنا۔"

"کیوں نہیں پھوپو ضرور خیال رکھوں گی۔"

"امی یہ کیا بات ہوئی پھوپو خدمت کروانے کے لیے ہمارے پاس آجاتی ہیں اور رشتے کے لیے باہر جھانکتی پھر رہی ہیں۔"

"ایمان بیٹا ادھر آؤ۔"

"جی امی۔" ایمان ان کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔

"کیا تمہیں احسن پسند ہے۔ تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

شانزے تیرا ستیاناس الٹا خیال میرے دماغ میں بٹھا دیا۔ ایمان نے اپنے آپ کو کوسا۔

"ارے نہیں آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔

"بیٹا تمہاری پھوپو بہت اچھی ہیں اور ان کا بیٹا بھی بہت اچھا اور پڑھا لکھا سمجھدار ہے۔ وہ سیٹل ہے اسی لیے وہ اس کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں جبکہ تم ابھی پڑھ رہی ہو اور تمہارے ابو کی خواہش ہے کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور پھر بیٹا جو تمہارے نصیب میں ہوگا وہی تمہیں ملے گا۔ اس لیے رشتے داروں کی خدمت اس نیت سے کرنا کہ ان کے ساتھ رشتے طے ہو جائیں بہت غلط ہے۔ اپنی نیت کو دوسروں کے لیے صاف رکھو گی تو اللہ تعالیٰ تمہیں بامراد کرے گا۔ پھوپو، چچا، تایا، خالہ، ماموں یہ وہ خونی رشتے ہیں جن سے محبت اور حسن سلوک کا اللہ خود حکم دیتا ہے ان رشتوں کو ذاتی غرض اور مفاد کا ذریعہ بنانا غلط ہے۔"

"سوری امی میں نے ایسے ہی یہ بات کر دی تھی۔ آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

☆☆

کالج کینٹین میں سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے شانزے، ایمان اور رباب کو پیر بابا کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"یار میرا کزن تو اب میری مٹھی میں ہے اسے اپنی ماں اور باپ کی بھی پروا نہیں رہی۔"

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟" رباب نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یار میرا تو کام ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ سے چھپ کر علیحدہ گھر بھی کرائے پر لے لیا ہے۔"

"تو کیا تمہاری امی اپنی بہن اور بہنوئی کے بغیر تمہارا رشتا کر دیں گی۔"

"ہاں کیوں نہیں میری امی تو میرے ساتھ ہیں۔"

"اس طرح تو خاندان میں رنجشیں پڑ جاتی ہیں۔" رباب نے کہا۔

"یار ہمیں کچھ بھی پروا نہیں ہم آٹھ بہنیں ہیں جن میں پانچ کی شادیاں بھی ان کی اپنی کوششوں اور امی کی مدد سے ہوئی ہیں۔ ابھی میرے بعد بھی دو باقی ہیں۔ امی پہلے بھی بابا جی سے تعویذ لیتی رہی ہیں۔ کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔"

"یار تم اپنے بابا جی سے میرے پاس ہونے اور میڈیکل کالج میں جانے کے لیے تعویذ لے آؤ۔"

"نہیں تمہیں خود جانا پڑے گا۔ ایمان تم بھی چلنا۔"

"نہیں بھئی مجھے تم معاف ہی کرو۔"

اگلے دن رباب ایمان کو بتا رہی تھی۔

"میں شانزے اور اس کی امی کے ساتھ بابا جی کے پاس گئی۔ ایمان میں تمہیں کیا بتاؤں وہ کتنے ڈراؤنے تھے میں تو ان کی لال لال آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ ان کی نظر مجھے اپنے جسم میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ شانزے اور اس کی امی ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ایک مرغی صدقہ دینے کے لیے چھ انڈے گلی میں رکھنے کے لیے کہا اور 500 روپے بھی لیے ہیں۔ آئندہ تو میں کبھی نہ جاؤں اگر امی کو پتا چلا تو وہ مجھے زندہ دفن کر دیں گی۔"

"تم نے غلط کیا میں اسی لیے نہیں گئی اگر چلی بھی جاتی تو بابا جی کی باتوں پر عمل نہ کرتی۔ مرغی روسٹ کر کے کھا لیتی اور انڈے بوائل کر لیتی اور 500 روپے کا سوٹ لے لیتی۔"

"میں نے خود امی سے سو بہانے کر کے انڈے اور مرغی کا صدقہ دیا اور کہا۔ امی ایمان نے خواب میں دیکھا تھا لیکن شانزے ایک غلط کام اتنے اعتماد سے کر رہی ہے۔"

"دیکھو رباب جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور خالصتاً شرعی کام کو ہم اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے غیر شرعی کر دیتے ہیں۔"

"تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے کیونکہ اولاد کے لیے آئی ہوئی ایک عورت کو یہ پیر صاحب قبرستان میں بارہ بجے رات کو نہانے کا کہہ رہے تھے اور ایک عورت کو شام میں اکیلے میں ملنے کے لیے کہا۔ میں تو ایسے ہی شغل میں چلی گئی تھی۔ آئندہ تو میرے باپ دادا کی توبہ کہ ایسی جگہ پر جاؤں۔ اس سے بہتر ہے کہ ان پیسوں سے میں پیزا کھا لوں۔" رباب نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆☆

"ایمان شانزے کی شادی ہو گئی تم گئی تھی مجھے تو اس نے بلایا نہیں تھا۔"

"نہیں یار میری امی بڑی اصول پرست ہیں اس کی امی نے صرف لڑکے کو بغیر ماں باپ باراتیوں کے گھر بلا کر اپنے دو چار لوگ اکٹھے کر کے نکاح کر دیا ہمیں ہمسائے ہونے کے ناتے بلایا تھا۔ جب امی کو وہاں اس قسم کے حالات دیکھنے کو ملے تو وہ خود بھی اٹھ کر آ گئیں اور مجھے بھی ساتھ لے آئیں۔ میری امی بہت غصے میں تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ جو لڑکا ماں باپ کے بغیر اکیلا آ گیا جو اپنے ماں باپ کا نہ ہو سکا اس کا کیا ہوگا اور اس کے والدین پر کیا گزر رہی

ہو گی۔ جنہوں نے محنت و مشقت اور محبت سے اسے پروان چڑھایا ہوگا اور اس کی شادی کے سپنے دیکھے ہوں گے۔ ایسی شادی میں شریک ہونا ایسے غلط لوگوں کو پروموٹ کرنا ظلم کا حصہ بننا ہے اور میں ڈر کے مارے امی کو یہ بھی نہیں بتا سکی کہ یہ سب جادو ٹونے کے زور سے ہوا ہے۔ ورنہ امی تو میری پٹائی ابو سے کرواتیں۔"

ایمان نے تفصیل سے رباب کو شانزے کی شادی کا حال سنایا۔

وقت گزرتا گیا۔ ایمان اور رباب میڈیکل کالج پہنچ گئیں۔ انہی دنوں ایمان کے لیے انکم ٹیکس آفیسر کا رشتا آیا اور وہ ماں باپ کی دعاؤں کی چھاؤں میں پیا گھر کے لیے رخصت ہوئی۔

رباب نے اسپتال جوائن کرلیا۔ کبھی کبھی دونوں سہیلیاں ملتیں تو بیتے دن یاد کرتی تھیں۔ ایک دن رباب نے ایمان کو فون کیا۔

"یار جلدی اسپتال آؤ۔" ایمان تفصیل پوچھتی رہ گئی اور رباب نے فون بند کردیا۔

ایمان نے ساس سسر کو بتایا اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔

"یار کیا بات ہے تم نے ایمرجنسی بلوایا ہے۔ تم ٹھیک تو ہونا۔" ایمان نے رباب کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں بس دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔"

"کیوں خدانخواستہ تمہیں ہارٹ پرابلم تو نہیں ہوگئی۔"

"نہیں وہ ڈاکٹر شیراز نے مجھے پرپوز کیا سو دل دھڑک دھڑک کے پسلیاں توڑ رہا ہے۔" رباب نے شرماتے ہوئے کہا۔

"واہ میری بنو کیا مشرقی اسٹائل ہے تمہارا اور شیراز اتنا الو نکلے گا کہ تمہیں پسند کرلیا۔ تم مجھے یہ بات فون پر بھی بتا سکتی تھیں۔"

"نہیں یہ بات تو ثانوی ہے۔ چلو میرے ساتھ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔" رباب نے سیریس ہوتے ہوئے کہا اور اسے پکڑے ہوئے وارڈ کی طرف چل پڑی۔

"ارے یہ کون ہے ہڈیوں کا ڈھانچہ اور جلی ہوئی صورت۔"

"پہچانو ذرا' ذہن پر زور دو۔"

"نہیں یار میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔"

"یہ شانزے ہے۔"

اتنی کریہہ صورت 25 سال کی عمر میں 75 کی نظر آتی ہوئی کسی نڈھال بڑھیا کی مانند۔

"نہیں یار یہ شانزے کیسے ہوسکتی ہے؟"

"میں بھی اسے نہیں پہچان پائی وہ تو اس کی امی ساتھ تھی اس لیے پتا چلا ابھی بے ہوش ہے۔ ہوش میں آتی ہے تو پھر بات کرتے ہیں۔"

"یا اللہ اس لڑکی کیا حالت ہوگئی۔" ایمان نے بیڈ کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شانزے ہوش میں آرہی ہے۔" ایمان نے رباب کو کال کرتے ہوئے کہا۔ رباب فوراً آگئی۔

"میں کہاں ہوں۔" شانزے نے مدھم آواز میں آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"تم اسپتال میں ہو' میں ایمان ہوں تمہاری دوست اور یہ ڈاکٹر رباب ہے ہماری دوست رباب۔" ایمان نے شانزے کو بیٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم ایمان ہو۔"

"ہاں میں ایمان ہوں تمہاری دوست اور یہ رباب اسی اسپتال میں ہے۔ لیکن تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی تمہاری تو شادی ہوگئی تھی۔"

"وہ شادی نہیں بربادی تھی میری اور میری ماں کی اور میری یہ حالت میرے گناہوں کا ثمر ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ سیف پر جادو ٹونہ کرکے میں نے اپنی طرف کرلیا تھا۔ پھر میری شادی بھی ہوگئی۔ جب کبھی تعویذ کا اثر کم ہوتا اس کے دل میں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبت جاگ اٹھتی۔ جب وہ ان کی طرف متوجہ ہونے لگتا میں نیا تعویذ پلا دیتی۔ تعویذوں کے بل بوتے شادی کب تک چلتی۔ اس کے والدین کا صبر پڑا کہ سیف بیٹھے بیٹھے کھو جاتا کبھی یکدم اجنبی لگنے لگتا۔ وہ اپنے گھر سے اس طرح جڑا ہوا تھا جس طرح پودا زمین میں جڑ سے جڑا ہوتا ہے۔ اکھیڑ کر کہیں اور لگاؤ تو مرجھا جاتا ہے پنپ نہیں پاتا۔ راتوں کو سوئے سوئے اٹھ جاتا' کبھی رونے لگتا نوکری چھوٹ گئی میں تعویذ اور عمل کے چکر میں غلط سے غلط عمل اپناتی گئی۔ کبھی قبرستان میں چلہ کاٹتی' کبھی بلی ذبح کرتی' کبھی لوبان سلگاتی۔ میری ان حرکتوں سے تنگ آکر سیف مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور کھانا پکاتے ہوئے پریشر ککر پھٹ گیا اور میرا چہرہ جھلس گیا۔ جس لڑکے کو حاصل کرنے کے لیے میں نے اور میری ماں نے غیر شرعی کام کیے وہ پھر بھی میرا نصیب نہ بن سکا کیونکہ جاتے جاتے وہ مجھے طلاق دے گیا۔ میں راتوں کو ڈرتی ہوں کبھی قبرستان کے مردے نظر آتے ہیں کبھی بلیاں چیختی چلاتی نظر آتی ہیں۔ امی مجھے اپنے گھر لے آئی ہیں اب میں اپنی ماں کے لیے بھی عبرت اور آزمائش ہوں اس لیے میں نے آج خودکشی کی کوشش کی تھی اور پھر تم نے مجھے بچالیا تم لوگ سناؤ کیا کررہے ہو۔"

"میری تو شادی ہوگئی انکم ٹیکس آفیسر سے اور اب ایک بچہ ہے اور رباب کی شادی جلد ہی ڈاکٹر شیراز سے ہونے والی ہے۔ اب میں چلتی ہوں کیونکہ جلدی میں نکلی ہوں بیٹا پریشان ہوگا جب میں نظر نہیں آؤں گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ تمہاری مشکل آسان کرے۔"

ایمان شانزے کو خدا حافظ کہتے ہوئے اٹھی۔ اسے امی کے الفاظ یاد آرہے تھے وہ "اپنی نیت کو دوسروں کے لیے صاف رکھو گی تو اللہ تمہیں بامراد کرے گا۔"

جرگہ

محترم عمران احمد'
السّلام علیکم!
میری تحریروں کو پزیرائی بخشنے کا شکریہ۔ آپ کی محبت کے باعث ہی مجھے نئے نئے موضوعات پر کہانیاں اکٹھا کرنے کا حوصلہ ہوا۔ اس ماہ "جرگہ" کے ساتھ حاضر ہوں۔ جرگہ سندھ بلوچستان' پنجاب اور خیبر پختونخوا میں صدیوں سے چلنے والی ایک ایسی روایت ہے جس کے منفی اور مثبت دونوں اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ آج کل اس موضوع پر اخبارات جرائد اور ٹی وی چینلوں پر بہت بحث ہو رہی ہے اور اس کے منفی فیصلوں کے باعث اس پر خاصا احتجاج کیا جا رہا ہے لیکن یہ غیر قانونی فیصلے اور جرگے اب بھی منعقد کیے جا رہے ہیں۔ زیر نظر کہانی بھی جرگے کے ایک ایسے ہی فیصلے کے پس منظر میں ہے جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

والسّلام
خلیل جبار
پنجرہ پول، حیدر آباد

جرگے کے فیصلے نے مجھ سمیت پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میری نیند اڑ گئی تھی' میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا' میری آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میرے سہانے سپنے راکھ کا ڈھیر بننے والے تھے' جس کا کبھی میں نے خواب و خیال میں تصور نہیں کیا تھا' یہی کچھ میرے اور میری دو بہنوں کے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ میری چھوٹی بہنیں اتنی بڑی خبر سے لاعلم تھیں' وہ ابھی بچیاں ہی تھیں فرشتوں کی طرح معصوم کھلونوں سے جی بہلانے والی' چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ملنے پر خوش ہو جانے والی' میری بہنیں گڈے گڑیا سے کھیل رہی تھیں' انہیں گڈے اور گڑیا کی شادی کرانے کا بہت شوق تھا۔

''تمہارا گڈا گندا ہے' میں اس گڈے سے اپنی گڑیا کی شادی نہیں کراؤں گی۔''

''تمہاری گڑیا کون سی حور پری ہے جو تم میرے گڈے میں نقص نکال رہی ہو۔''

''میری گڑیا کو جو دیکھتا ہے وہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے' تمہارا گڈا ہونہہ...... گندا ہے۔'' ندا نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری گڑیا کا چہرہ خراب کر دوں گی پھر دیکھوں گی کہ تم میرے گڈے کو کیسے خراب بتاتی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے شبانہ گڑیا کا چہرہ خراب کرنے کو لپکی۔

شبانہ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ندا نے اپنی گڑیا کو چھپا لیا اور اوندھی زمین پر گر گئی تاکہ وہ اس کی گڑیا کو چھین نہ سکے۔ شبانہ اس پر جھپٹی لیکن وہ گڑیا کو چھین لینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ غصے میں بھر کر اس نے ندا کو زور سے کمر پر گھونسا مار دیا۔

''ہائے اللہ!'' کہہ کر ندا نے رونا شروع کر دیا۔

''شبانہ! یہ اچھی حرکت نہیں' تم کیوں اپنی بہن کو مارتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ہمدردی کے دو بول بولنے پر ندا لپک کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس کو اپنی بانہوں میں لپیٹ لیا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلکنے پر شبانہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ارے باجی آپ رو رہی ہیں؟'' وہ لپک کر میری طرف آئی۔ ''باجی آپ نہ روئیں میں اب کبھی بھی ندا کو نہیں ماروں گی۔ قصور اسی کا ہے میرے گڈے کو برا کہنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''باجی آپ کیوں رو رہی ہیں' بجیے میں نہیں روں گی۔'' ندا نے مجھے روتا دیکھ کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

''تم پریشان نہ ہو' میں رو نہیں رہی' میری آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔ اس لیے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔'' میں نے کہا۔ میں اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

''باجی مجھے آنکھ دکھائیں' میں دیکھتی ہوں کہ آپ کی آنکھ میں کیا گر گیا ہے؟'' شبانہ بولی۔

''نہیں...... نہیں...... تم رہنے دو میں خود دیکھ لیتی ہوں کہ آنکھ میں کیا گر گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ خود کیسے دیکھیں گی؟''

''ظاہر سی بات ہے آئینے میں دیکھوں گی۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''اچھا اچھا...... آپ آئینہ میں دیکھ کر آنکھ میں گر اکچرا نکال لیں گی۔'' شبانہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں صحن میں جا کر کھیلو' امی آنے والی ہیں پھر ہم کھانا کھائیں گے اور ہاں لڑنا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا باجی ہم نہیں لڑیں گے لیکن ندا کو کہہ دیں کہ یہ میرے گڈے کو کچھ نہ کہے۔ میں اپنے گڈے کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔'' شبانہ نے کہا۔

''ندا یہ اچھی بات نہیں ہے تم اپنی بہن کے گڈے کو برا کہتی ہو۔''

''اچھا باجی میں نہیں کہوں گی حالانکہ اس کا گڈا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن آپ کہہ رہی ہیں اس لیے خاموش رہنا پڑے گا۔'' ندا نے کہا۔

''دیکھ لیں باجی میرے گڈے کے بارے میں پھر کہہ رہی ہے۔'' شبانہ نے کہا

''چلو جاؤ جلدی سے صحن میں۔'' میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

میرے غصے کا اظہار کرنے پر وہ دونوں کمرے سے بھاگ کر صحن میں چلی گئیں۔

دونوں کے صحن میں جانے پر پھر سے مجھے وہی خیالات ستانے لگے۔

''اب کیا ہوگا؟ بات ذرا سی تھی جس پر یہ دن ہمیں دیکھنا پڑ رہے تھے۔ میرا بھائی نعمان شروع سے ہی جذباتی واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا اگر کوئی غلطی سے اس کے کسی بھی دوست کے خلاف کچھ بول دیتا تو وہ مشتعل ہو جاتا تھا' ہم سب گھر والے اس کو سمجھاتے تھے کہ وہ ایسا نہ کرے کوئی شخص تمہارے دوست کے خلاف کچھ کہہ رہا ہے تو پہلے اس کو غور سے سنو اگر وہ غلط کہہ رہا ہے تو اس کو سمجھاؤ کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے' ایسی بات نہیں ہے اور اگر تمہارے دوست میں واقعی وہ خامی ہے تو پھر اپنے دوست کو اس طرح سمجھاؤ کہ اسے برا بھی نہ لگے اور وہ بات کو سمجھ کر اپنی اصلاح کرے' میں ایم بی بی ایس فائنل ائیر کی طالب علم ہوں' ہم سب کا یہی خیال تھا کہ میڈیکل کی تعلیم مکمل ہو جانے پر میں شہر میں اپنا کلینک کھول لوں گی اور اچھی طرح سیٹ ہو جانے پر گھر والوں کو بھی گاؤں سے اپنے پاس بلا لوں' مجھے کیا خبر تھی ہمارے ساتھ ایسا ہو جائے گا۔ جس دن واقعہ ہوا میں سردی کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں آئی ہوئی تھی' میرا بھائی نعمان گاؤں کے پیالہ ہوٹل پر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' صبح کے وقت گپیں لڑا رہا تھا' گاؤں میں نوجوانوں کی یہی تفریح ہوتی ہے۔ ہوٹل پر بیٹھ کر اخبار پڑھ کر ملک کے حالات پر تبادلہ خیال کر لیا یا اپنی پرانی یادوں کو تازہ کر لیا۔ میرا بھائی

نعمان واقعہ کے روز اپنے دوست سونگی، سرور کمہار، حفیظ مغل کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اشرف سونگی کے تین دوست عارف، نعیم اور راجو آگئے ان کا کسی بات پر اشرف سے تنازعہ چل رہا تھا، انہوں نے آتے ہی اشرف سونگی سے بدتمیزی کی اور ان کی اس بدتمیزی پر نعمان نے روکا لیکن انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، وہ اشرف کو اپنے ساتھ پکڑ لے جانا چاہتے تھے اس بات نے نعمان کو مشتعل کردیا۔ اس نے آؤ دیکھا نا تاؤ اپنے پاس بیٹھے ایک مزدور کے پاس سے کلہاڑی لے کر ان پر حملہ کردیا۔ وہ تینوں اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھے، چند منٹوں میں ہی نعمان نے تینوں کو خون میں نہلا دیا، ان کو خون میں لت پت دیکھ کر نعمان اور اس کے دوست حواس باختہ ہوگئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل میں موجود لوگوں نے زخمیوں کو شہر لے جا کر علاج کرانے کی کوشش کی لیکن زخم اتنے گہرے تھے کہ وہ موقع پر ہلاک ہوگئے، ان کے ہلاک ہونے پر ہم پر یہ مصیبت نازل ہوگئی تھی۔

گاؤں میں جرگہ بیٹھا اور یہ فیصلہ ہوا کہ مرنے والوں کے لواحقین اس قتل کو معاف کردیں گے، ان کے معاف کردینے پر نعمان اور اس کے دوستوں کو جیل سے رہائی مل جائے گی لیکن اس کے صلے میں ہم تینوں بہنوں کو ان کے تینوں بوڑھے باپوں سے شادی کرنی ہوگی۔ اس صورت میں قتل معاف ہوسکتا ہے۔ نعمان کے دوستوں کے لواحقین سے کوئی تقاضا نہیں کیا گیا تھا کیونکہ قتل نعمان سے ہوا تھا۔ اس لیے قصوروار وہی تھا۔ قتل نعمان سے اتفاقی ہوا تھا اس کا انہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن سزا ہمیں کس بات کی دی جارہی تھی کہ جوان بوڑھوں کے ساتھ شادی کریں۔ جرگے کے اس فیصلے سے میرے سارے خواب چکنا چور ہوجاتے۔ ہم گاؤں سے بھاگ بھی نہیں سکتے، بھرپور طریقے سے ہماری نگرانی ہو رہی تھی۔

جرگے کے لوگوں نے موبائل تک چھین لیا تاکہ میں شہر سے کسی قسم کی مدد حاصل نہ کرلوں، فاخرہ کو دیکھ کر میرے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی اور امید کی کرن نظر آئی۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کی رہائش شہر میں ہی تھی لیکن اس کی ممانی ہمارے گاؤں میں رہتی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ میری بہترین دوست تھی۔ میں اس سے ہر قسم کی بات کرلیا کرتی تھی، ہم دونوں کا ایک دوسرے پر انوکھا اعتماد تھا۔

"کیا بات ہے مونا! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟" اس نے میرے اداس چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "کیا نعمان کی یاد آرہی ہے؟"

نعمان ہمارے ساتھ ہی میڈیکل کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اس لیے نعمان کی فاخرہ سے بھی دوستی ہوگئی تھی۔ فاخرہ کے اصرار پر میں نے اس کو پوری کہانی سنادی جو ہم پر گزر رہی تھی، جس کو سن کر وہ حیرت میں پڑ گئی تھی کہ اس دور میں اس طرح ہوتا ہے۔

"تم نے مجھے فون کرکے ساری تفصیل کیوں نہیں بتائی؟" اس نے کہا۔

"کیسے بتاتی جرگے والوں نے موبائل فون چھین لیا ہے اور گھر سے باہر بھی نہیں نکلنے دے رہے ہیں کہ ہم فرار نہ ہوجائیں۔"

"تم ایسا کرو میرے بھائی عادل سے موبائل فون پر بات کروان کا شہر کے بہت اچھے وکیلوں میں شمار ہوتا ہے، وہ اس مسئلے کو کسی طرح سلجھا دیں گے اور تمہاری جان بھی چھوٹ جائے گی۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں لیکن فاخرہ کے اصرار پر میں نے اس کے وکیل بھائی عادل سے گفتگو کرکے مختصراً سارا احوال سنادیا جس کو سن کر وہ خود بھی پریشان ہوگئے اور مجھے مشورہ دیا میں کسی سے بھی عادل سے بات چیت کرنے کا ذکر نہ کروں۔ فاخرہ چلی گئی۔ فاخرہ جب ہمارے گھر سے نکلی جرگے کے جاسوس کارندوں نے فاخرہ کو روک لیا اور زبردستی اس کی تلاشی لینی شروع کردی لیکن اس کے پاس سے تحریری طور پر کچھ نہ ملنے پر انہوں نے دھمکی دی کہ وہ کسی سے بھی مجھ سے ہونے والی گفتگو کا ذکر نہ کرے۔ ورنہ اسے اور اس کی ممانی کو ہلاک کردیا جائے گا۔ فاخرہ انہیں دیکھ کر بدحواس ہوگئی تھی اور اس نے کسی کو نہ بتانے پر انہوں نے اس کی جان اس شرط پر چھوڑ دی کہ جب تک یہ معاملہ حل نہیں ہوجاتا وہ شہر نہیں جائے گی۔

یہ بھی شکر ہوا کہ انہیں دیر سے خبر ملی تھی ورنہ وہ مجھ سے عادل کی گفتگو ہی نہیں ہونے دیتے یا اس سے موبائل چھین کر مجھ سے ملاقات کی اجازت دیتے۔

☆......☆......☆

کئی دن گزر گئے عادل سے گفتگو کرنے کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ وہ دن بھی آگیا جب جرگے کے فیصلے پر عمل ہونا تھا، ہم تینوں کو زبردستی دلہن کے کپڑے پہنا کر اس مقام پر لے جایا گیا جہاں ہم تینوں کا نکاح ان بوڑھے لوگوں سے ہونا تھا۔ میری ماں خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ باپ بھی مجبور و بے کسی سے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھا، گاؤں میں کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ جرگے کے خلاف آواز اٹھا سکے۔

میں بہت اداس تھی، میں نے جو مستقبل کے سپنے دیکھے تھے وہ چند لمحوں میں ریزہ ریزہ ہونے جارہے تھے میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ علاقے کے لوگ سمجھ رہے تھے کہ والدین کی جدائی میں رو رہی ہوں لیکن مجھ سے زیادہ یہ کون جان سکتا تھا کہ مجھے کس بات کا دکھ ہے، میری چھوٹی بہنیں اپنے انجام سے بے خبر دلہنوں کے کپڑے پہن کر خوش ہو رہی تھیں۔

"باجی کتنے اچھے کپڑے ہمیں پہننے کو ملے ہیں پھر بھی آپ رو رہی ہیں؟" شبانہ نے کہا۔

"باجی ہماری شادی ہو رہی ہے، کتنی خوشی کی بات ہے۔" ندا نے کہا۔

ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے پر میرے جذبات سے تیز سسکیاں نکل گئیں، وہ دونوں میرے سسکیاں لینے پر ایسے سہم گئیں کہ جیسے ان کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو۔

مسجد کا پیش امام گھبرائی ہوئی حالت میں نکاح کے فارم اور رجسٹر تھامے مقررہ جگہ پہنچ گیا۔ ابھی مولوی صاحب نے قرآنی آیات کا ورد ہی شروع کیا تھا کہ چاروں طرف سے پولیس کے گھیرا ڈال دینے پر وہ پڑھنا بھول گیا، وہاں پر موجود سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ فاخرہ کے بھائی عادل وکیل کو دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

"بے فکر رہو، ہم پہنچ گئے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔" عادل نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ پولیس کے آنے سے بہت فائدہ ہوگیا تھا۔

پولیس نے ہم سب کو عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے ملزمان کو جیل بھیج دیا اور ہم سب بہنوں کو آزاد کردیا۔

میرا عادل کو اس کے موبائل فون پر فون کردینا فائدہ مند رہا۔ اس نے عدالت میں جرگے کے خلاف درخواست دی تھی جس پر یہ کارروائی ہوئی تھی، واقعی انسان ہمت کرے تو سب کچھ ممکن ہے۔

❖

قسط نمبر 2

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر ذہن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹھاٹھ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادوگر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

میں کچھ مطمئن ہوگیا۔ آخر جھونپڑ پٹی میں اتنے مسلمان رہتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے ہندو غنڈوں کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں واپس چلنے کے لیے اٹھا تو قاسم بھائی نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے چھوڑنے جھونپڑوں کی اس بستی کے کنارے تک آیا۔ میں نے خدا حافظ کہا تو عائشہ کے باپ نے میرے ماتھے کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے کہا۔

''بیٹا یہ تلک مٹادو۔ اب تمہیں ہندو کا روپ دھارنے کی کیا ضرورت ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔

''چچا! ابھی اس کی ضرورت ہے۔''

اور میں جھونپڑ پٹی کی مفلوک الحال آبادی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ایک بس مل گئی۔ لوکل بس نے مجھے ٹرام کے جنکشن تک پہنچایا وہاں سے دوسری بس لے کر میں سیمنگٹن روڈ والے بس اسٹاپ پر اتر گیا۔

اپنی چالی یعنی فلیٹ میں آیا تو رام دلاری مجھے ڈانٹنے لگی۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟ چھ بجے کا شو نو بجے ختم ہوجاتا ہے اور اب گیارہ بجنے والے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''دیدی! بڑا رش تھا۔ کوئی خالی بس نہیں ملی۔ آدھا راستہ پیدل چل کر آنا پڑا۔''

میں نے دیکھا کہ رام دلاری بڑی بنی سنوری ہوئی تھی۔ اس نے نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سرخی پوڈر بھی خوب لگایا ہوا تھا۔ عطر کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ وہ دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''دیدی! آج شوٹنگ ہے کیا؟''

''ہاں......'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

میں نے پرشوق لہجے میں کہا۔

''دیدی! کیا مجھے شوٹنگ پر نہ لے جاؤ گی؟''

رام دلاری نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کہنے لگی۔

''تم کیوں چلو گے میرے ساتھ؟ کیا تم پر...

چاہتے ہو کہ میں گندی نالی میں کیسے زندگی بسر کررہی ہوں؟ جاؤ پلنگ پر پڑ کر سوجاؤ۔''

میں اسی طرح کونے والے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ساتھ والی چالی سے گراموفون پر بجنے والے ایک فلمی گانے کے ریکارڈ کی آواز آرہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ رام دلاری نے بلند آواز سے پوچھا۔

''کون ہو؟''

''میں ہوں رامو۔''

''آجاؤ۔''

میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے ایک چھوٹے قد کے کالے آدمی کو اندر آتے دیکھا۔ اس نے گلے میں لال رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

''بائی! سیٹھ کی موٹر آ گئی ہے۔ باہر ناکے پر کھڑی ہے۔''

رام دلاری نے سیٹھ کو گالی دے کر کہا۔

''چلو چلو۔''

میری طرف دیکھ کر کہا۔

''میں باہر سے تالا لگا کر جارہی ہوں۔ دو تین گھنٹے مجھے لگ جائیں گے۔ رسوئی میں پھلکے بھاجی رکھی ہوئی ہے۔''

وہ باہر سے دروازے کو تالا لگا کر چلی گئی۔

میرا ذہن عائشہ کے متعلق سوچنے لگا۔ مندر کے پجاریوں کو اب تک معلوم ہوچکا ہوگا کہ عائشہ کو کوئی شخص کوٹھڑی سے نکال کر لے گیا ہے۔ ہوسکتا ہے مندر کے بڑے پجاری نے اپنے آدمی عائشہ کو دوبارہ اغوا کرانے کے لیے اس کی جھونپڑی کی طرف بھیج دیئے ہوں۔ اس سارے علاقے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ایک طرح سے وہ ہندوؤں کا ہی علاقہ تھا۔ دیوی امبے کا مندر بہت اہم مندر تھا اور اس کے بڑے پجاری مہنت کا پولیس میں زبردست اثر و رسوخ تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ بقول رام دلاری اس کے اشارے پر مندر میں داخل ہونے والے مسلمان کو قتل کردیا جاتا تھا اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہتی تھی۔

مجھے بے چینی سی لگ گئی۔ میں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مندر کے غنڈے جھونپڑ پٹی میں پہنچ کر عائشہ کو دوبارہ اغوا کرکے لے گئے ہیں اور اب انہوں نے اسے نہ جانے کہاں بند کیا ہوگا؟ یہ تو مندر کے بڑے مہنت کا کاروبار تھا۔ بقول رام دلاری کے غریب اور بے سہارا مسلمان لڑکیوں کو اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرا کے مندر میں لاتا تھا اور وہاں سے انہیں جنوبی یا وسطی ہند کے مندروں میں اپنے ایجنٹ کے ہاتھوں بھجوا دیتا تھا جہاں انہیں دیوداسی بنا کر مندر کی چار دیواری کے اندر ایک طرح سے قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ان میں ہندو دیوداسیاں بھی ہوتی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں بعض غریب ہندو ماں باپ اپنی کوئی منت پوری ہوجانے کے بعد بیٹی کو مندر کے دیوتا کے ساتھ بیاہ دیتے تھے۔ پتھر کے دیوتا کی جگہ مندر کا پجاری دلہا بن کر آجاتا تھا اور مندر کی بھینٹ چڑھائی گئی ہندو لڑکی کو اپنی دیوداسی بنا کر رکھ لیتا تھا۔ ایسی کئی دیوداسیوں کو میں نے بیجواڑہ، مجورا اور رامیشورم کے مندروں میں پوجا تہواروں پر رقص کرتے دیکھا تھا۔ ایسے تہواروں کے موقع پر ان دیوداسیوں کو کوئی نشہ پلادیا جاتا ہے اور وہ بڑے جوش کے ساتھ ہنومان اور شیو دیوتا کے بتوں کے سامنے رقص کرتی ہیں اور ہندو پجاری ان سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔ ان دیوداسیوں کی کوئی عزت آبرو نہیں ہوتی۔ وہ مندر کے بڑے پجاری کی ملکیت ہوتی ہیں اور وہ اپنا سماجی اثر و رسوخ بڑھانے کے

واسطے ان دیوداسیوں کی مدد بھی حاصل کرتا رہتا ہے۔
عائشہ ایک بے کس و غریب مسلمان لڑکی تھی۔ ہندو غنڈے اگر جھونپڑ پٹی میں چاقو چھریاں لہراتے پولیس کی شہ پر داخل ہوئے ہوں گے تو قاسم بھائی اور دوسرے غریب مسلمان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہوں گے۔ وہ عائشہ کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ مجھے عائشہ کی چیخیں' اس کے رونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں پلنگ سے نیچے اتر کر دروازے تک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اسے باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک ایسا طوفان بیدار ہو گیا تھا کہ جو مجھے ابھی اسی وقت عائشہ کی جھونپڑی میں لے جانا چاہتا تھا مگر دروازے پر باہر سے تالا پڑا تھا۔ جالی کی کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ دروازے کے اوپر صرف ایک روشن دان تھا جس پر لوہے کا جنگلا چڑھا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں بے بس سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور یہ سوچ کر دل کو تسلیاں دینے لگا کہ ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں مچا ہوا کہ ہندو غنڈے بے دھڑک جھونپڑ پٹی میں آ کر ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں۔ آخر بستی کے دوسرے مسلمان ضرور میدان میں نکل آئے ہوں گے۔
مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ چولہے کے پاس پیتل کی تھالی میں رام دلاری میرے لیے رومال میں تھوڑی سی بھاجی اور تین پھلکے لپیٹ کر رکھ گئی تھی۔ وہیں چوکی پر بیٹھ کر میں نے تین پھلکے کھائے' پانی پیا اور پلنگ پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔
کمرے میں آہٹ کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ رام دلاری آ گئی تھی اور دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا رہی تھی۔ رات کو وہ پلنگ پر سوتی تھی اور میں نیچے کرسیوں کے پاس دری پر سوتا تھا۔ اس نے ساڑھی بدلتے ہوئے مجھے جگانے کے لیے آواز دی۔
"راج کمار اٹھو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"
میں جلدی سے اٹھا اور نیچے دری پر پڑ گیا۔
"تم نے کھانا کھا لیا تھا؟"
"ہاں دیدی!" میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔
رام دلاری نے کپڑے بدلے اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گئی میں نے پوچھا۔
"دیدی! ٹائم کیا ہوا ہے؟"
رام دلاری نے آہستہ سے کہا۔
"دو بج چکے ہیں۔ سو جاؤ۔"
میرا ذہن عائشہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس لڑکی کو میں نے بہن کہا تھا اور یقین کریں مجھے اس سے بہن کی طرح پیار ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میں ایک بار پھر نیند کی وادی میں گم ہو گیا۔
صبح آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ رام دلاری پلنگ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ روشن دان سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں رام دلاری کے جاگنے سے پہلے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے کھرے میں بالٹی کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ماتھے پر ہندوانہ تلک کا جو سرخ نشان لگا تھا اسے رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ اس کی ابھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں دیوی کے مندر میں نہیں بلکہ جھونپڑ پٹی میں عائشہ کے بارے میں معلوم کرنے جا رہا تھا کہ کہیں مندر کے لوگ اسے دوبارہ اغوا کر کے تو نہیں لے گئے۔ میں نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کو دوبارہ آہستہ سے بند کر دیا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ بلڈنگ کے لوگ جاگ چکے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر کر بلڈنگ کے احاطے میں سے گزرتا' گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ گیا۔
جھونپڑ پٹی کے لیے میں نے سینگلٹن روڈ کے

ناکے سے ایک بس پکڑی۔ پارسی کے بت کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہاں سے ٹرام کار میں سوار ہو کر بڑے گندے نالے کے پل کے قریب اتر گیا۔ گندے نالے کے پل کی دوسری جانب جھونپڑیوں کی بستی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جھونپڑ پٹی کی گندی شور مچاتی گلیوں میں سے گزرتا عائشہ کی جھونپڑی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ جھونپڑی خالی پڑی ہے۔ وہاں نہ عائشہ تھی' نہ اس کی ماں اور نہ باپ تھا۔ میں پریشان سا ہو کر وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی ایک جھونپڑی سے نکل کر میری طرف آیا۔ وہ مسلمان تھا۔ اس کے گلے میں زرد رومال تھا اور سر پر سفید کروشیے کی ٹوپی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے پوچھا۔
"تم قاسم بھائی کی تلاش میں آئے ہو؟"
میں نے کہا۔ "جی ہاں...... وہ کہاں ہیں؟"
"میرے ساتھ آؤ۔"
وہ تین جھونپڑیاں چھوڑ کر اپنی جھونپڑ میں لے گیا۔ مجھے چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود ایک موڑھا گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔
"بیٹا! تم نے قاسم بھائی کی بچی کو کافروں کے چنگل سے نکال کر جو نیک کام کیا تھا اس کا اجر تمہیں خدا دے گا۔ قاسم بھائی نے تمہارے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔"
میں نے بڑے میاں کی بات کاٹتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔
"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟"
بڑے میاں نے کہا۔
"پولیس ان تینوں کو پکڑ کر تھانے لے گئی تھی۔"
"کس جرم میں؟" میں نے پوچھا۔
بڑے میاں نے کہا۔
"قاسم بھائی کا جرم یہ تھا کہ وہ بمبئی کی جھونپڑ پٹی میں رہنے والا غریب اور بے سہارا مسلمان ہے۔ پولیس انگریز کی ہے اور انگریز ہندو کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے دشمنی کا سلوک کرتا ہے۔"
میں نے بڑے میاں سے پوچھا کہ پولیس نے انہیں ساتھ لے جانے کی کوئی وجہ بھی تو بتائی ہو گی۔
بڑے میاں نے چہرہ میری طرف اٹھا کر کہا۔
"بیٹا! وجہ کوئی نہیں تھی۔ صرف بہانہ تھا کہ امبے دیوی کے مندر کی قیمتی مورتی چوری ہو گئی ہے اور مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ یہ مورتی قاسم بھائی کی جھونپڑی میں چھپائی گئی ہے۔ پولیس آئی' جھونپڑی کی تلاشی لی۔ مورتی نہ ملی تو ان تینوں کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔"
"آپ لوگوں نے کچھ نہیں کیا؟"
"کیا کرتے؟" بڑے میاں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"تم پنجاب سے آئے ہو۔ تمہیں کیا پتا یہاں کے صوبے میں مسلمان کتنی غربت اور بے کسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ احمد آباد' بڑودہ اور بمبئی کے سارے کارخانوں کے مالک ہندو سیٹھ ہیں مسلمان صرف ریڑھی بان ہیں۔ سرکار انگریز کی ہے اور انگریزوں نے ہندو قوم کے آدمیوں کو بڑے بڑے افسر لگایا ہوا ہے۔ اور یہ جو امبے دیوی کا مندر ہے اس کا مہنت تو بے حد اثر و رسوخ والا ہے۔ قاسم کی بیٹی کو اسی کے اشارے پر اغوا کیا گیا تھا۔ جب تم اسے نکال کر لے آئے تو مندر کے مہنت نے اپنے خاص پجاری کو پولیس کے ساتھ بھیج کر جھونپڑی پر چھاپہ ڈلوا دیا۔ مقصد قاسم بھائی کی بیٹی کو دوبارہ اغوا کرانا تھا۔ بستی کے مسلمانوں نے آج جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا ہے مگر مجھے معلوم ہے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔"
میں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے تھانے جا کر معلوم

نہیں کیا کہ قاسم بھائی اس کی بیوی اور بیٹی کس حالت میں ہیں؟ کوئی وکیل ہی کر لیں۔"

بڑے میاں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔

"اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ بات مجھے میرے ستر سال کے تجربے نے بتائی ہے۔"

میں نے پوچھا۔"وہ تھانہ کہاں ہے جہاں پولیس ان لوگوں کو لے گئی ہے؟"

بڑے میاں نے تھانے کا نام بتایا۔ ساتھ ہی کہا۔

"برخوردار تم ناسمجھ ہو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا تھانے مت جانا۔ پولیس مورتی کی چوری کے جھوٹے کیس میں تمہیں بھی پکڑ لے گی۔"

میں نے کہا۔"آخر ان کا کچھ تو پتا چلنا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں؟"

بڑے میاں نے ایک لمحے کے لیے مجھے گھور کر دیکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آخر تمہیں قاسم بھائی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ ان کی خاطر تم اپنی جان بار بار مصیبت میں کیوں ڈال رہے ہو؟ پجاری کو معلوم ہو گیا کہ تم نے عائشہ کو مندر سے فرار کرایا ہے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔"

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"میں نے عائشہ کو اپنی بہن کہا ہے۔ اب وہ میری بہن ہے۔ میں ہندو غنڈوں سے اس کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔"

بڑے میاں آنکھیں پوری کھولے مجھے تک رہے تھے۔ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"تمہاری مرضی میاں...... جو جی میں آئے کرو۔"

یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی وہاں سے اٹھا اور بستی کی گندی گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ بڑے میاں کی نصیحت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر میں تھانے گیا تو پولیس مجھے بھی پکڑ سکتی تھی اور اگر کسی طرح انہیں یہ پتا چل گیا کہ یہ میں ہی ہوں جو عائشہ کو مندر کی کوٹھڑی کا تالا توڑ کر نکال لے گیا تھا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر سکتے تھے لیکن میں عائشہ اور اس کے ماں باپ کو مصیبت کے وقت اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عائشہ سے واقعی مجھے اپنی بہنوں کی طرح پیار ہو گیا تھا۔ سڑک کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مجھے عائشہ اور اس کے ماں باپ کے حالات معلوم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اتنے بڑے بمبئی شہر میں میں ایک پردیسی تھا' سوائے رام دلاری کے میرا وہاں کوئی ہمدرد اور دوست نہیں تھا۔ رام دلاری سے میں مشورہ یا مدد نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ خود ہندو تھی اور امبے دیوی کی پجارن تھی۔ وہ یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ایک مسلمان لڑکا امبے دیوی کی دیوداسی کو مندر سے نکال کر لے جائے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پولیس اسٹیشن چلنا چاہیے۔ وہاں جا کر کسی بہانے معلوم تو کروں کہ عائشہ اور اس کے ماں باپ وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے ماتھے پر تلک نہیں لگا رکھا تھا۔ اگر تلک لگایا ہوتا تو میں ہندو بن کر تھانے میں جا سکتا تھا۔ کیونکہ جھونپڑ پٹی کے بڑے میاں نے بتایا تھا کہ تھانے کا انچارج ایک مرہٹہ ہندو ہے۔ میں نے سوچا کہ میں پولیس اسٹیشن کے اندر نہیں جاؤں گا۔ دور سے جائزہ لوں گا اور اگر موقع ملا تو کسی سنتری سے عائشہ کے گھر والوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے بڑے میاں نے پولیس اسٹیشن کا راستہ بتا دیا تھا اور یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہاں تک کس نمبر کی بس جاتی ہے۔

میں وہیں سے سڑک کی دوسری جانب ہو گیا۔ کیونکہ اس جانب مجھے لوکل بس سٹاپ کا لال نشان اور فٹ پاتھ پر بنا ہوا چھوٹا سا شیڈ نظر آ رہا تھا۔ دو تین آدمی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے نمبر کی بس وہیں آئے گی۔ دو تین ڈبل ڈیکر بسیں آ کر گزر گئیں۔ آخر میرے نمبر والی بس بھی آ گئی۔ میں بس میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بمبئی شہر کی گنجان سڑکوں کے چکر لگانے کے بعد بس ایک اسٹاپ پر رکنے لگی تو کنڈیکٹر نے اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نام اونچی آواز میں پکارا۔ میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔ ایک دکان دار سے پولیس اسٹیشن کا پتا پوچھا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ اچانک میرے قدم رک گئے۔ کسی نے پیچھے سے میرا نام لے کر مجھے آواز دی تھی۔

"کہاں جاتا ہے؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے فٹ پاتھ خالی تھی۔ میں کچھ حیران اور کچھ خوفزدہ سا ہو کر آگے چل پڑا۔ جیسے ہی میں نے قدم اٹھائے پیچھے سے پھر اسی مردانہ آواز نے میرا نام لے کر کہا۔

"کہاں جاتا ہے؟"

میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مڑ کر دیکھا پیچھے کوئی نہیں تھا پھر یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟

آواز میں نے برابر سنی تھی اور آواز دینے والے نے میرا نام بھی لیا تھا مگر میرے پیچھے فٹ پاتھ خالی تھا۔ اسی وقت میرے دل نے کہا کہ یہ کوئی غیبی آواز ہے جو تمہاری راہ نمائی کرنا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ پہلے بھی اس قسم کے مافوق الفطرت واقعات پیش آ چکے تھے کہ رات کے وقت کسی جنگل سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی میرے قریب

سے ہو کر گزر گیا ہو۔ ایک دفعہ میں منہ اندھیرے امرتسر کے کمپنی باغ میں سیر کر رہا تھا کہ مولسری کے ایک درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت ہلکا سا نقرئی قہقہہ لگا کر میرے قریب سے نکل گئی ہو۔ چنانچہ بمبئی کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے جب مجھے غیبی آواز آئی تو میں حیران ضرور ہوا مگر خوف زدہ بالکل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میں نے اپنی چلنے کی رفتار آہستہ کر لی اور غیبی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ وہی آواز پھر سنائی دی مگر اب یہ آواز بڑے قریب سے آئی تھی جیسے کوئی غیبی شخص میرے ساتھ چل رہا ہو۔ غیبی آواز نے کہا۔

”او پنجابی! املی والے تکیے میں جا' وہاں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”یہ تکیہ کہاں ہے؟“

غیبی آواز نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اب یہ بھی میں تمہیں بتاؤں؟ جا' چوک کے پار املی والا تکیہ ہے۔“

اس کے بعد آواز غائب ہو گئی۔ میں چلتے چلتے چوک میں پہنچ گیا میں نے فٹ پاتھ پر رک کر دائیں بائیں اور سامنے دیکھا چوک کے پار مجھے ایک جگہ ایک گھنا درخت دکھائی دیا جس پر سبز رنگ کا جھنڈا لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی املی والا تکیہ ہے۔ یہ ایک ایسا ہی مزار تھا جس قسم کے مزار ہمیں برصغیر کے تقریباً ہر شہر میں کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ احاطے میں ایک جانب کچھ فقیر بیٹھے تھے۔ ایک طرف پھول بیچنے والے کا کھوکھا تھا۔ کچھ لوگ وہاں کھڑے پھولوں کے ہار خرید رہے تھے۔ فضا میں اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے درخت کو دیکھا۔ یہ املی کا درخت ہی تھا۔ مجھے املی کے درخت کی پہچان تھی۔ امرتسر میں مجیٹھ روڈ پر املی کا ایک گھنا درخت ہوا کرتا تھا۔ میں اسکول سے بھاگ کر وہاں جا کر درخت سے کچی املی توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ لاہور کے باغوں میں مجھے کہیں املی کا درخت نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کسی گھر کے آنگن میں اگا ہوا ہو۔

میں مزار کے پہلو میں آیا تو دیکھا اینٹوں کے چھوٹے سے چبوترے پر ایک فقیر بیٹھا تھا۔ وہ مجذوب لگتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔

”او پنجابی! اس عورت سے بات کر جس کو تو ڈاکوؤں سے بچا کر لایا تھا۔“

میرے قدم اپنے آپ رک گئے۔ میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”محترم میں اس سے کیا پوچھوں؟“

مجذوب نے تلخ لہجے میں کہا۔

”یہی پوچھ کہ تمہاری بہن عائشہ کہاں ہے؟“

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”محترم آپ ہی بتا دیجیے کہ عائشہ کہاں ہے؟“

مجذوب غصے میں آ گیا۔ گرج دار آواز میں بولا۔

”میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا دفع ہو جا یہاں سے۔ جاتا ہے کہ نہیں؟“

مجذوب کے پاس ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ وہ مجھے مارنے کے لیے اٹھا۔ میں بھاگ کر مزار کے احاطے سے باہر آ گیا۔ میں ایک طرف رک کر غور کرنے لگا۔ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے میں پہلے ہی جھجک رہا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں سے مجھے عائشہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ اگر پولیس والوں کو ذرا بھی مجھ پر شبہ ہو گیا تو وہ مجھے وہیں پکڑ لیں گے۔ مجذوب نے مجھے

بڑا درست مشورہ دیا تھا۔ رام دلاری اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے پولیس اسٹیشن جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور وہیں سے واپس چل پڑا۔ جب چالی میں پہنچا تو رام دلاری جاگی ہوئی تھی اور چولہے کے پاس بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنے لگی۔

”تم دروازہ کھلا چھوڑ کر کہاں صبح صبح چلے جاتے ہو؟ تمہاری کھوپڑی میں بھیجہ ہے کہ نہیں؟ جانا تھا تو مجھے جگا دیا ہوتا۔“

میں اس سے معافی مانگنے لگا۔

”دیدی! میں پارک میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ معاف کر دو۔ اب ایسا نہیں کروں گا۔“

رام دلاری نے پیار بھرے غصے کے ساتھ پوچھا۔

”ناشتہ کیا ہے کہ نہیں؟“

میں اس کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔

”نہیں دیدی! ناشتہ تمہارے ساتھ کروں گا۔“

رام دلاری ہنس پڑی۔ میرے آگے کپ رکھتے ہوئے بولی۔

”میں کیا کروں' تم مجھے چھوٹے بھائی لگتے ہو' تم نے ماتھے پر تلک کیوں نہیں لگایا؟ اچھا نہ لگاؤ۔ تم مسلمان ہو' مجھے مسلمان بڑے اچھے لگتے ہیں۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کیا کرتی ہوں کہ میرا دوسرا جنم کسی مسلمان کے گھر میں ہو مگر معلوم نہیں دوسرا جنم ہوگا بھی کہ نہیں' لو یہ بند بھی کھاؤ۔“

میں رام دلاری کے ساتھ اصل بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”دیدی! میں تم سے ایک بڑی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

رام دلاری نے میری طرف دیکھے بغیر اپنی خالی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا پیسوں کی ضرورت ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

”تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟“

اور میں نے رام دلاری کو عائشہ کے بارے میں شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان بیان کر دی۔ جب میں ساری کہانی بیان کر چکا تو رام دلاری نے میرا کان کھینچتے ہوئے کہا۔

”تو اس جھنجٹ میں کیوں پڑ رہا ہے؟ تجھے کیا لینا ہے اس سے؟“

میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”دیدی! عائشہ ایک غریب مسلمان لڑکی ہے۔ اسے دیوی کے ہندو پجاری اغوا کر کے اس کی زندگی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ عائشہ مسلمان ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں نے اسے بہن کہا ہے۔ بہن نہ بھی کہتا جب بھی میں اسے ہندو غنڈوں سے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا۔“

رام دلاری میرا منہ تک رہی تھی۔ میری گفتگو سے زیادہ میرے پر جوش لہجے کا اس پر زیادہ اثر ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

”کہتا تو ٹھیک ہے' اگر تو ڈاکوؤں کے چنگل سے مجھے نکالنے کے لیے میری مدد کر سکتا ہے تو ایک مسلمان لڑکی کو بدمعاش پجاریوں سے بچانا تیرا فرض بنتا ہے۔ اسے دیوی تو بڑی اچھی ہے مگر یہ جو اس کے پجاری ہیں یہ چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں میں ان سب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ مسلمانوں کی تو جان کے دشمن ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”دیدی! بتاؤ تم میری مدد کرو گی نا؟“

رام دلاری بولی۔

”تو نے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہوا ہے کہ جس کا

بدلہ میں ساری زندگی نہیں اتار سکتی میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں آج ہی مندر جاؤں گی اور بڑے مہنت سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ عائشہ کو پولیس کہاں لے گئی ہے۔ مہنت کو سب کچھ معلوم ہوگا۔ یہ اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔"

میں مطمئن ہوگیا مگر چاہتا تھا کہ رام دلاری ابھی مندر جا کر عائشہ اور اس کے ماں باپ کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ رام دلاری نے بھی انسانی ہمدردی کا پورا ثبوت دیا۔ وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوگئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ماتھے پر نئی بندی لگائی اور میری طرف پلٹ کر بولی۔

"تو چالی میں ہی رہنا باہر ہرگز نہ جانا۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

رام دلاری چلی گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ رام دلاری کافی دیر لگا کر آئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ گیلری میں اس کے قدموں کی آواز آئی تو میں جاگ رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس نے پرس پلنگ پر پھینکا اور بیٹھ گئی۔ میں نے عائشہ اور اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اٹھ کر مٹی کی صراحی میں سے پانی پیا اور بولی۔

"میری مانو اور ان لوگوں کا خیال دل سے نکال دو۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

"وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ لڑکی کو تو مندر کے مہنت نے پولیس سے لے کر غائب کر دیا ہے۔ باقی اس کے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں کہ وہ جھونپڑپٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں۔"

"تمہیں مندر کے پجاری نے کچھ نہیں بتایا؟"

رام دلاری میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"مہنت اتنا احمق نہیں ہے کہ وہ مجھے بتا دیتا کہ عائشہ کو اس نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ بڑا مکار آدمی ہے۔ یہ بھی میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ عائشہ کو پولیس نے اس کے حوالے کر دیا تھا جسے اس نے کسی جگہ پہنچا دیا ہے۔ ورنہ وہ تو کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھا۔ میں تمہیں اب بھی یہی کہوں گی کہ اپنی جان کسی مصیبت میں نہ پھنسا دینا اس لڑکی کا خیال چھوڑ دو۔ تم ابھی دیوی کے مہنت کو نہیں جانتے۔ وہ مسلمانوں کا تو جانی دشمن ہے۔"

میں نے غصے میں آ کر کہا۔

"میں بھی اس کا جانی دشمن ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان بہن کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا میرا فرض ہے۔ میں تمہارے ہندو کافروں سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

رام دلاری نے پہلی بار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ہنس کر بولی۔

"بھگوان کے لیے اتنی اونچی نہ بول۔ یہاں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔"

میں خاموش ہوگیا۔ رام دلاری نے پرس میں سے پان کی پڑیا نکال کر پان کھایا اور کھڑے کی دیوار کے پاس جو لکڑی کی کرسی رکھی تھی اس پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم اب کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہی کہ کسی طرح عائشہ کا کھوج لگاؤں اور اسے اس کے ماں باپ کے پاس پہنچاؤں۔ یہ ہندو کافر اس کی زندگی کو جہنم بنا دیں گے۔ میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

رام دلاری کسی سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ لمحے وہ چپ رہی پھر سر اٹھا کر کہنے لگی۔

"تو نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مجھے بھی تیرے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ فکر نہ کرو مجھے آج شام تک کی مہلت دو میں تمہیں اتنا ضرور معلوم کر دوں گی کہ عائشہ کو مندر کے پجاریوں نے کہاں پہنچا دیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم کہاں سے معلوم کرو گی؟"

رام دلاری نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں میرا کام۔"

رام دلاری خود جرائم پیشہ نہیں تھی۔ مگر بمبئی کی فلمی دنیا کے جس طبقے سے اس کا تعلق تھا وہ طبقہ جرائم پیشہ لوگوں کی زد میں ضرور تھا۔ یوں رام دلاری کا بھی بمبئی کے جرائم پیشہ افراد سے ایک لنک بن گیا تھا۔ رات کو اس کی پرکاش اسٹوڈیوز اندھیری میں شوٹنگ تھی۔ وہ دوپہر کے بعد ہی فلیٹ سے نکل گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ میں شام تک بمبئی کے بازاروں میں آوارہ گردی کرتا اور عائشہ اور اس کے ماں باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو واپس چالی میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس زمانے میں کسی کسی گھر میں ٹیلی فون لگا ہوتا تھا۔ ورنہ میں رام دلاری کو فون کر کے ضرور پوچھ لیتا کہ اس نے مسلمان لڑکی کا سراغ لگایا ہے یا نہیں......

حسب معمول رام دلاری اسٹوڈیوز سے جب واپس آئی تو رات کے دو بج چکے تھے۔ میں سو گیا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ رام دلاری نے آتے ہی کہا۔

"میں نے عائشہ کا سراغ لگا لیا ہے مگر ابھی سو جاؤ۔ صبح بتا دوں گی۔ مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ کورس ڈانس کرتے کرتے میرا سارا جسم درد کرنے لگا ہے۔"

میں اسی وقت کوئی خوش خبری سننے کو بے تاب تھا مگر رام دلاری واقعی سخت تھکی ہوئی تھی۔ میں پلنگ سے اٹھ کر نیچے دری پر آ گیا۔ رام دلاری نے ساڑھی بدلی اور پلنگ پر بے سدھ ہو کر پڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ باقی رات میں نے کچھ جاگ کر کچھ سو کر گزار دی۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب رام دلاری سو کر اٹھی۔ اٹھتے ہی کہنے لگی۔

"چائے بنا دو بھیا۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ناشتہ بھی تیار کر رکھا ہے دیدی۔"

"نہیں، میں صرف چائے پیوں گی۔"

میں چائے تیار کرنے لگا۔ رام دلاری اتنی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو چکی تھی۔ میں نے چائے کی پیالی اس کو دی اور وہ سوال پوچھا جو ساری رات میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا تھا۔

"دیدی! عائشہ کا کیا پتا چلا؟"

رام دلاری نے چائے کا گھونٹ بھر کر سر کو آہستہ آہستہ نفی کے انداز میں ہلایا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"چھوٹے بھیا! اصل ٹھکانے کا تو میں کھوج نہیں لگا سکی۔ اتنا ضرور پتا لگا لیا ہے کہ مندر کے مہنت نے انتقامی طور پر عائشہ کو جنوبی علاقے کے کسی مندر میں دیوداسی بنانے کے بجائے مندر کے ایک جرائم پیشہ پجاری گنگولی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے جو اسے لے کر چار دھار جواڑے کی طرف چلا گیا ہے۔"

جب میں نے رام دلاری سے کہا کہ میں عائشہ کی تلاش میں چار دھار جواڑے کی طرف جاؤں گا تو وہ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ بھگوان جانے یہ رجواڑا کس طرف ہے۔ کہاں ہے اور گنگولی

جرائم پیشہ گینگ کا لیڈر ہے۔ تم اس کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ جھونپڑپٹی کی اس مسلمان لڑکی کو بھول جاؤ۔ آج رات منروا اسٹوڈیوز میں میری ڈانس کی شوٹنگ ہے میرے ساتھ چلنا۔ تمہیں سہراب مودی اور چھایا دیوی سے ملاؤں گی۔"

مگر میں عائشہ کی تلاش میں چاردھار جواڑے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ رجواڑا کہاں ہے اور بمبئی سے کس طرف ہے۔ میں نے سوچا کہ املی والے تکیے کے مجذوب سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے۔ اس بزرگ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔ وہ اب بھی ضرور میری مدد کرے گا۔

چنانچہ میں رام دلاری کو کھانا تیار کرتا چھوڑ کر باہر نکل آیا اور سیدھا املی والے تکیے میں پہنچا۔ مولسری کے درخت کے نیچے وہ مجذوب اسی حالت میں بیٹھا آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ ڈنڈا اس کے پاس پڑا تھا۔ اس مجذوب کی جلالی طبیعت کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ میں بے دھڑک اس کے پاس چلا گیا اور جاتے ہی سلام کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔ مجذوب نے پہلے تو سنی ان سنی کر دی۔ جب میں نے بڑے ادب سے اپنا مدعا دہرایا تو وہ غضبناک انداز میں بولا۔

"میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ بھاگ جا نہیں تو سر پھوڑ دوں گا۔"

اس نے ڈنڈا پکڑ لیا۔ مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا اور کہا۔

"آپ چاہے میرا سر پھوڑ دیں مگر میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔"

مجذوب نے ڈنڈا زمین پر رکھ دیا اور گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

"چاردھار جواڑے کے باہر جنگل میں ایک مسجد ہے۔ وہاں جا کر دو نفل ادا کر باقی تو جان تیرا کام......"

میں نے مزید کچھ پوچھنا چاہا تو مجذوب ڈنڈا پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔

"جاتا ہے کہ نہیں۔ مار ڈالوں گا' دفع ہو جا۔"

میں وہاں سے بھاگ لیا۔ میں نے سوچا کہ ریلوے اسٹیشن پر چل کر ریلوے کے کسی آدمی سے پوچھتے ہیں کہ یہ چاردھار جواڑا بمبئی سے کس طرف کو ہے۔ ہماری سیمنگٹن روڈ پر بمبئی سنٹرل کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ میں بس کے ذریعے سیمنگٹن روڈ کے اسٹاپ پر پہنچا تو سامنے ایرانی ریستوران تھا۔ اس ریستوران کا مسلمان مالک میرا واقف کار بن گیا تھا۔ میں دن میں ایک آدھ بار وہاں بیٹھ کر چائے ضرور پیتا تھا۔ اس کا نام سلام بھائی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے بات کی جائے۔ میں ریستوران میں آ گیا۔ سلام بھائی مجھے دیکھ کر ہنس کر بولا۔

"کیوں بھائی! کسی فلم میں کام ملا کہ نہیں؟"

اسے معلوم تھا کہ میں پنجاب سے فلم میں کام کرنے کے لیے بمبئی آیا ہوں اور رام دلاری کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ باقی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کاؤنٹر کے قریب خالی اسٹول پر سلام بھائی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس سے چاردھار جواڑے کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا۔

"کیوں بھائی! وہاں تیرا کون ہے؟ یہ رجواڑا تو بڑی دور ہے۔"

میں نے سلام بھائی سے کہا کہ میرا ایک رشتہ دار چاردھا میں رہتا ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ میں وہاں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے پتا نہیں کہ اس طرف کون سی ریل گاڑی جاتی ہے۔

ایرانی ریستوران کے مالک سلام بھائی نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ریل گاڑی میں بیٹھ کر اگر بھوپال سے جھانسی کی طرف جائیں تو رستے میں للت پور اسٹیشن سے ذرا پہلے ایک ریلوے اسٹیشن آتا ہے جس کا نام دیوگڑھ ہے۔ یہاں سے اتر جائیں تو جنگل میں سے دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چاردھار جواڑے کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

"مگر اکیلے مت جانا۔" سلام بھائی نے کہا۔ "جنگل میں جو دو میل کا راستہ ہے وہ بڑا خطرناک ہے۔ وہاں دن کے وقت بھی خونخوار شیر چیتے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔"

مگر میں جانتا تھا کہ یہ خطرناک سفر مجھے اکیلے ہی طے کرنا ہوگا۔ میں ایرانی ریستوران سے اٹھ کر سیدھا بمبئی سینٹرل کے ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ جھانسی کی طرف گاڑی رات کے سوا نو بجے چلے گی۔ مجھے یہی گاڑی پکڑنی تھی۔

میں رام دلاری کے فلیٹ پر واپس آ گیا۔

میرے پاس دس پندرہ روپے ہی تھے جو میں نے بچا کر رکھے ہوئے تھے۔ رام دلاری نے کھانا تیار کر لیا تھا اور وہ اپنی ساڑی استری کر رہی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر بولی۔

"کہاں گئے تھے؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں ٹرین کا ٹائم معلوم کرنے سینٹرل اسٹیشن گیا تھا اور اب میں رات کی گاڑی سے عائشہ کی تلاش میں چاردھا ریاست کی طرف جا رہا ہوں۔ رام دلاری دری پر بیٹھی ساڑھی پر کوئلوں والی استری پھیر رہی تھی۔ یہ سن کر اس نے استری اینٹ پر رکھ دی اور مجھے گھور گھور کر تکنے لگی۔

"تو تم باز نہیں آؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "دیدی! میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب میں تمہارے کہنے سے بھی نہیں رکوں گا۔"

رام دلاری خاموشی سے دوبارہ استری کرنے لگی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس نے میرے فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے۔ کہنے لگی۔

"اتنا مجھے معلوم ہے کہ تم نڈر لڑکے ہو۔ میری خاطر تم خطرناک جنگل میں سے رات کے اندھیرے میں گزر کر تھانے پہنچ گئے تھے لیکن میرے چھوٹے بھیا وہ جو رام گنگولی پجاری ہے وہ بہت خطرناک غنڈہ ہے اور اس کا پورا گینگ ہے۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم کو کچھ ہو گیا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔"

میں نے رام دلاری کو یہ بالکل نہ بتایا کہ میں املی والے تکیے کے مجذوب سے بھی مل آیا ہوں۔ وہ پوچھنے لگی۔

"تم چاردھا میں کہاں جاؤ گے۔ کس سے جا کر ملو گے۔ وہاں تو تمہیں کوئی بھی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے' خدا کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیگا۔"

"تمہارے پاس کرایہ ہے؟"

"ہاں' پندرہ روپے ہیں۔"

اس زمانے میں پندرہ روپے بڑی خاصی رقم ہوتی تھی۔ پھر بھی ایک ایسے سفر کے لیے ناکافی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مجھے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے گی۔ اس بات کو رام دلاری نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اٹھ کر الماری کے پاس گئی۔ الماری سے ایک ٹین کا چھوٹا ڈبہ نکال کر اسے کھولا اور مجھے مزید پندرہ روپے دے کر بولی۔

"یہ بھی اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے روپے رکھ لیے۔ رام دلاری نے ساڑھی تہہ کر کے پلنگ پر رکھی اور مجھے

پاس بٹھا کر کہنے لگی۔
"تم جس مسلمان لڑکی کا کھوج لگانے جارہے ہو بھگوان کرے کہ وہ تمہیں مل جائے لیکن تم اسے لے کر کہاں جاؤ گے؟ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے ماں باپ کہاں چلے گئے ہیں؟"
میں نے کہا۔"میں اسے پولیس کی حفاظت میں دے دوں گا۔"
"نہیں نہیں، نہیں۔" رام دلاری نے جلدی سے کہا۔"بھگوان کے لیے ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم اسے لے کر سیدھا بمبئی میرے پاس آجانا۔ میں یہاں اس کے ماں باپ کا کھوج لگالوں گی۔"
میں نے کہا۔"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔"
اس زمانے میں ریل کے کرائے زیادہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ اس زمانے کے مطابق ہی ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لاہور سے بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ریل کا کرایہ بارہ تیرہ روپے ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ رام دلاری نے مجھے ڈبے میں سے مزید دس روپے نکال کر دیئے اور بولی۔
"یہ بھی اپنے پاس رکھ لو۔ واپسی پر تمہیں عائشہ کے لیے بھی تو ریل کا ٹکٹ لینا ہوگا۔" اور وہ مسکرادی۔
"میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم عائشہ کو ڈھونڈ لوگے۔ اچھا اب میرے ساتھ بازار چلو۔ میں تمہیں مارکیٹ سے نئی پتلون اور قمیص لے دوں گی۔ تمہارے یہ کپڑے پرانے ہوگئے ہیں۔"
رام دلاری نے مجھے میل خورے کلر کی موٹے کپڑے کی ایک پتلون اور قمیص لے دی۔ جوتے میرے بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ یہ کینوس کے فلیٹ شو تھے۔ جن کا لڑکوں میں اس زمانے میں بڑا رواج تھا۔ رام دلاری نے مجھے یہ بھی کہا کہ اپنے پاس ایک شکاری چاقو ضرور رکھ لے۔ میں تجھے خرید دیتی ہوں مگر میں نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوپہر کو چالی میں آکر میں کھانا کھا کر سوگیا۔ رام دلاری اپنے کام سے کہیں چلی گئی۔ مجھے رات کو ساڑھے نو بجے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ رام دلاری کی بھی رات کو شوٹنگ تھی اور اسے منروا اسٹوڈیوز جانا تھا۔ وہ تیسرے پہر آئی تو میں جاگ چکا تھا۔ آتے ہی کہنے لگی۔
"چھوٹے بھیا! میں نے عائشہ کے ماتا پتا کا ٹھکانا معلوم کرلیا ہے۔ وہ دیولالی کے محلہ کھواڑہ میں اپنے کسی رشتے دار کے پاس چلے گئے ہیں۔"
میں نے پوچھا۔"یہ دیولالی کہاں ہے؟"
رام دلاری کہنے لگی۔"جب بمبئی سے چلو گے تو تمہاری ٹرین پہلے کلیان ٹھہرے گی اس کے بعد دوسرا بڑا اسٹیشن دیولالی آئے گا ارے وہ بہت بڑی چھاؤنی بھی ہے انگریزوں نے وہاں اپنی فوج کی بارکیں بنا رکھی ہیں۔ وہاں بارود خانہ بھی ہے۔ تم وہاں اتر جانا اور محلہ کھواڑہ پوچھ کر علی بھائی کے گھر چلے جانا۔ عائشہ کا باپ قاسم بھائی تمہیں وہیں ملے گا۔"
یہ میرے لیے ایک خوش خبری تھی۔ اسی طرح کم از کم میں عائشہ کے ماں باپ کو اتنی تسلی ضرور دے سکوں گا کہ میں ان کی بیٹی کی تلاش میں جارہا ہوں۔ میں نے رام دلاری سے کہا۔
"ہاں ہاں اسے وہیں اس کے گھر چھوڑ آنا یہاں بمبئی لانے کی کیا ضرورت ہے۔ بھگوان کرے کہ تم زندہ سلامت واپس آجاؤ۔ مجھے تو یہی فکر ہے کہ تم ابھی نوجوان ہو اور تمہارا واسطہ بڑے بڑے بدمعاشوں سے پڑے گا۔"
میں نے کہا۔"دیدی! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔"

رام دلاری نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
"مجھے تمہاری یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں اپنے خدا پر بڑا بھروسہ ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"
رام دلاری رات آٹھ بجے کے قریب اسٹوڈیو شوٹنگ پر چلی گئی۔ مجھے تاکید کرگئی کہ سفر پر جاتے ہوئے چالی یعنی فلیٹ کی چابی باہر گیلری والے گملے کے نیچے رکھ دینا۔ میں نے بھی کوئی ساڑھے آٹھ بجے فلیٹ کا دروازہ بند کرکے تالا لگایا۔ چابی گیلری میں کونے والے پام کے گملے کے نیچے چھپا کر رکھی اور بس میں بیٹھ کر بمبئی سنٹرل پہنچ گیا۔
اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بمبئی شہر میں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ جس ٹرین پر مجھے سوار ہونا تھا وہ ایکسپریس ٹرین نہیں تھی۔ ایکسپریس ٹرینیں دیوگڑھ کے اسٹیشن پر نہیں رکتی تھیں۔ پہلے مجھے سیدھا دیوگڑھ ہی جانا تھا۔ مگر اب میں پہلے عائشہ کے ماں باپ کے پاس جارہا تھا جو دیولالی میں رہتے تھے۔ میں نے دیولالی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ میں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ بمبئی شہر کے مضافاتی اسٹیشن کافی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے بمبئی کا مضافاتی اسٹیشن باندرہ آیا اس کے بعد گاڑی کلیان پر آکر ٹھہر گئی۔
کلیان بمبئی سے شمال مشرق کی جانب جاتے ہوئے بمبئی کا آخری مضافاتی اسٹیشن ہے۔ یہاں سے ٹرین چلی تو رات کافی گہری ہوگئی تھی۔ ٹرین کی رفتار بھی تیز ہونا شروع ہوگئی تھی۔ مجھے ایک قلی نے بتایا تھا کہ دیولالی ٹرین آدھی رات کے بعد پہنچے گی۔ کلیان سے نکلنے کے بعد ست پڑا کا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہوگیا تھا مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے باہر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اگرچہ یہ ایکسپریس ٹرین نہیں تھی مگر پھر بھی بہت چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی جاتی تھی۔ میں ڈبے میں کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے بارش میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ گرمیوں کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ اگرچہ ابھی برسات شروع نہیں ہوئی تھی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔ مسافر بستر بچھا کر سیٹوں پر سونے کی تیاریاں کررہے تھے۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک گجراتی سیٹھ سے کہا کہ دیولالی سے ایک سٹیشن پہلے مجھے جگا دینا اور میں کھڑکی سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کرکے سوگیا۔ ٹرین چل رہی ہو تو نیند بڑی جلدی آجاتی ہے۔ مجھے بھی جلدی نیند آگئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سویا رہا ہوں گا کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔
میں نے دیکھا میرے ساتھ جو گجراتی سیٹھ بیٹھا ہوا تھا وہ وہیں سیٹ پر سمٹ سمٹا کر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا باہر اندھیرا تھا دور کہیں کہیں روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔
"گاڑی کیوں رک گئی ہے؟"
اس نے کہا"سگنل ڈاؤن نہیں ہے۔"
میں نے پوچھا۔"کون سا اسٹیشن آرہا ہے۔"
"دیولالی۔"
میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ ٹرین کو دھچکا لگنے سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ورنہ خدا جانے دیولالی کے اسٹیشن پر بھی میری آنکھ نہ کھلتی اور وہ اسٹیشن بھی گزر جاتا۔ میں نے ٹائم پوچھا معلوم ہوا کہ رات کا ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ تین چار

منٹ بعد سگنل ڈاؤن ہوگیا۔ ٹرین چل پڑی پھر دیولالی کے اسٹیشن پر رک گئی۔ میں نے پلیٹ فارم پر اسٹیشن کا نام جو اردو میں لکھا ہوا تھا پڑھ لیا تھا۔ یہ دیولالی ہی تھا۔ اس زمانے میں اسٹیشنوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ آج کل انڈیا میں اسٹیشنوں کے نام اکثر ہندی میں لکھے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جنکشنوں کے نام ہندی کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھے جاتے ہیں آج کل تو دیولالی بہت بڑا شہر بن گیا ہوگا۔ اس وقت یہ چھوٹا سا شہر تھا اور وہاں اسلحہ کا سپلائی ڈپو تھا۔ فوج کی چھاؤنی بھی تھی۔

اسٹیشن بھی کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں ٹرین سے اتر گیا۔ ٹرین آگے نکل گئی۔ اسٹیشن سے باہر آ کر میں نے ایک یکے والے سے پوچھا۔

"بھائی یہاں کٹھواڑہ محلہ کہاں ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔"

یکے والا بولا۔

"ایک روپیہ لوں گا۔ کٹھواڑہ محلے میں پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ آدھی رات کو محلے میں کس سے علی بھائی کا مکان پوچھوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں باقی جو رات رہ گئی ہے وہیں اسٹیشن پر ہی گزار دوں۔ چنانچہ میں اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں آ کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں وہیں بینچ پر لیٹ کر سو گیا۔ جس وقت آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ کوئی ٹرین آ کر ابھی ابھی رکی تھی۔ مسافر سامان اٹھائے نکل رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اسی درخت کی طرف بڑھا جہاں تین چار خالی یکے کھڑے تھے۔ سواریوں والے تانگے میں بیٹھنے کی بجائے میں نے سالم تانگہ کر لیا اور محلہ کٹھواڑہ پہنچ گیا۔ شہر کے مکان پرانے اور بوسیدہ تھے۔ سب کی چھتیں ڈھلواں تھیں اور دیواریں بارشوں کی وجہ سے کالی ہو رہی تھیں۔ دور ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔

محلّہ کٹھواڑہ ایک غریب محلہ تھا۔ میں نے ایک آدمی سے علی بھائی کے مکان کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"چھ سات مکان چھوڑ کر علی بھائی کا گھر آ جائے گا۔"

علی بھائی کا مکان چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ تنگ دروازے پر بوریا لٹک رہا تھا۔ باہر ایک بچہ مٹی سے کھیل رہا تھا۔ اس وقت بارش نہیں ہو رہی تھی۔ مکان کے اندر سے ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ میں نے اس سے علی بھائی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"آواز دو وہ اندر ہی ہے۔"

میں نے آواز دی تو ایک سوکھا سا مریل آدمی بیڑی پیتا بوریا اٹھا کر باہر آیا اور مجھے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں میاں کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے ہاں قاسم بھائی ٹھہرے ہوئے ہیں مجھے ان سے ملنا ہے۔ میں بمبئی سے آیا ہوں۔"

اندر قاسم بھائی نے میری آواز سن لی تھی وہ فوراً باہر آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور میرا نام لے کر کہا۔

"بیٹا! تم یہاں کیسے آ گئے؟ اندر آؤ آؤ۔"

پھر اس نے میرا علی بھائی سے تعارف کرایا۔ اندر عائشہ کی ماں چارپائی پر بیمار پڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"بیٹا! عائشہ کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا۔ "چچی جان میں اسی کا پتا چلانے جا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کی بیٹی آپ کے پاس ضرور واپس لے آؤں گا۔"

عائشہ کی ماں مجھے دعائیں دینے لگی۔ لیکن علی بھائی اور قاسم بھائی کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ میرے اس دعوے کو مجذوب کی بڑ سمجھ رہے ہیں اور انہیں میری کسی بات پر بھی بھروسہ نہیں تھا لیکن مجھے وہ کیا سمجھ رہے ہیں اور انہیں کیا سمجھنا چاہیے؟ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرے جسم میں توانائی کی زبردست لہریں گردش کر رہی تھیں۔ میرا عزم کسی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں عائشہ کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا کر رہوں گا۔ آج میں ان دنوں کا خیال کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس وقت میرے اندر میرے ارادوں کی انرجی اور توانائی ہی طوفانی انداز میں کام نہیں کر رہی تھی بلکہ یہ میرا جنون بھی تھا۔

میں اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا تھا۔ یہ میرے جنون اور میرے عزم کی طاقت ہی تھی جس نے مجھے پل سے چھلانگ لگانے کے بعد طوفانی ندی سے زندہ سلامت باہر نکال لیا تھا اور میں اندھیری رات میں خطرناک جنگل میں سے گزر گیا تھا۔ یہی وہ انرجی اور برقی توانائی تھی جو مجھے بچپن ہی میں گھر سے نکال کر وطن سے دور بے سروسامانی کے عالم میں جنگلوں، پہاڑوں اور اجنبی شہروں میں اڑائے اڑائے لیے پھرتی تھی اور پردیس کے مصائب اور تکلیفوں کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ میری دیوانگی تھی، میرا عشق تھا، میرا جنون تھا، یہی جذبہ اور جنون لے کر میں ایک بے سہارا مسلمان لڑکی کو ہندوؤں کے جنگل سے نکالنے کے لیے بمبئی سے اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ عائشہ کے والد اور علی بھائی کو اگر میری باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا اور وہ میرے دعوؤں کو اگر مجذوب کی بڑ سمجھ رہے تھے تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ نہ صرف یہ کہ ان کی اپنی

توانائیاں ختم ہوچکی تھیں بلکہ وہ میری توانائیوں اور میرے جذبہ جنون کی طاقت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔

وہ رات میں نے ان لوگوں کے کوارٹر میں بسر کی اور دوسرے روز انہوں نے مجھے جھانسی جانے والی گاڑی میں سوار کرادیا۔ یہ ٹرین بھی پسنجر ٹرین تھی اور دیوگڑھ ٹھہرتی تھی۔ دیولالی سے جھانسی تک بڑا لمبا سفر ہے اور ٹرین ست پڑا کے سیکڑوں میل پھیلے ہوئے پہاڑی جنگلوں میں سے گزرتی ہے۔ ان جنگلوں میں دریا جھیلیں ندی نالے اور بڑے گھنے جنگل آتے ہیں۔ سارا دن ٹرین چلتی رہی۔ اس دوران ناسک، جل گاؤں اور بھوساول کے شہر آئے اور گزر گئے۔ ٹرین پسنجر تھی اس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ راستے میں کوئی ایکسپریس ٹرین کراس کرتی تو ہماری گاڑی کو ایک طرف کھڑا کردیا جاتا۔ یوں رات کے دس گیارہ بجے ٹرین برہان پور کے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں سے چلی تو اگلی منزل کھنڈوا اور ہوشنگ آباد کے شہر تھے۔ یہ شہر دوسرے دن آئے۔ اب اگلا بڑا شہر بھوپال تھا۔ بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر رکی رہی۔ اس سے آگے جھانسی کا تاریخی شہر آتا تھا۔ میں نے دیوگڑھ کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ دیوگڑھ کا اسٹیشن جھانسی اور للت پور سے تھوڑا پہلے آتا تھا۔ یہ سارا راستہ جنگلاتی تھا۔ کبھی پہاڑیاں قریب آجاتیں، کبھی دور ہوجاتیں اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ ایک مسافر سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ دیوگڑھ کوئی ایک گھنٹے بعد گاڑی پہنچے گی۔ اس وقت دن ڈھلنے لگا تھا۔ آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ بھوپال سے ٹرین چلی تو بارش ہونے لگی تھی۔ دیوگڑھ کے قریب پہنچتے پہنچتے بارش رک گئی تھی۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر باہر نکال کر آگے دیکھ لیتا تھا کہ دیوگڑھ کا اسٹیشن آیا ہے کہ نہیں...... گاڑی نے ایک برساتی نالے کا پل عبور کیا تو میرے پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے کہا۔

"یہاں سے ریاست جھانسی کی سرحد شروع ہوگئی ہے۔"

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دیوگڑھ کا اسٹیشن آگیا۔ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر سامان لیے کھڑے تھے۔ ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی مگر دن کی روشنی سمٹنے لگی تھی۔ یہاں سے مجھے چاردھار جواڑے کی طرف جانا تھا۔ میں نے اسٹیشن سے باہر آکر ایک یکے والے سے چاردھار جواڑے کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"بابو! ادھر اس وقت کوئی یکہ نہیں جاتا راستے میں شام ہوجائے گی۔ جنگل میں شیر بھالو کا خطرہ ہے۔"

مگر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے چاردھار جواڑے پہنچ جاؤں۔ میں وہ رات دیوگڑھ کے ویران سے اسٹیشن پر بسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یکے والے کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا تو وہ تیار ہوگیا۔ میں یکے میں سوار ہوگیا۔ ریلوے اسٹیشن کا پھاٹک عبور کرنے کے بعد یکہ ڈھلانی راستے سے گزرنے لگا۔ دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ آگے کھیت آگئے۔ کھیتوں میں فصل کھڑی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کے سیاہ خاکے سے نظر آرہے تھے۔ کوچوان نے مجھ سے پوچھا کہ میں چاردھا میں کس سے ملنے جارہا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا کہ میرا ایک دوست وہاں فاریسٹ آفیسر ہے اس کے پاس جارہا ہوں۔ گھوڑا مریل سا تھا۔ ایک خاص رفتار سے چلا جارہا تھا۔ کوچوان اسے تیز چلانے کی کوشش کررہا تھا۔ دن کی روشنی لحظہ بہ لحظہ ماند پڑتی جارہی تھی۔ کھیت ختم ہوئے تو درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کے درمیان ایک پکا راستہ بنا ہوا تھا۔ یکہ اس پر چلا جارہا تھا۔ شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ گھاس کا ایک میدان آگیا۔ یہاں برساتی نالے کا ایک پرانا پل تھا۔ یکہ پل پر سے گزر گیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ درختوں کے وہ سیاہ خاکے جو پہلے دور نظر آتے تھے اب قریب آگئے تھے۔ میں نے کوچوان سے پوچھا کہ چاردھا ابھی کتنا دور ہے۔ کوچوان نے ان درختوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"ان درختوں کے پار ہے۔"

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا جب یکہ گھنے درختوں کے جھنڈوں میں داخل ہوگیا۔ یہ اصل میں ایک بارانی جنگل تھا جہاں قسم قسم کے درخت اگے ہوئے تھے۔ کوچوان نے یکے کی دونوں لالٹینیں روشن کردی تھیں۔ جنگل میں اندھیرا ہوجانے کی وجہ سے وہ کچھ خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک دوبار اس نے اس خوف کا اظہار بھی کیا۔ ڈر مجھے بھی لگ رہا تھا کہ کسی طرف سے کوئی شیر یا چیتا نکل آیا تو اس سے بچنا مشکل ہوجائے گا۔ جنگل میں ذرا کھلی جگہ آئی تو کوچوان نے یکہ روک کر کہا۔

"لو جی بابو جی! آگیا چاردھا کار جواڑا۔"

میں نے شام کے گہرے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ تو جنگل ہے۔"

کوچوان نے یکہ موڑ لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو جی! یکہ اس سے آگے نہیں جائے گا۔ وہ جو کیکر کے درختوں کا جھنڈ نظر آرہا ہے۔ اس کے پیچھے چاردھا کا ڈاک بنگلہ ہے سواریاں یہاں تک ہی جاتی تھیں۔"

میں اسے پیسے دے چکا تھا۔ کوچوان نے مجھے اتار دیا اور آناً فاناً یکہ کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو بھاگ گیا۔ میں اس سنسان ڈراؤنے جنگل میں اکیلا رہ گیا۔ جنگل سے مجھے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جنگلوں کا میں عادی ہوگیا تھا۔ خطرہ صرف کسی شیر چیتے کا تھا۔ میں نے سوچا کہ کھجور کے جھنڈ کے پیچھے جو ریسٹ ہاؤس ہے جلدی جلدی وہاں پہنچنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ مسجد تلاش کروں گا جہاں مجذوب بزرگ کی ہدایت کے مطابق مجھے دو نفل ادا کرنے تھے۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے گزر کر دوسری طرف آیا تو وہاں کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں تھا۔ اندھیرے میں ایک چھوٹا سا تالاب دکھائی دیا ساتھ ہی شپ شپ کی آواز سنائی دی۔ میں ذرا آگے بڑھا تو آواز ایک دم رک گئی۔

میں وہیں رک گیا۔

جنگل میں رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مگر تالاب چونکہ ذرا کھلی جگہ پر تھا اس لیے وہاں اندھیرے میں بھی تھوڑا بہت نظر آرہا تھا۔ شپ شپ کی آواز میری دائیں جانب سے آئی تھی۔ اس طرف ایک بہت بڑا درخت تالاب پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کی ایک ٹہنی کی شاخیں پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کوئی جانور تالاب میں پانی پی رہا ہوگا۔ اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا ہوگا یا میری بو سونگھ لی ہوگی اور پانی پینا چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا۔ اس وقت آسمان پر بادل کافی گہرے ہوچکے تھے مگر رات کا اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے مجھے اس کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ پتا مجھے اس وقت چلا جب اچانک بادلوں میں بجلی چمک اٹھی۔ جس وقت بجلی چمکی اس وقت میری نگاہیں تالاب پر جھکے ہوئے درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ بجلی اتنی زور سے چمکی کہ جنگل ایک سیکنڈ کے لیے روشن ہوگیا۔ اس روشنی میں میں نے ایک عورت کو تالاب

کے کنارے پانی میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے سیاہ بال کھلے تھے اور وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شپ شپ کی آواز آنی ایک دم بند ہوگئی تھی اور ساتھ ہی آسمانی بجلی نے چمک کر سارے ماحول کو ایک سیکنڈ کے لیے روشن کر دیا تھا۔ بجلی کی چمک غائب ہوتے ہی جنگل کا اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا۔ میں نے عورت کو صاف دیکھا تھا وہ کمر تک تالاب کے پانی میں بیٹھی ہوئی شاید نہا رہی تھی۔ وہ ضرور دونوں ہاتھوں سے پانی اپنے اوپر ڈال رہی تھی جس کی مجھے آواز آئی تھی۔ خدا جانے اندھیرے میں اس عورت نے مجھے کیسے دیکھ لیا تھا کہ وہ نہاتے نہاتے ایکدم سے رک گئی اور بجلی کی چمک نے مجھے یہ منظر دکھایا کہ وہ گردن موڑے میری جانب تک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو مارے خوف کے میرا جسم سن ہوگیا۔ بھاگنا چاہا مگر پاؤں من من کے بھاری ہوگئے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ جنگل کی کوئی چڑیل ہے جو تالاب میں نہانے آئی ہے اور اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اب وہ مجھے پکڑنے کے لیے اٹھ کر میری طرف آئے گی۔ جنگل کی تاریک ابر آلود رات کے اس ڈراؤنے منظر کا یہ ایک قدرتی ردعمل تھا جو مجھ پر ہوا تھا۔ اتنے میں بجلی دوبارہ چمکی۔ میری نگاہیں ابھی تک اس طرف تھیں۔ بجلی کی چمک میں میں نے دیکھا کہ وہ عورت اب تالاب میں نہیں تھی۔ اب تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ یہ کوئی آسیب یا چڑیل تھی جو ابھی تالاب میں نہا رہی تھی اور مجھے دیکھ کر غائب ہوگئی ہے۔ اتنی دیر میں میرے ہوش و حواس بحال ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے تالاب کی دوسری طرف کو بھاگا اور جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا تالاب کے دوسرے کنارے کی طرف نکل گیا۔

اس لمحے آسمان پر بادل اتنی زور سے گرجا کہ معلوم ہوا جیسے یہ یک وقت کئی توپیں چل گئی ہوں۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی درختوں کے پتوں پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں درختوں کی شاخوں میں سے ہوتی ہوئی مجھ پر بھی گرنے لگیں۔ بارش ایک دم موسلا دھار ہونے لگی۔ میں ایک درخت کے نیچے دبک گیا۔ بادل گرج رہے تھے بجلی اتنے زور سے کڑاکے کی گونج کے ساتھ چمکی کہ درختوں کے اوپر جتنا آسمان مجھے نظر آرہا تھا وہ روشنی میں بالکل سفید ہوگیا اور بجلی کی شاخ دار روشن لکیریں دیر تک نظر آتی رہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے جس درخت کے نیچے میں نے پناہ لے رکھی تھی اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ حالانکہ اگر اس درخت پر بجلی گرتی تو میں بھی درخت کے ساتھ جل کر راکھ ہو چکا ہوتا مگر حقیقت یہ ہے کہ بجلی کی کڑک اور ڈراؤنی چمک نے میرے ذہن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں گھبرا کر درخت سے نکل کر ایک طرف کو بھاگا۔ میرا پاؤں ایک جگہ زمین سے باہر نکلی ہوئی کسی درخت کی جڑ سے ٹکرایا اور میں جھاڑیوں میں منہ کے بل گر پڑا۔ بادل زور سے گرجا۔ میں جھاڑیوں کو پکڑ کر اٹھا اور بارش میں بھیگتا ان درختوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

بجلی ایک بار چمکی تو مجھے ایک جانب زمین سے ذرا بلندی پر ایک جھونپڑی سی دکھائی دی۔ میں اندازے سے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ بارش کے اس خوفناک طوفان سے پناہ لینے کے لیے مجھے اس سے اچھی جگہ جنگل میں اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ میں بارش میں شرابور ہو چکا تھا۔ بجلی چمکتی تو جنگل روشن ہو جاتا۔ دوسرے لمحے اتنا گہرا اندھیرا چھا جاتا کہ مجھے اپنا ہاتھ بھی نظر نہ آتا۔ جھونپڑی میں نے دیکھ لی تھی۔ میں اس کی طرف اندازے سے بڑھ رہا تھا۔ اب جو بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جس کے اوپر ایک کوٹھڑی ہے۔ کوٹھڑی کی چھت مخروطی ہے اور اس

کوٹھڑی تک جانے کے لیے ٹیلے کی ڈھلان پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جو بجلی کی چمک میں مجھے موسلا دھار بارش میں بھیگتی صاف نظر آئی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ سیڑھیاں پتھر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔

جس کو میں جھونپڑی سمجھ رہا تھا' یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی بند دروازے کے اوپر چھوٹا سا چھجہ نیچے کو جھکا ہوا تھا جہاں سے بارش کا پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ میں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا' میں جلدی سے اس اندھیرے ماحول میں داخل ہوتے ہی بیٹھ گیا۔ کم از کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں طوفانی بارش سے بچ گیا تھا۔ مجھے اس وقت فوری طور پر اسی چیز کی ضرورت تھی۔ میرے کپڑے بارش میں بھیگ چکے تھے۔ سر کے بالوں سے ابھی تک پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ رومال کو گیلے بالوں پر پھیرا۔ اسے نچوڑ کر دوبارہ اپنا چہرہ اور آنکھیں پونچھیں اور کوٹھڑی کے ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ کوٹھڑی کی فضا میں البتہ ایک عجیب مانوس سی بو ضرور محسوس ہوئی۔ میں نے اس بو پر غور کیا تو یہ سیندور کی بو تھی۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو اپنے کسی ہندو دوست کے ساتھ کسی مندر میں جاتا تو وہاں یہ بو بہت پھیلی ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ سیندور کی بو ہے۔ ہندو لوگ اور خاص طور پر ہنومان کی پوجا کرنے والے ہنومان کی مورتی پر سیندور کا لیپ کر دیا کرتے ہیں۔ ہنومان کا چہرہ بندر کا اور دھڑ انسان کا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گرز پکڑا ہوتا ہے۔ سیندور کے لیپ کی وجہ سے وہ سرخ ہو جاتا تھا اور مندر کی تنگ کوٹھڑی میں سیندور کی تیز بو پھیلی ہوتی تھی۔ بالکل یہی بو کوٹھڑی کی فضا میں موجود تھی۔ اگرچہ یہ بو تیز نہیں تھی۔ کھلے دروازے میں سے بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کے تھپیڑے آتے تو یہ بو تھوڑی دیر کے لیے غائب ہو جاتی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہاں کسی زمانے میں ہنومان کی کوئی مورتی رکھی ہو۔

میں اب اس انتظار میں تھا کہ بارش رکے تو میں اس مسجد کو تلاش کروں جو مجھے بمبئی کے املی والے تکیے کے مجذوب بزرگ نے بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہاں دو نفل ادا کرنا۔ میرا خیال تھا کہ میں رات اسی مسجد میں ہی بسر کروں گا۔ قدرتی طور پر خدا کے گھر میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ بارش نہ ہو رہی ہوتو جنگل میں کتنا ہی اندھیرا اور گھنا کیوں نہ ہو مجھے اس سے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا تھا کہ میں چل پھر بھی نہ سکوں۔ ہاں وہاں کوئی شیر چیتا یا ریچھ نہ پھر رہا ہو۔ مگر بارش رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بڑی زوردار آواز کے ساتھ مینہ برس رہا تھا۔ اتنا ضرور فرق پڑ گیا تھا کہ بادلوں کی گرج ہلکی پڑ گئی تھی اور بجلی دیر دیر بعد چمکتی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں نے ایک سیکنڈ کی روشنی میں دیکھا کہ کوٹھڑی چھوٹی سی ہے۔ البتہ کونے میں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ ضرور دکھائی دے گیا تھا۔ اس دروازے کی موجودگی سے مجھے خوف ضرور محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ اندھیرے میں کوئی نہ کوئی چڑیل اس دروازے میں سے نکل کر دبے پاؤں میری طرف بڑھے گی اور مجھے دبوچ لے گی اور اس کے ہاتھوں کی گرفت سے میرا سارا جسم سرد ہو کر سن ہو جائے گا۔ ہو سکتا تھا کہ یہ وہی چڑیل ہو جس کو میں نے تالاب میں نہاتے ہوئے

دیکھا تھا۔ اب میں نے اندھیرے میں ہی اپنا رخ کونے والی دیوار کے دروازے کی طرف کر لیا۔ اندھیرے میں مجھے وہ دروازہ بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا کسی وقت بجلی چمکتی تو دروازے کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آ جاتا۔ میں نے دروازے پر نظر جمادی۔ اگلی بار بجلی چمکی تو میں نے غور سے دیکھا۔ دروازہ چھوٹا تھا اور اس کے کواڑ بند تھے۔

یہ دروازہ کس طرف جاتا ہے؟ کیا اس کوٹھڑی کے اندر بھی کوئی کوٹھڑی ہے؟ میں سوچنے لگا۔ ہوسکتا ہے اندر کوئی چھوٹی سی کوٹھڑی ہو۔ دیہات میں اس قسم کی چھوٹی کوٹھڑیاں اناج وغیرہ رکھنے کے لیے بنادی جاتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو حوصلہ دینے لگا کہ یہ اندر والی کوٹھڑی بھی اناج کی کوٹھڑی ہوگی جو اس کسان نے آدھی بنائی ہوگی جو کبھی اس کوٹھڑی میں رہتا ہوگا۔ میں نے اس کوٹھڑی کا خیال دل سے نکال دیا اور باہر جنگل کی طرف رخ کر لیا اور انتظار کرنے لگا کہ بارش ذرا رکے تو میں وہاں سے نکل کر مسجد کی تلاش میں جاؤں مگر یہ کوئی شہر کی بارش نہیں تھی۔ ہندوستان کے مشرقی علاقے ست پڑا کے پہاڑی سلسلے کی بارش تھی۔ یہاں مون سون کی بارشیں شروع ہوتی ہیں تو کئی دن تک آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور ساری ساری رات موسلا دھار مینہ برستا ہے۔ ان جنگلوں میں راتوں کی بارش کا ایک اپنا طلسم ہوتا ہے۔ آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنگل کی بارش میں ہی پیدا ہوا تھا اور اسی بارش میں مر جائے گا۔

اب نہ تو بجلی ہی چمک رہی تھی اور نہ بادل ہی گرج رہے تھے۔ مگر بارش پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ میں نے ہمت ہار دی اور باقی ساری رات اسی کوٹھڑی میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بارش اور ٹھنڈی ہواؤں کی وجہ سے سردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کردوں۔ اس طرح کوٹھڑی کی فضا نیم گرم ہوجائے گی اور میں گیلے کپڑوں کے ساتھ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر سوسکوں گا۔ پھر یہ سوچ کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ دروازہ بند کیا تو کہیں تالاب والی پراسرار عورت یا چڑیل اندھیرے میں کسی طرف سے نکل کر مجھے دبوچ نہ لے۔ میں نے کوٹھڑی کے دروازے کا ایک پٹ پہلے ہی سے بند کر رکھا تھا۔ اس طرح سے بارش کی بوچھاڑ کوٹھڑی میں نہیں آرہی تھی۔

میری قمیص اور پتلون میرے جسم کی گرمی سے اتنی زیادہ گیلی نہیں رہی تھی۔ فلیٹ شوز میں نے اتارے نہیں تھے۔ میں نے وہیں دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ اندر کی جانب ذرا سا نیچے کھسک کر اس طرح ٹیک لگالی کہ میں سوسکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر جلدی سے کھول دیں اور کونے والے چھوٹے دروازے کی طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا پراسرار دروازہ بھی مجھے گھور کر دیکھ رہا ہو۔ کم بخت یہ بند دروازہ مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہتیر کہتا کہ یہ چھوٹی اناج والی کوٹھڑی کا دروازہ ہے اس کے اندر کوئی جن بھوت نہیں رہتا۔ تم آرام سے سوجاؤ مگر اس قسم کے ماحول میں انسان کے اندر کا جو ایک قدرتی خوف بیدار ہوجاتا ہے وہ مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ سونا تو دور کی بات ہے آنکھیں بھی بند کرنے نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو آج کی رات جاگ کر ہی گزار دیتے ہیں۔ بارش نہیں رکتی تو نہ رکے۔ میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ کبھی باہر جنگل کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی گردن موڑ کر کوٹھڑی کے کونے کی دیوار والے چھوٹے دروازے کی طرف

دیکھ لیتا۔ کمرے کی فضا میں جو سیندور کی ہلکی ہلکی بو رچی ہوئی تھی مجھے محسوس ہوا کہ وہ بو زیادہ آنے لگی ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب بو زیادہ تیز ہوگئی اور مجھے اپنے حلق میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا منہ دروازے سے باہر نکال کر بارش میں بھیگتی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

میں حیران تھا کہ یہ بو ایکدم کیسے ہوگئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اپنے قدرتی ڈر خوف پر میں نے کافی حد تک قابو پالیا تھا۔ اسکول میں دینیات کے ریڈر میں جو دو تین عربی کی آیات پڑھی تھیں اور جو یاد رہ گئی تھیں کسی وقت وہ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکیں مار لیتا تھا اس سے مجھے کافی حوصلہ مل جاتا تھا۔ ایک بار میں نے دروازے کے باہر دو تین گہرے سانس لے کر منہ اندر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ سیندور کی تیز بو غائب ہوگئی ہے اور اب فضا میں پہلے والی نارمل بو واپس آگئی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور چوکھٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ کیونکہ معلوم نہیں کتنی رات گزر چکی تھی اور مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے تھوڑی سی جھپکی ہی لی تھی کہ کھڑاک کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔

ٹھک ٹھک کی آواز آرہی تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ میں دیوار سے الگ ہو کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ آواز کوٹھڑی کے کونے والے چھوٹے دروازے سے آرہی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی دروازے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔ میں بت بنا اندھیرے میں جس طرف سے آواز آرہی تھی ادھر دیکھ رہا تھا۔ کوئی تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک دے رہا تھا پھر کسی عورت کی کمزور سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔"

پہلے میں ڈر گیا۔ پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے دروازے کے پیچھے جو چھوٹی کوٹھڑی ہے وہاں کسی نے کسی عورت کو بند کر رکھا ہو۔ میں اٹھ کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا کونے والے دروازے تک گیا۔ یہ دروازہ ایک طاق کی طرح بنا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کو ٹٹولا تاکہ اسے کھول دوں۔ یہ دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی کہ دروازے کی کنڈی پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے کی دوسری طرف سے عورت نے دستک دی اور کمزور آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

میں نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دروازہ کھلا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی عورت کے گہرا سانس بھرنے کی آواز سنائی دی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ میں نے مزید ہمت سے کام لیتے ہوئے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندھیرا گہرا سیاہ تھا۔ دروازے کے کھلتے ہی سیندور کی تیز بو کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ سیندور کی بو تیز ہونے لگی تھی۔ میں کوٹھڑی کے بڑے دروازے کے پاس آگیا۔ میں نے منہ باہر نکال کر لمبے لمبے دو چار سانس لیے۔ باہر جنگل میں بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔

میں حیران بھی تھا اور ڈرا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ عورت کون تھی جو دروازے کے پیچھے سے آوازیں دے رہی تھی اور جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔ کہیں وہ کوٹھڑی میں موجود ہی نہ ہو۔

میں اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ سیندور کی بو نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ باہر نکال کر بارش کا اندازہ لگایا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے چہرے کے بالکل پاس کسی کی سرد آہ بھرنے کی آواز سنائی دی۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے پھر جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔ میں گرتے گرتے بڑی مشکل سے سنبھلا اور میں نے کوٹھڑی کے باہر بارش میں چھلانگ لگا دی۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا پراسرار کوٹھڑی کے ٹیلے سے اتر کر درختوں کی طرف بھاگنے لگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا یہ کوٹھڑی آسیب زدہ تھی اور وہاں کسی چڑیل کا بسیرا تھا۔ ضرور یہ وہی چڑیل تھی جس کو میں نے تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں بارش میں دوڑتا جا رہا تھا۔ بارش اور رات کا اندھیرا میرا راستہ روک رہا تھا۔ میں بار بار جھاڑیوں میں الجھتا۔ مگر میں برابر دوڑ رہا تھا۔ میں تالاب کے پاس نکل آیا۔ میرے کپڑے ایک بار پھر بارش میں شرابور ہو رہے تھے۔ میں تالاب کے پہلو سے ہوتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد ایک گنجان درخت کے نیچے بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں میں بارش سے تھوڑا بہت محفوظ ہو گیا تھا۔ جب سانس ذرا نارمل ہوا تو سامنے والے درختوں کی طرف دیکھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ جس مسجد کی مجھے تلاش ہے وہ ان درختوں کی طرف ہی ہے۔ میں اٹھا اور بارش کی پرواہ کیے بغیر چلنے لگا۔ تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ اندھیرے میں مجھے اتنا ضرور نظر آنے لگا تھا کہ میں سمت درست رکھ سکوں۔ یہاں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ بارش کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ کھلی جگہ ختم ہوئی تو ایک بار پھر درخت شروع ہوگئے۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین سخت ہونے لگی تھی۔ یہ پتھریلا علاقہ تھا۔ اندھیرے اور بارش میں درختوں کے دھندلے دھندلے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ بانس کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس باڑھ کا مطلب تھا کہ آگے ضرور کوئی گاؤں تھا۔ خوش قسمتی سے بارش ایک دم رک گئی۔

بانس کی باڑھ شاید کھیتوں کے کنارے کنارے لگی ہوئی تھی۔ مگر اندھیرے میں مجھے کھیت دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک باڑہ آ گیا۔ میں باڑے میں گھس گیا۔ باڑے کی چھت اور دیواریں بانس کی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں مویشی ہونے چاہیے تھے مگر باڑہ بالکل خالی تھا۔ مجھے جنگل میں سانس لینے کی محفوظ جگہ ضرور مل گئی تھی۔ زمین پر سوکھی گھاس کی دو تین ڈھیریاں لگی تھیں۔ میں ایک ڈھیری کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنی قمیص اتار کر نچوڑ کر دوبارہ پہنی۔ یہ جگہ اچھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہاں باقی رات بیٹھا رہوں گا اور جب صبح ہوگی تو مسجد کی تلاش میں چل پڑوں گا۔ رات کے اندھیرے میں مسجد تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ جب کہ مجھے اس کے محل وقوع کا بھی علم نہیں تھا۔ باڑے کی فضا میں ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی۔ گھاس بھی میرے نیچے سوکھی تھی۔ میں گھاس پر ٹانگیں سمیٹ کر لیٹ گیا۔ گیلی قمیص اور گیلی پتلون کی وجہ سے مجھے سردی لگ رہی تھی مگر آہستہ آہستہ میرا جسم گرم ہوتا گیا اور پھر نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کسی چیونٹی نے بڑے زور سے کاٹا تھا۔ میں اپنی پنڈلی کو زور زور سے ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ آسمان پر بادلوں کے پیچھے صبح کا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ بارش بھی بدستور رکی ہوئی تھی۔ میں باڑے سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک چھوٹا سا راستہ شمال مشرق کی طرف چلا گیا تھا۔ میں اس پر چلنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہاں مویشیوں کا باڑہ بنا ہوا ہے تو آگے کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہوگا مگر گاؤں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ دن کا اجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں چاروں طرف تاڑ کے اونچے اونچے چھتریوں والے درخت چاروں طرف کھڑے تھے۔ کچا راستہ کچھ دور جا کر درختوں کے ایک ذخیرے میں داخل ہو گیا۔ ان درختوں میں سے رات کی بارش کا پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ جب میں درختوں کے ذخیرے سے باہر آیا تو بائیں جانب مجھے ایک چار دیواری دکھائی دی۔ چار دیواری کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مسجد ہے۔ دیواروں کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسجد کا دروازہ غائب تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ آخر میں اس مسجد کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مسجد کا صحن ذرا اونچا تھا۔ میں نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ مسجد کے صحن کے آگے صرف ایک برآمدہ سا بنا ہوا تھا جس کی چھت پر دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی جاتی تھی۔ برآمدے کے فرش پر دو چار ناریل کی پرانی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک چوبچہ تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں مجھے دو نفل ادا کرنے تھے۔ مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے چوبچے کے پاس بیٹھ کر پانی چلو میں لے کر غور سے دیکھا۔ پانی شفاف تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ پانی میٹھا تھا۔ پانی پینے کے بعد میں نے وضو کیا اور پھر برآمدے میں چھت کے نیچے جا کر دو نفل ادا کیے اور ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگی کہ میں جس نیک مقصد کو لے کر بمبئی سے چلا ہوں وہ مجھے اس مقصد میں کامیاب کرے۔ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر میں چٹائی پر ہی قبلہ رو ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ املی والے تکیے کے مجذوب نے مجھے یہاں دو نفل ادا کرنے کی جو ہدایت کی تھی تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ اب میں وہاں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ اس وقت دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے مسجد کے دروازے کے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک عورت مسجد کے سامنے سے گزری۔ اس نے میری طرف نگاہ ڈالی اور وہیں رک کر مجھے دیکھنے لگی پھر اس نے مسکرا کر اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اس کی مسکراہٹ اور اشارے میں کوئی ایسی طلسمی طاقت تھی کہ میں اٹھ کر مسجد سے باہر آ گیا۔ میرے دل نے کہا۔ واپس مسجد میں چلے جاؤ۔ مگر وہ عورت جو بڑی خوبصورت تھی کچھ اس انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ میں نے دل کی آواز پر کوئی دھیان نہ دیا اور عورت کے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ مجھ پر جیسے اس کی مسکراہٹ نے ایک سحر سا طاری کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ اس نے مجھے باہر کیوں بلایا ہے۔ یہ عورت لباس سے مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں رہنے والے آدھی باسی قبیلے کی کوئی عورت لگتی تھی۔ اس نے گھٹنوں سے اوپر تک کمر کے گرد سیاہ رنگ کی ساڑھی لپیٹ رکھی تھی۔ پاؤں میں چاندی کے کڑے تھے۔ کلائیوں میں بھی چاندی کے کڑے تھے گلے میں سرخ اور سیاہ منکوں کی مالا تھی۔ جسم پر صرف ایک چولی تھی۔ بالوں کا سر کے پیچھے جوڑا بنا رکھا تھا جس میں کسی درخت کا

سرخ پھول لگا تھا۔ ان قبیلوں کی عورتیں عام طور پر کالے رنگ کی معمولی شکل وصورت کی عورتیں ہوتی ہیں۔ مگر اس عورت کا رنگ بھی زیادہ کالا نہیں تھا۔ گہرا سانولا تھا۔ نقش بھی بڑے اچھے تھے۔ وہ آدھی باسی قبیلے کی عورتوں سے بڑی مختلف عورت تھی۔ اس کی نسواری رنگ کی آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے جسم کے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مجھے ایک گرم لہر اپنے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

میرے اندر سے ایک بار پھر وہی آواز آئی۔

"واپس مسجد میں چلے جاؤ۔"

مگر میں نے ایک بار پھر اس آواز پر کوئی دھیان نہ دیا۔ عورت نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

اس کی آواز میں بھی جیسے کوئی جادو تھا۔ وہ اپنی نظریں میرے چہرے سے بالکل نہیں ہٹا رہی تھی۔ اس نے اس دوران ایک بار بھی دوسری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرے اندر دو طاقتوں میں گویا ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ ایک طاقت مجھے واپس مسجد کی طرف کھینچ رہی تھی اور دوسری طاقت مجھے اس پراسرار عورت کے ساتھ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ میری جوانی کے ابتدائی ایام کا زمانہ تھا۔ میں کوئی نمازی پرہیزگار نوجوان بھی نہیں تھا۔ اچھا کام بھی کر لیتا تھا اور برائی کی طرف بھی راغب ہو جاتا تھا۔ کوئی اچھا کام کرتا تو دل کو سکون سا ملتا۔ گناہ کرتا تو دل بوجھل ہو جاتا اور پھر گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا تھا۔ اس وقت میں اپنی تمام تھوڑی بہت اچھائیوں اور زیادہ برائیوں کے ساتھ اس پراسرار جنگلی عورت کے سامنے موجود تھا اور دل پر شیطانی جذبات نے قبضہ کر لیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرا ہاتھ کبھی نہ چھوڑے۔ جب اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو میں بے اختیار اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے اور اسے مجھ سے کیا کام ہے۔ کل رات کی بارش کی وجہ سے کہیں کہیں درختوں پر سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی اور کچے راستے پر کیچڑ سے ہٹ کر گھاس پر چل رہی تھی۔ اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ مجھے اس طرف لے جا رہی تھی جدھر سے میں رات کو چل کر مسجد میں آیا تھا۔ ایک جگہ وہ دائیں طرف درختوں میں مڑ گئی۔ ذرا آگے جا کر ایک جھونپڑی آ گئی۔ یہ بانس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس پر ناریل کی شاخوں کی ڈھلواں چھت پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے جھونپڑی کے اندر لے گئی۔ جھونپڑی کی زمین پر سوکھے پتے بچھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بٹھایا اور بولی۔

"تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آئی ہوں۔"

بھوک مجھے واقعی لگی ہوئی تھی۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ وہ عورت بڑی صاف ہندی زبان میں بات کر رہی تھی۔ وہ آدھی باسی قبیلوں کی زبان نہیں بول رہی تھی۔ وہ جھونپڑی سے نکل کر باہر گئی تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ جھونپڑی کی دیوار بانسوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ کونے میں مٹی کے دو مٹکے پڑے تھے۔ ایک مٹکے کے اوپر سوکھے ناریل کا کھوپا الٹا ہوا تھا۔ یہ کھوپا عام طور پر پانی یا دیہات میں تاڑی پینے کے کام آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کھانا

کہاں سے لائے گی پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہاں کہیں قریب ہی ان کے قبیلے کا گاؤں ہو۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ عورت واپس آ گئی۔

اس کے ہاتھ میں کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے کیلے کے پتوں کا بنڈل کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس میں زرد رنگ کے موٹے چاول تھے جن پر چھوٹے چھوٹے آلوؤں کا سالن پڑا تھا۔

"کھاؤ، پھر تم سے بات کروں گی۔"

وہ عورت کون تھی اور اس کے اندر کس قدر منفی طاقتیں تھیں۔ ابھی تک مجھے اس کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ جنگلی قبیلے کی کوئی عیش پسند عورت ہے۔ جس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور اسے بلا کر عیش پرستی کے خیال سے اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے آئی ہے۔ اس وقت تک میں بھی اپنے ہوش میں آ چکا تھا۔ میرے دل میں اس عورت کو دیکھ کر جو گناہ کا خیال پیدا ہوا تھا اس کو دل سے نکال کر خدا سے اپنے گناہ کی معافیاں مانگ رہا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ چاول وغیرہ کھانے کے بعد میں جھونپڑی سے نکل کر سیدھا مسجد میں واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ میرا خیال ابھی تک اسی طرف لگا ہوا تھا کہ بمبئی کے مجذوب نے مجھے جو مسجد میں دو نفل ادا کرنے کے لیے کہا تھا تو اس میں ضرور کوئی مصلحت تھی اور وہاں سے مجھے ضرور کوئی ایسا غیبی اشارہ ملے گا جو سلمان لڑکی عائشہ کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

میں جلدی جلدی چاول کھانے لگا۔ میں نے اس نعمت کا شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ مٹکے میں سے پانی نکال کر لے آئی۔ میں نے پانی پی کر پوچھا۔

"کیا تم اسی جھونپڑی میں رہتی ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف مسلسل تک رہی تھی اور تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا اگر جواب نہیں دیتی تو نہ دو۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں تو تھوڑا بہت کھا پی کر یہاں سے رفو چکر ہو جاؤں گا لیکن میں جس بھیانک چکر میں پھنسنے والا تھا اس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ میں نے زمانے کی بڑی مار کھائی ہے۔ بڑے بڑے نشیب و فراز سے گزرا ہوں۔ ہر قسم کے حالات دیکھے ہیں۔ بستر سنجاب وسمور پر بھی سویا ہوں اور فٹ پاتھوں پر بھی راتیں بسر کی ہیں۔ شرافت کا ماحول بھی دیکھا ہے اور گناہ کی دلدلوں سے بھی بمشکل بچا ہوں۔ میں نے ان سارے تجربات سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ سبق میں نوجوان نسل تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہ سبق یہ ہے کہ جب کبھی گناہ کا خیال دل میں آئے تو اسے اپنے ارادے کی ساری طاقت کا زور لگا کر فوراً دل سے نکال کر پھینک دیں اور توبہ استغفار کریں۔ گناہ کی طرف قدم بھی نہ بڑھائیں۔ یہ ہرگز نہ سوچیں کہ کوئی بات نہیں پھر کیا ہوا۔ میں زیادہ آگے نہیں جاؤں گا۔ بس دو چار قدم چل کر واپس آ جاؤں گا۔ نہیں نہیں، ایسا ہرگز ہرگز نہ سوچیں۔ گناہ کے راستے پر آدمی ایک بار چل پڑے تو پھر اس کا واپس آنا محال ہو جاتا ہے۔ اس لیے اول تو دل میں گناہ کا خیال بھی نہ لائیں لیکن بندہ بشر ہے اگر گناہ کا خیال آ بھی جائے تو اسے فوراً دل سے نکال کر پھینک دیں۔ ایسے ماحول میں بھی نہ بیٹھیں جہاں گناہوں کی ترغیب کا امکان ہو۔ جس گاؤں میں آپ کو نہیں جانا اس گاؤں کا کسی سے راستہ بھی نہ پوچھیں۔ میں یہ غلطی کر بیٹھا تھا اور پھر اس کا مجھے جو خمیازہ بھگتنا پڑا اس کے تصور ہی سے آج میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس وقت میرے دل میں گناہ کا خیال موجود تھا۔ جب میں مسجد سے نکل کر اس پراسرار جنگلی عورت کے پیچھے چل پڑا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں بیٹھا چاول کھا رہا تھا اس وقت میں نے گناہ کے خیال کو دل سے ضرور نکال دیا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں تھوڑے بہت چاول کھا کر واپس جنگل والی مسجد میں چلا جاؤں گا لیکن مجھ سے وہی خطرناک غلطی ہوگئی تھی کہ میں گناہ کے راستے پر قدم بڑھا چکا تھا۔ اور گناہ کے راستے پر چل نکلا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ جب میں نے کھانا کھایا تو عورت سے کہا۔

''تمہارا شکریہ اب میں واپس جاتا ہوں۔ مسجد میں مجھے اپنے ایک ساتھی کا انتظار ہے وہ آنے ہی والا ہوگا۔''

جنگلی عورت نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے سانس میں ایسی آواز تھی جیسے خشک پتوں پر سانپ چل رہا ہو۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو اس عورت نے جو ابھی تک پتوں کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے بٹھالیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں مردوں ایسی طاقت تھی مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں کچھ خوفزدہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ آج میرے ساتھ جنگل کی سیر کرو۔ پھر میں تمہیں جہاں کہو گے چھوڑ آؤں گی۔''

میں نے خوف کو دل سے نکال کر باہر پھینک دیا اور اس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ تمہاری زبان جنگلی قبیلے کی عورتوں والی نہیں ہے۔ تم بڑی صاف ہندی بولتی ہو۔ تمہارا رنگ روپ بھی جنگلی قبیلے کی عورتوں کی طرح نہیں ہے۔ کیا تم کوئی بھوت پریت ہو؟''

وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں عجیب قسم کی گھنٹیوں کی آواز مجھے سنائی دی۔ کہنے لگی۔

''اگر میں بھوت پریت ہوتی تو تمہیں اب تک کھا گئی ہوتی۔''

پھر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگی۔

''میں ساتھ والے گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔ مسجد کے سامنے سے گزر رہی تھی تم پر نظر پڑی' تم اچھے لگے' تمہیں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ اس سے زیادہ تم اور پوچھ کر کیا کرو گے؟''

میں نے کہا۔ ''تم اتنی جلدی کھانا کہاں سے لے آئی تھیں؟ یہاں آس پاس تو مجھے کوئی گاؤں نظر نہیں آیا۔''

اس نے کہا۔

''میں مہینے میں ایک آدھ بار اکیلی جنگل کی سیر کرنے نکل پڑتی ہوں۔ یہ جھونپڑی میں نے اسی لیے بنوائی ہے۔ یہاں میں کھانا پکا کر رکھ لیتی ہوں۔ رات پڑ جائے تو اس جھونپڑی میں سو بھی جاتی ہوں۔''

میں نے اٹھنے کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جنگل کی سیر پھر کبھی کرلوں گا۔ اس وقت مجھے مسجد میں پہنچنا ہے۔ میرا دوست وہاں آنے ہی والا ہوگا۔''

اس عورت نے گردن ایک طرف جھکا کر بڑے خاص انداز سے کہا۔

''اگر تم کسی خاص چیز کی تلاش میں آئے ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔''

میں ذرا ٹھٹک گیا۔ واقعی یہ عورت میری مدد کرسکتی تھی۔ عائشہ کو لے کر جرائم پیشہ پجاری گنگولی اسی علاقے میں آیا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے اس عورت کے ذریعے مجھے پجاری گنگولی کا کوئی سراغ مل جائے پھر بھی میں نے اسے اپنے دل کا راز نہ بتایا اور اسے مزید ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں کسی چیز کی تلاش میں آیا ہوں؟''

عورت مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''میں تمہارے دل کا حال تمہارے چہرے سے پڑھ رہی ہوں۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم کوئی خاص مقصد لے کر ان جنگلوں میں آئے ہو اور ہاں' مجھے ہاتھ دیکھنا بھی آتا ہے لاؤ میں تمہارا ہاتھ دیکھتی ہوں۔''

ہاتھ دکھانا آدمی کی بڑی کمزوری ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کردیا۔ اس نے میرے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا۔ ان پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ تم کسی مسلمان لڑکی کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔''

میں تو اپنی جگہ سے ایک بار ہل گیا۔ اس عورت کو کیسے پتا چل گیا تھا کہ ہاتھ کی لکیریں اتنا کچھ بتا دیتی ہیں؟ کیا واقعی وہ دست شناسی کی ماہر تھی؟ میں نے اپنی ہتھیلی کو مزید کھولتے ہوئے کہا۔

''کیا میرے ہاتھ کی لکیریں بتاسکتی ہیں کہ وہ مسلمان لڑکی اس وقت کہاں ہے؟''

اس نے میرے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بند کردیا اور بولی۔

''ہاتھ کی لکیریں تو نہیں بتاسکتیں مگر میں بتاسکتی ہوں۔''

میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

''پھر مجھے بتاؤ مسلمان لڑکی اس وقت کہاں ہے۔ کس حال میں ہے؟''

عورت ایک دو سیکنڈ کے لیے خاموش ہوگئی۔ میری طرف مسلسل تکتی رہی پھر آہستہ سے سانس بھر کر کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس مسلمان لڑکی سے ملاتی ہوں۔''

مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے اس مسلمان لڑکی کے پاس لے چلو۔''

وہ ہنس پڑی۔

''میرا نام روپا ہے۔ تم میرا نام لے کر مجھے بلاؤ۔''

میں نے فوراً کہا۔

''ہاں روپا مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو۔ کیا تم اسے مل چکی ہو؟''

اب میں بھی اس پراسرار عورت کو روپا کے نام سے ہی یاد کروں گا۔ روپا ہنس کر بولی۔

''کیوں نہیں؟ مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے۔ اس کا نام عائشہ ہے نا؟'' میں خوشی سے اچھل پڑا۔

''ہاں ہاں' یہی نام ہے اس لڑکی کا۔ بے چاری مصیبت کی ماری ہے۔ غریب لڑکی ہے۔ ایک بدمعاش اسے اٹھا کر یہاں لے آیا ہے۔ اس کے ماں باپ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

روپا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ تمہیں عائشہ سے ملاتی ہوں۔''

میں اس کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ اب وہ عورت مجھے کوئی بھوت پریت قسم کی عورت نہیں لگ رہی تھی بلکہ میں اسے علم نجوم یا جوتش کے علم کا ماہر سمجھنے لگا تھا۔ جنگلوں میں جو قبیلے خاص طور پر وسطی اور جنوبی ہند کے جنگلی قبیلے آباد ہیں ان کے ہاں ایسے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں جو جادو ٹونے اور جوتش کے علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے بعض قیافے بالکل سچ نکلتے ہیں۔ یقیناً اس عورت روپا نے بھی جو اپنے آپ کو کسی جنگلی قبیلے کے سردار کی بیٹی بتایا تھا یہ علم حاصل کر رکھا

ہوگا۔ آسمان پرنئی کالی گھٹائیں آنا شروع ہوگئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ اب پھر بارش ہوگی۔ وہ مجھے لے کر اس راستہ پر جارہی تھی جس راستے سے میں آیا تھا۔ ہم مویشیوں کے خالی باڑے کے قریب سے بھی گزرے۔ جب جنگل والا پرانا تالاب آیا جہاں رات کے وقت میں نے ایک عورت کو نہاتے ہوئے دیکھا تھا تو میں نے روپا سے پوچھا۔

"ابھی کتنی دور چلنا ہوگا؟"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا تھک گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ میں نے ویسے ہی پوچھا تھا۔"

ہم اونچے اونچے گھنے درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ وہ ایسے چل رہی تھی جیسے اس جنگل کے چپے چپے سے واقف ہو۔ ایک جگہ گھنے درختوں سے باہر نکلے تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ میرے سامنے وہی آسیب زدہ ٹیلہ تھا جس کے اوپر رات والی کوٹھڑی دن کی روشنی میں صاف نظر آرہی تھی۔ میرے قدم آہستہ ہوگئے۔ روپا اسی ٹیلے کی طرف جارہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا مسلمان لڑکی اسی کوٹھڑی میں ہے؟"

روپا نے رک کر میری طرف دیکھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے مگر میں تمہیں یہاں بٹھا کر اسے لے آؤں گی۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟ یہاں کوئی شیر باگھ نہیں رہتا آؤ۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ جب ہم ٹیلے والی آسیب زدہ کوٹھڑی کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں کہا۔ "یا خدا! تو ہی میری حفاظت کرنا۔"

مگر خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنی حفاظت نہیں کی تھی پھر خدا میری حفاظت کیوں کرتا۔ مجھے مسجد سے نکل کر اس عورت کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہیے تھا۔ مسجد میری پناہ گاہ تھی۔ میں وہاں پر خود بھی اپنی حفاظت کررہا تھا اور خدا نے بھی مجھے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا۔ میں اپنے نفس کے کہنے پر مسجد سے اٹھ کر اس عورت کے ساتھ ہوگیا اور یوں میں نے اپنے آپ کو شیطان کے آگے ڈال دیا تھا اور اپنی حفاظت سے غافل ہوگیا تھا۔ اب میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہونے والا تھا جو اپنے نفس کا غلام بن جانے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

دن کی روشنی میں کوٹھڑی کی مخروطی چھت اور بوسیدہ دیواریں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے روپا سے پوچھا۔

"کیا یہ کوئی مندر ہے؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔"

وہ کوٹھڑی میں داخل ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کوٹھڑی میں دن کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے کوٹھڑی کے کونے والے چھوٹے دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جس کے پیچھے سے رات کے وقت کسی عورت کے دستک دینے اور پھر مدد کے لیے پکارنے کی آواز آئی تھی۔ میں دل میں کچھ ڈر سا ضرور محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا فضا میں سیندور کی بو موجود نہیں ہے۔ میں نے روپا کو بالکل نہ بتایا کہ میں طوفانی بارش والی گزشتہ رات کا ایک حصہ اس کوٹھڑی میں بسر کرچکا ہوں۔ روپا کونے والے دروازے کو کھو

ے دیکھ رہی تھی۔

بادلوں میں ایک بار پھر زوردار گرج کی آواز پیدا ہوئی۔ روپا نے میری طرف ایک نظر دیکھا اور کہا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں عائشہ کو لے کر آتی ہوں۔"

میرا ذہن الجھتا جارہا تھا۔ روپا سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ عائشہ کو کہاں سے لائے گی؟ یا کیا وہ دروازے کی دوسری جانب کسی چھوٹی کوٹھری میں بند ہے؟ میں وہیں چوکھٹ کے قریب بیٹھ گیا جہاں رات کو بیٹھا ہوا تھا۔ میری آنکھیں روپا پر لگی ہوئی تھیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ کونے والے دروازے کے پاس گئی۔ دروازہ کھولا اور جھک کر دروازے کے دوسری جانب اتر گئی۔ اس کے اترنے کے انداز سے معلوم ہوا کہ دوسری طرف سیڑھیاں نیچے کسی تہہ خانے میں بنی ہیں۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا تھا۔ دروازے کے کھلتے ہی مجھے وہی سیندور کی منحوس بو ایک بار پھر آئی تھی۔ دروازہ بند ہونے کے بعد آہستہ آہستہ یہ بو غائب ہوگئی۔ اس جنگلی عورت روپا کے بارے میں میرا ذہن بالکل صاف ہوچکا تھا۔ پہلے میں اسے ضرور ایک پراسرار عورت سمجھتا تھا لیکن اب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ ہاتھ کی ریکھاؤں کے علم کی ماہر ہے اور ہوسکتا ہے کہ تھوڑا بہت کالا جادو کرنا بھی جانتی ہو۔ اس کوٹھڑی کے بارے میں بھی دن کی روشنی میں رات کے سارے واقعات موہوم سے لگنے لگے تھے اور میں انہیں محض اپنا وہم سمجھنے لگا تھا۔ رات کا وقت ہو۔ گھنا جنگل ہو، بارش ہورہی ہو تو آدمی کا ذہن خودبخود توہمات کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ میرے وہم کا کرشمہ ہو اور رات کو کسی نے بھی چھوٹے دروازے پر دستک نہ دی ہو۔ کسی عورت نے مجھے دروازے کی دوسری طرف نہ بلایا ہو اور میرے نزدیک قریب آکر گہرا سانس نہ لیا ہو۔ باقی سیندور کی

بو کا جہاں تک تعلق تھا تو وسطی اور جنوبی ہند کے جنگلوں میں اکثر اس طرح کے چھوٹے چھوٹے پرانے مندر یا مڑھیاں ہوتی ہیں جہاں پجاری دیوار پر کسی دیوی دیوتا کی شکل بنا کر اس پر سیندور مل دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کوٹھڑی میں بھی کسی نے ایسا ہی کیا ہوگا۔

میری اسی حقیقت پسندانہ سوچ نے میرے ذہن کو توہمات اور بھوت پریت چڑیلوں کے خیالات سے بالکل پاک کردیا اور میں اب بے چینی سے روپا کی واپسی کا انتظار کررہا تھا کب وہ عائشہ کو لے کر دوسری کوٹھڑی یا تہہ خانے سے باہر آتی ہے۔ سیاہ گھٹاؤں نے جنگل کے درختوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا کردیا تھا۔ بادل برابر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گرج رہے تھے پھر موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور ایک دو منٹ بعد موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش کی بوچھاڑیں کوٹھڑی میں آرہی تھیں۔ میں چوکھٹ سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں بار بار کونے والے دروازے کی طرف دیکھتا، مگر دروازہ اسی طرح بند تھا۔ بارش کی آواز نے کافی شور مچا رکھا تھا۔ کوٹھڑی کی چوکھٹ کے اوپر باہر کی جانب جو چھجہ لگا تھا اس پر سے بارش کا پانی شور مچاتا ہوا نیچے گررہا تھا۔ مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں برسات کے موسم میں بڑی موسلادھار بارشیں ہوتی ہیں۔ بادل کئی کئی دن تک چھائے رہتے ہیں۔ بارش رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میرا دھیان روپا کی طرف لگا ہوا تھا جو عائشہ کو لینے تہہ خانے میں گئی ہوئی تھی۔ بارش کے شور میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے کونے والے دروازے پر زور سے دستک دی ہو۔ ساتھ ہی مجھے روپا کی آواز سنائی دی۔

"نیچے آؤ، عائشہ بے ہوش پڑی ہے۔"

میں دوڑ کر چھوٹے دروازے کی طرف گیا۔ جلدی سے اسے کھولا۔ نیچے سیڑھیاں تھیں اور ہلکی ہلکی روشنی

ہو رہی تھی۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا تہہ خانے میں اتر گیا۔ تہہ خانے میں نہ روپا تھی نہ عائشہ۔ دیوار کے ساتھ ایک لالٹین روشن تھی؛ میں حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک پھنکار کی آواز گونجی اور ایک سیاہ کالا سانپ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور سرخ زبان خوفناک پھنکار کے ساتھ بار بار باہر نکل رہی تھی۔ دہشت کے مارے میرا سارا بدن سن ہو گیا۔ سانپ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔

موت میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ سانپ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ سانپ کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش نے مجھ پر سحر سا طاری کر دیا تھا۔ اچانک میرے اندر ایک طاقت سی بیدار ہو گئی۔ میں نے تیزی سے ایک طرف چھلانگ لگائی۔ عین اسی وقت سانپ نے بھی مجھ پر چھلانگ لگا دی اور میری گردن پر ڈس دیا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا پھر یہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ شاید میں گر پڑا تھا۔

کچھ پتا نہیں میں کب تک وہاں بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ میری آنکھوں کے سامنے چمکدار ستارے گردش کر رہے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ میں سانپ کے ڈسنے سے مر چکا ہوں اور یہ موت کے بعد کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دل میں کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے جو ستارے گردش کر رہے تھے وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے پھر وہ ایک مرکز پر جمع ہو گئے اور اسی مرکز نے ایک چھوٹے سے شعلے کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے غور سے دیکھا یہ چھوٹا سا شعلہ دیوار پر لگی ہوئی لالٹین کا شعلہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں زندہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ میں مرا نہیں تھا۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ جسے سانپ ڈس لے اسے بڑی پیاس لگتی ہے۔ مجھے پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سنا ہوا تھا کہ سب سے زہریلا سانپ پھنیئر سانپ ہوتا ہے یعنی کوبرا سانپ...... اور جسے یہ سانپ ڈسے اس کا سارا جسم ایک منٹ کے اندر اندر پگھل جاتا ہے۔ مگر میرا جسم بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تہہ خانہ خالی تھا۔ دیوار کے ساتھ لگی لالٹین جل رہی تھی مگر اس کی لو دھیمی ہونے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کافی دیر تک وہاں بے ہوش پڑا رہا تھا۔

میرا ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھ گیا۔ سانپ نے میری گردن پر ڈسا تھا۔ میں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح دیکھا۔ وہاں سانپ کے ڈسنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ سانپ ڈس جائے تو جہاں وہ ڈسے وہاں اس کے دانتوں کے نشان ضرور پڑ جاتے ہیں اور وہاں سے جگہ بھی ابھر آتی ہے مگر میری گردن بالکل صاف تھی۔ میرا سر بھی نہیں چکرا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ یقیناً یہ جنگلی عورت روپا کوئی بھوت پریت یا بدروح تھی جس نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گئی۔ بدروح ہونے کی وجہ سے اسے میرے دل کا حال بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے نیچے بلایا اور سانپ بن کر میری گردن پر ڈس لیا۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر اس نے مجھے زندہ کیسے چھوڑا؟ زندہ کیوں چھوڑا؟ ہو سکتا ہے وہ مجھے مارنا نہ چاہتی ہو لیکن اگر بدروح روپا مجھے ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی تو پھر مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ میں نے یہ سوچ کر اپنے ذہن سے بدروح روپا کا خیال جھٹک دیا

کہ کوئی بھوت پریت قسم کی مخلوق تھی جواب دفع ہو گئی ہے۔ میں تہہ خانے سے نکل کر کوٹھڑی میں آیا تو بارش رک چکی تھی۔ بادل اسی طرح جھکے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ دن کافی گزر چکا ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر مسجد کی طرف چل پڑا۔ مسجد میں آ کر میں نے وضو کر کے مزید دو نفل ادا کیے اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ میں سیدھی راہ سے بھٹک گیا تھا۔ خدا کے حضور توبہ استغفار کرنے سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں کسی غیبی اشارے کے انتظار میں ایک بار پھر مسجد کے برآمدے میں ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر بیٹھا رہا۔ وہاں کوئی نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اب اپنی ہمت سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے خدا کے حضور دوبارہ دعا مانگی اور مسجد سے باہر آ گیا۔ اب میں شمال مشرق کی طرف چلنے لگا۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق چار دھار جواڑے کی سرحد وہیں سے شروع ہوتی تھی۔ چلتے چلتے گھنا جنگل ختم ہو گیا اور کھیت شروع ہو گئے۔ کھیتوں میں ایک دو آدمی اور عورتیں کام کرتی نظر آئیں۔ مجھے گنگولی نام کے پجاری کی تلاش تھی جو عائشہ کو لے کر اسی رجواڑے میں آیا تھا۔ اس کا سراغ مجھے کسی مندر سے ہی مل سکتا تھا۔ میں کھیتوں میں کام کرتے ایک کسان کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ یہاں کوئی مندر وغیرہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اپنی زبان میں بتایا کہ آگے رجواڑے کا بڑا شہر ہے وہاں مندر بھی ہے دھرم شالہ بھی ہے۔ میں اس سے پورا راستہ سمجھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ موسلا دھار بارشوں نے علاقے کے تال تلیا سب بھر دیئے تھے۔ ندی نالے چڑھی ہوئی تھیں مگر علاقہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے راستوں میں پانی کہیں نہیں جمع ہوا تھا۔ یہ اس قسم کا پہاڑی علاقہ بھی نہیں تھا کہ بہت زیادہ اترائیاں چڑھائیاں ہوں۔ چھوٹے چھوٹے نشیب و فراز ضرور تھے۔ کہیں کھلی جگہ اور کھیت آ جاتے تھے۔ دن کی روشنی شام کے دھندلکے میں بدل رہی تھی۔ چلتے چلتے میں ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ بانس اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں والا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو دیہاتی عورتیں ناریل کی چھال کی رسی بٹ رہی تھیں۔ میں نے ان سے شہر کے بارے میں پوچھا۔ وہ ہنسنے لگیں اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ میں ادھر کو چل پڑا۔

دور سے مجھے کسی شہر کی فصیل نظر آنے لگی۔ پہلے تو میں انہیں درختوں کی قطار سمجھا مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ شہر کی پرانی فصیل ہے۔ فصیل اونچے ٹیلے پر تھی مگر شہر اس کے دامن میں اور کچھ پہاڑی ڈھلان پر آباد تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ بڑا قصبہ تھا۔ ایک ندی شہر کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ ندی کے کنارے ایک مندر تھا جس کا آدھا چبوترہ خشکی پر تھا اور آدھا ندی کے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ قریب ہی سرخ کھپریل کی ڈھلواں چھتوں والے کچھ مکان تھے۔ اس علاقے کے بازاروں میں گھومنے پھرنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں میں ساری آبادی میں گھوم گیا۔ مجھے کہیں کوئی مسجد نظر نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ یہاں اگر کوئی مسجد ہو تو میں اس مسجد کے پیش امام صاحب سے مل کر اس سے مدد مانگوں مگر وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قصبے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے یا شاید وہاں کوئی مسلمان ہی نہیں رہتا۔ شام ہو رہی تھی۔ مجھے رات گزارنے کی بھی فکر تھی۔ میں قصبے کے مندر کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ایک دکان کے اندر سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا نظر آیا۔

قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک کالا کلوٹا سا آدمی بڑی سی انگیٹھی جلا کر بیٹھا ہے۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی اور پر سلور کا کالا سیاہ دیگچہ رکھا ہوا تھا۔ دکان کے آگے زمین پر تین چار دیہاتی قسم کے لوگ آمنے سامنے بیٹھے کیلے کے پتوں پر چاول اور بھاجی ڈالے کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ قصبے کا ہوٹل ہے۔ دکان چھوٹی سی تھی اندر دھواں بھرا ہوا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ میرے پاس پیسے تھے۔ میں نے بھی کیلے کے پتے پر چاول اور بھاجی لی اور ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا۔ میری بش شرٹ اور پتلون سے صاف لگ رہا تھا کہ میں شہر کا رہنے والا ہوں۔ ایک دو آدمیوں نے مجھے غور سے دیکھا پھر اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی زبان تامل تلیگو نہیں تھی وہ ٹھیٹ دیہاتی ہندی بول رہے تھے جس میں مراٹھی اور گجراتی الفاظ کی آمیزش تھی۔ مراٹھی اور گجراتی زبان کے لفظ میں پہچان لیتا تھا۔

ایک بوڑھا دیہاتی میرے قریب ہی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں شہر سے آیا ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ایک شکاری دوست سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ بھوپال چلا گیا ہے۔ اب میں بھی بھوپال واپس چلا جاؤں گا۔ بوڑھا تجربہ کار تھا۔ کہنے لگا بابو تمہاری زبان بھوپال والوں کی نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

”میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ بھوپال میں چھٹیاں گزارنے اپنے تایا کے گھر آیا ہوا ہوں۔ کیا تم مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“

بوڑھا اپنے کرتے سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک پوٹلی کھول کر اس میں سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بولا۔

”رات ہو رہی ہے۔ دیو گڑھ نہیں پہنچ سکو گے راستے میں جنگل پڑتا ہے۔ رات کہاں گزارو گے؟“

میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا مجھے رات گزارنے کا کوئی ٹھکانہ بتا دے میں نے کہا۔

”یہی میں بھی سوچ رہا ہوں یہاں کوئی دھرم شالہ بھی نہیں ہے۔“

بوڑھے نے کش لگا کر کھانستے ہوئے کہا۔

”مندر کی دھرم شالہ تو ہے مگر وہاں کوئی مسلمان نہیں ٹھہر سکتا۔ ایسا کرو اسی دکان میں رات کو پڑ کر سو جاؤ۔ میں دکاندار سے کہے دیتا ہوں۔“

دکان کے اندر جو دھواں بھرا ہوا تھا میں اس کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ دوسرے میں نے دھرم شالہ کا سن کر اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں دھرم شالہ میں ہندو بن کر رات گزار لوں گا۔ رام دلاری کے کہنے پر میں ہندو بن کر پہلے بھی اداکاری کر چکا تھا اور مجھے اس کا تجربہ ہو گیا تھا۔ میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھانے کے بعد ہوٹل والے کو پیسے دے کر آگے چل دیا۔ مندر بازار کی نکڑ پر ندی کنارے واقع تھا۔ چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے اپنا ہندوانہ نام جگدیش سوچ لیا تھا۔ مندر میں مجھے ایک پجاری مل گیا جس نے مجھے مہنت کے پاس پہنچا دیا۔ مہنت دھوتی پہنے چارپائی پر بیٹھا کھرل میں کچھ گھوٹ رہا تھا۔ سوائے میلی سی دھوتی کے اس کے جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ ماتھے پر تین سفید لکیریں پڑی تھیں۔ میں نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا کہ میں بھوپال سے ایک دوست کی تلاش میں یہاں آیا تھا وہ نہیں ملا۔ رات دھرم شالہ میں گزار کر صبح واپس بھوپال جانے کا ارادہ ہے۔ مہنت نے ایک بار بھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جب میں بات ختم کر چکا تو کھرل کو چارپائی کے نیچے رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا میں نے اپنا نام جگدیش بتایا۔

”ویشنو ہو؟“

مہنت کے اس سوال پر میں تذبذب میں پڑ گیا لیکن زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہہ دیا ہاں جی ویشنو ہوں۔ اس نے میرے ساتھ آئے ہوئے پجاری سے کہا۔

”مرلی اسے دھرم شالہ کے ورانڈے میں کھٹیا ڈال دو۔“

کوارٹر نما دھرم شالہ ساتھ ہی احاطے میں ایک طرف تھی۔ برآمدے میں ایک بانس کی چارپائی ڈال دی گئی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ مندر میں ایک بلب جل رہا تھا۔ پوجا کرنے والی ایک عورت باہر نکل رہی تھی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ مچھر تنگ کر رہے تھے۔ کچھ میرا ذہن خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ جس مقصد کو لے کر میں آیا تھا اس کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ابھی تک پجاری گنگولی کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ آدمی تھا جو عائشہ کو بمبئی سے لے کر چاردھا کے رجواڑے میں آیا تھا۔ صورت حال نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ صبح اس مندر کے کسی پجاری سے باتوں ہی باتوں میں گنگولی پجاری کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں سے مجھے اس کا کوئی کھوج مل جائے۔

برآمدے میں جس دیوار کے ساتھ میری چارپائی بچھی ہوئی تھی اس دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی جس پر سلاخیں لگی تھیں اور جو بند تھی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ندی کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی جو بڑی خوشگوار تھی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ایک پل کے لیے آنکھ لگی تو مچھروں نے جگا دیا مگر نیند کا غلبہ شدید تھا۔ مچھر کاٹتے رہے اور میں سو گیا۔ مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ اچانک کھڑاک سا ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لیٹے لیٹے نیم وا آنکھوں سے برآمدے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں دو آدمیوں کو دیکھا جو ایک صندوق کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف لا رہے تھے۔ یہ وہی کوٹھڑی تھی جس کی کھڑکی میری چارپائی کے اوپر کھلتی تھی۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک مندر کا مہنت تھا اور دوسرا وہ پجاری تھا جو مجھے مہنت کے پاس لے گیا تھا۔ میں ان لوگوں کا کوئی مہمان تو تھا نہیں کہ وہ خیال رکھتے کہ شور سے میری آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ صندوق کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے اندر لے گئے۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر مچھروں نے حملہ کر دیا۔ میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ندی کی طرف سے جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آدمیوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر سے ان کے باتیں کرنے کی آواز بند کھڑکی کے پیچھے سے مجھے دھیمی مگر صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ مہنت کی آواز میں نے پہچان لی۔ وہ پجاری سے کہہ رہا تھا۔

”ماتا رام سے کہہ دینا۔ اب میں اس کا مال مندر میں نہیں چھپاؤں گا۔ کیا دیا ہے اس نے مجھے؟ وہ تمہارا گنگولی تھا میں نے دو دن اسے اپنے پاس رکھا۔ سالا جاتی دفعہ لڑکی کو بھی ساتھ لے گیا۔“

پجاری کی آواز آئی۔

”گورو دیو مجھے کیا معلوم تھا کہ گنگولی کے دل میں کھوٹ ہے۔“

مہنت نے گنگولی کو گالی دے کر کہا۔

”لڑکی کو اس نے بیرو گڑھ کے پٹیل کے ہاتھ بیچ

دیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ چار ہزار میں بیچا ہے اس نے۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی طرح لڑکی کو پٹیل کے گھر سے نکال کر لے آؤں۔ دیوگڑھ کا رائے صاحب مجھے اسی لڑکی کے پانچ ہزار آسانی سے دے دے گا۔ مسلمان لڑکی کا بھاؤ زیادہ لگتا ہے۔“

پھر وہ پجاری کو گالیاں دیتا کوٹھڑی کے باہر آ گیا۔ میں ان کے باہر نکلنے سے پہلے چارپائی پر لیٹ گیا تھا مگر میں نے آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھول رکھی تھیں۔ مہنت آگے آگے تھا' پجاری پیچھے پیچھے۔ دونوں برآمدے میں سے گزر کر مندر کی طرف چلے گئے۔ میں قدرت کی شان پر حیران رہ گیا۔ مجھے برآمدے میں چارپائی پر لیٹے لیٹے عائشہ کا سراغ مل گیا تھا۔ اسے گنگولی نے بیروگڑھ کے کسی پٹیل کے ہاتھ بیچ دیا تھا گجرات کاٹھیاواڑ کے صوبے میں پٹیل دولت مند زمیندار کو کہتے ہیں۔ بیروگڑھ کا یہ پٹیل ضرور کاٹھیاواڑ کے صوبے سے مدھیہ پردیش میں آ کر آباد ہوگیا ہوگا۔ صبح اٹھتے ہی میں اسی چائے کی چھوٹی سی دکان پر ناشتہ کرنے چلا گیا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ بیروگڑھ وہاں سے کتنی دور ہے اور کس طرف ہے۔ یہ معلومات مجھے بغیر کسی دقت کے حاصل ہوگئیں۔ بیروگڑھ وہاں سے مشرق کی جانب کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا جہاں گجانند نام کا ایک ہندو کاٹھیاواڑی سیٹھ قصبے کا سب سے امیر زمیندار تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کو سود پر رقم بھی دیتا ہے اور ساہوکار بھی ہے۔ بیروگڑھ تک وہاں سے بیل گاڑیاں جاتی تھیں۔ میں بھی سواریوں والی ایک بیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی کے آگے دو مریل سے بیل جتے ہوئے تھے جو نپی تلی چال کے ساتھ جھاڑیوں درختوں میں گھرے ہوئے کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ جنگل کی خاموشی میں ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پندرہ میل کا فاصلہ بیل گاڑی نے دو تین گھنٹوں میں طے کیا۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی بان پان بیڑی پینے کے لیے بھی رک گیا تھا۔ بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک کسان سے میں نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ گجانند پٹیل کا مکان قصبے کے کونے میں تالاب کے کنارے واقع ہے اور پکا مکان ہے۔ اس کی دکان قصبے کے ساہوکارہ بازار میں ہے اور قصبے کا ایک ہی بازار ہے۔ میں بیروگڑھ پہنچا تو دوپہر کا وقت ہوگیا تھا۔ موسم ابر آلود تھا۔ بارش صبح سے بند تھی۔ بیروگڑھ کا قصبہ گاؤں سے ذرا بڑا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پٹیل کی دکان کا پتا معلوم کیا اور قصبے کے ساہوکار بازار میں آ گیا۔ گجانند پٹیل ادھیڑ عمر کا پلپلا سا ہندو تھا۔ توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ دھوتی بنیان پہنے' ماتھے پر تلک لگائے وہ دکان میں بیٹھا کسی عورت کے بہی کھاتے پر انگوٹھا لگوا رہا تھا۔

میں نے اس سود خور پٹیل کو دکان پر ہی چھوڑا اور سیدھا اس کے گھر کی تلاش میں قصبے کے تالاب کی طرف چل دیا۔ قصبے کے باہر ایک ہی تالاب تھا جس کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ تالاب کے پاس ہی ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ جس کے کلس پر زرد رنگ کا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس سے گجانند پٹیل کے گھر کا پتا پوچھا تو اس نے لاٹھی سے تالاب کے مشرقی کونے والے پکے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ یہ وہی مکان تھا جس کے بارے میں مجھے پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ تالاب کے کونے والا پکا مکان پٹیل کا ہے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پٹیل خود گھر پر نہیں ہے۔ دکان پر ہے مگر گھر پر اس کی بیوی بچے نوکر چاکر ضرور ہوں گے۔ عائشہ بھی ضرور وہیں ہوگی۔ ان سب کے سامنے میں نہ تو عائشہ سے کوئی بات کرسکتا تھا نہ اسے بھگا کر لے جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عائشہ مجھے دیکھتے ہی فرط جذبات سے پکار اٹھے۔ بھیا مجھے یہاں سے نکالو۔ اور پٹیل کے آدمی مجھے بھی پکڑ لیں۔ اس کے لیے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات کا علم ہوجانا چاہیے کہ عائشہ پٹیل کے گھر میں ہی ہے۔ اس کے بعد اسے وہاں سے نکال لے جانے کی ترکیب سوچی جائے۔

اس علاقے میں قصبوں دیہاتوں کے مکان کشادہ ہوتے ہیں اور ہندوؤں کے مکانوں کے دروازے عام طور پر کھلے ہی ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں بے پردگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی عورتیں تالابوں میں مردوں کے سامنے بھی کپڑے اتار کر اشنان کرنا شروع کردیتی ہیں بلکہ ہندوؤں کے بعض فرقوں کا خیال ہے کہ عورت کے عریاں بدن پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جانے سے عورت کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ باتیں میں خاص طور پر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کے لیے لکھ رہا ہوں جو ہندو تہذیب کے ان پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔ پٹیل قصبے کا امیر آدمی تھا۔ اس کے مکان کے گرد تین چار فٹ کی پکی چار دیواری تھی مگر دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ کچا صحن صاف نظر آ رہا تھا۔ صحن کی ایک جانب گائے بندھی ہوئی تھی۔ برآمدے میں چارپائی بچھی تھی۔ وہاں کوئی آدمی یا عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں مکان کے سامنے کچھ فاصلے پر نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑا مکان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت گیلے کپڑے لے کر آئی اور صحن کی رسی پر ڈالنے لگی۔ وہ عائشہ نہیں تھی۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا سا لڑکا گھوڑے کی باگ تھامے سڑک پر چلتا ہوا آیا اور گھوڑے سمیت مکان کے صحن میں داخل ہوگیا۔ یہ ضرور پٹیل کا بیٹا ہوگا۔ میں نے سوچا' ایک بوڑھا دیہاتی مجھے گھورتا ہوا گزر گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میں درخت کے پیچھے چھپ کر پٹیل کے مکان میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا اور بازار میں دوسری طرف نکل گیا۔ آگے کھیت آ گئے۔ کھیت میں ایک کنواں بھی تھا جہاں سے عورتیں پیتل کے مٹکوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ میں الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کھیت کے کنارے کنارے ایک طرف چل پڑا۔ اگر میں بے دھڑک پٹیل کے گھر میں داخل ہوکر شور مچادوں کہ پٹیل میری بہن کو اغوا کر کے لے آیا ہے تو کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ پٹیل اثر و رسوخ والا آدمی ہے وہ تو الٹا مجھے پولیس کے ذریعے حوالات میں بند کرا دے گا۔ چلتے چلتے کھیت ختم ہوا تو آگے ایک گہری کھڈ آ گئی۔ میں دائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں ایک درخت کے نیچے کسی کا مزار سا بنا ہوا نظر آیا۔ قبر پر گوٹے کی جھالریں پڑی تھیں۔ قبر کے اوپر بھی گوٹے کی جھالریں درخت کی شاخوں سے لٹک رہی تھیں۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی کے باہر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ ہندوؤں کے گڑھ میں کسی مسلمان کے مزار کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے بوڑھے کو جا کر سلام کیا۔ اس نے ناریل منہ سے ہٹا کر وعلیکم السلام کہا۔ میں اس کے پاس بڑے ادب سے بیٹھ گیا اور پوچھا۔ یہ کس بزرگ کا مزار ہے۔ بوڑھے نے ان بزرگ کا نام بتایا۔

(باقی آئندہ)

سربند لفافہ

محترم عمران احمد'
تسلیمات!
پہلی بار ایک سچی کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ اگر دو دوستوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کا بیج بونا ہو تو انہیں ایک ہی لڑکی سے محبت پر مجبور کردو۔ یہ بات کافی حد تک سچ بھی ہے۔ کیونکہ کوئی شخص یہ برداشت نہیں کرتا کہ دوسرا اس کی چاہت میں شریک بنے۔ زیر نظر کہانی بھی دو دوستوں کی ہے جنہیں ایک ہی لڑکی سے محبت ہوجاتی ہے۔

والسّلام
حسن اختر
کراچی

میں حسین وجمیل سائرہ کی محبت میں گرفتار تھا۔ وہ میرے دفتر میں کام کرتی تھی۔ دفتر میں جتنی حسین نوجوان لڑکیاں اور پُرکشش عورتیں کام کرتی تھیں' ان میں سب سے حسین اور نمایاں شخصیت سائرہ ہی کی تھی۔ سائرہ حسین پُرکشش اور جامہ زیب تھی' جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے اور میں اس پر فدا ہوگیا تھا' وہ جیسے حسن وتناسب کی ایک مثال تھی۔ دفتر کی لڑکیاں اور عورتیں اس جیسی جامہ زیب اور اس کی طرح بن سنور کے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے جتن کرتی تھیں اور پھر وہ روشن خیال بھی تھی۔ اسے نہ صرف مطالعے کا شوق تھا بلکہ تمام کھیلوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس کی معلومات بھی بڑی وسیع تھیں۔ کبھی دفتر میں فرصت کے اوقات میں معلومات کا امتحان اس سے لیا جاتا تو وہ سو میں سے اسّی نمبر ضرور لیتی تھی۔ نہ صرف اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں بلکہ اس کی ہنسی بھی بڑی پُرکشش تھی۔ اس کی ہنسی کی کھنک میں قوس قزح کے رنگ دکھائی دیتے چہرے کے سجل اور سبک نقش ونگار تھے۔ سراپا بھی عجیب بہار دیتا تھا۔

مجھے رومان میں کوئی جاذبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں تو بس اب اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ میں تیس برس کا ہوچکا تھا اور ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ میرے پاس اپنا گھر' گاڑی' بینک بیلنس سب کچھ تھا' بس محروم تھا تو ایک رفیق حیات سے' میں خاصا آئیڈیل پرست تھا اور سائرہ میری آئیڈیل تھی۔ اب اس کی عمر بھی تئیس چوبیس برس ہوچکی تھی میرا خیال تھا اگر میں سائرہ کو شادی کی پیش کش کروں گا تو وہ شادی سے انکار نہیں کرے گی' اس لیے کہ دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ میں خوب صورت وجیہہ اور اسمارٹ بھی ہوں اور پھر وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے' میں نے سائرہ کی حرکات وسکنات سے اندازہ کیا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے' اس محبت کا اظہار کسی کی بھی طرف سے نہیں ہوا تھا۔
سائرہ تین برس سے میری کمزوری بنی ہوئی تھی۔ دفتر میں اس کی قربت سے میں عجیب اذیت میں مبتلا ہوجاتا تھا' اس کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے بھی مجھے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی کہ کہیں دفتر کے لوگوں کو میرے دل کا حال نہ معلوم ہوجائے۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں' میں نے اپنی محبت کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا حتیٰ کہ اصغر کو بھی نہیں جو میرا جان سے عزیز دوست تھا۔
میں محبت کے اس یک طرفہ کھیل کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کچھ دنوں سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں کوئی اچھا رشتہ سائرہ کے لیے نہ آجائے' اس کی اب تک شادی نہ ہونا تعجب خیز امر تھا۔ اس موضوع پر میری اصغر سے بھی کئی بار بات ہوئی اس نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ اتنی حسین' پُرکشش اور نفیس قسم کی لڑکی کی شادی کیوں نہیں ہورہی شاید رشتے آرہے ہوں وہ سائرہ کو پسند نہیں آتے ہوں۔ ایک روز میں نے فیصلہ کرلیا کہ اسے کسی پُرفضا مقام پر لے جاکر اس سے اس موضوع پر صاف صاف بات کروں گا اور اس کی رضامندی پاکر رشتہ بھیج دوں گا' اگر اس نے شادی سے انکار کردیا تو......؟ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا' انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سائرہ کو ایسا رشتہ ساری زندگی نہیں مل سکتا تھا۔
ایک روز میں سائرہ کو کافی پلانے ایک ریستوران میں لے گیا۔ ہم ریستوران کے ایک پُرسکون گوشے میں جا بیٹھے۔ وہ کبھی کبھار میرے ساتھ سیر وتفریح کے لیے چلی آتی تھی۔ اس نے کبھی میری کسی دعوت کو رد نہیں کیا تھا۔
آج سے پہلے جب کبھی بھی میں نے تنہائی میں اس سے بات کی تو مجھ پر رعب حسن طاری نہیں ہوا تھا' مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے مجھے ایک خاص قسم کی جھجک سی محسوس ہورہی تھی' مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ سائرہ نے مجھے بھونا ٹائز کررکھا ہے' کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے اعصاب سمیٹے' خود پر قابو پایا پھر میں پُرسکون اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔
''آج مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میری زبان سے نکلنے والا ہر لفظ واضح اور صاف تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہورہی تھی کہ مجھ میں اتنا اعتماد کیسے پیدا ہوگیا۔ ''میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کا تعلق میری ذات' میری زندگی اور میرے خوابوں سے ہے۔ میں بات کو بلاوجہ گھما پھرا کے کہنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم سنجیدگی سے میری بات سنو' جذبات کی بجائے عقل سے کام لو تو تمہیں فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ بات یہ ہے سائرہ......'' میں نے توقف کرکے سائرہ کی جھیل سی آنکھوں میں جھانکا جو میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ سائرہ کے چہرے پر حیرت ہویدا تھی۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا پھر میں نے نپے تلے مدہم اور جذبات بھرے لہجے میں کہا۔
''سائرہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
سائرہ میری بات سن کر چونک پڑی پھر دل فریب انداز میں مسکرائی۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جو میرے دل پر قیامت ڈھا جاتی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی جگہ تذبذب نے لے لی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن دل کی بات کہتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ میں نے سائرہ کو خاموش پاکر اپنی بات کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔
''تم مجھے تین برسوں سے جانتی ہو اور حیثیت و رتبے سے خواب واقف ہو۔ میرا اپنا لگژری فلیٹ ہے' ایک سال پہلے میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ میری دو بہنیں بیاہی جاچکی ہیں' اب میں تنہا ہوں' اس گھر میں ہم دونوں تنہا زندگی گزاریں گے۔

میرے پاس کار بھی ہے، بینک بیلنس بھی ہے، ہم دونوں ایک خوب صورت زندگی بڑی آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ تم چاہو تو ملازمت چھوڑ بھی سکتی ہو، میری تنخواہ میں بڑی آسانی سے گزر بسر ہو سکتی ہے اور پھر ہم دونوں کے خیالات بھی یکساں ہیں، تم اس عرصے میں میرے مزاج، عادات واطوار اور کردار سے بھی بخوبی واقف ہو چکی ہو۔"

"تم بہت اچھے ہو کاشف!" سائرہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کے لطیف لمس نے میری نس نس میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔

سائرہ کے جملے نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ میں نے پہلی بار اس کی زبان سے اپنے بارے میں تعریفی جملہ سنا تھا۔ میں خوشی سے پھولا نہیں سمایا، میں خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو کر بولا۔

"میں آج تمہارے سامنے یہ اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔" میں نے توقف کر کے سائرہ کا نرم ونازک خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اس روز سے سائرہ! جس روز تمہیں پہلی بار دیکھا اسی روز سے محبت کی آگ میرے دل میں فروزاں ہے۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا...... سائرہ......!"

"مجھے تم سے بھی محبت ہے کاشف!" وہ اپنا ہاتھ چھڑائے بغیر بولی۔

"تم سے بھی کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کیا تم کسی اور سے بھی محبت کرتی ہو؟"

"ہاں!" سائرہ نے اقرار کیا پھر اپنا سر جھکا لیا۔

"بیک وقت دو مردوں سے محبت......؟"

"تم اسے محبت کا نام دے دو یا پسند کا، میں تم دونوں کو ہی بہت پسند کرتی ہوں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں جز بز ہو کر بولا۔ "تمہیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

"میں تم دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ تم دونوں ہی میرے امیدوار ہو۔"

"اس کا انتخاب جس نے تمہیں زیادہ متاثر کیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اسے کوئی زبان دے دی ہو؟"

"اگر آج تم مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہ کرتے تو میں کل اسے زبان دے دیتی۔ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ اب میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں آپس میں مل کر بات کر لو۔ تم دونوں میں سے ایک کو دست بردار تو ہونا ہوگا۔ تم دونوں میرے لیے برابر ہو۔"

"اس نے کب تم سے شادی کی درخواست کی ہے؟"

"آج ہی......" وہ قیامت کے انداز میں مسکرائی۔ "عجیب اتفاق ہے کہ آج صبح ہی اس کا خط ملا۔ آج شام مجھے تم یہاں لے آئے تاکہ اپنے دل کی بات کہہ سکو۔"

سائرہ نے ساتھ والی کرسی پر رکھا ہوا چرمی پرس اٹھا کر اسے کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا، مسکرائی اور بولی۔

"لگتا ہے کہ تم دونوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میری مرضی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے سائرہ کے دوسرے عاشق کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ سائرہ کی محبت کی آگ میں کون کون جل رہا ہے۔ اتنا تو میرے علم میں تھا کہ دفتر کے لڑکوں اور مردوں کے سینوں میں اسے دیکھ کر سرد آہوں کا غبار بھر جاتا ہے۔ اس کے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرے، اس نے لفافے میں سے خط نکالا اور میں نے پڑھنا شروع کیا، اس کا مضمون تھا۔

"ڈیئر سائرہ!

میں آج سے نہیں برسوں سے تمہیں خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس روز سے جس روز تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا مگر میں باوجود کوشش کے خط نہ لکھ سکا۔ دیکھتے دیکھتے تین برس پر لگا کر اڑ گئے، تمہارا ہر روپ میرے دل پر نقش ہوتا گیا اور میں تمہاری چاہت میں دیوانہ ہو گیا۔ جب بھی تمہاری قربت کے لمحے میسر آئے وہ میرے لیے ناقابل فراموش بن گئے۔ تمہارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے میں نے تمہارے ذہن کو پڑھا، خیالات کو جانچا پھر میں نے محسوس کیا کہ قدرت نے تمہیں میرے لیے صرف میرے لیے پیدا کیا ہے۔ تم میری ہو صرف میری ہو، مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک، کوئی تذبذب اور عار نہیں ہے کہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں، ایک ایسی محبت جس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ تم میرا خواب ہو سائرہ! میری محبت ہو، تمہیں ہے تو میری منزل ہو۔

میں نے تین برس تک اس بات کا انتظار کیا کہ شاید تم کسی کو پسند کرتی ہو اور اس سے تمہاری شادی ہونے والی ہو...... اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہاری راہ کا کانٹا نہیں بنوں گا۔ اس لیے کہ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ میں نے یہ دیکھا کہ نہ تو کوئی تمہاری محبت کا دعویدار ہے اور نہ ہی شادی کے لیے امیدوار پھر میرے دل میں تمہیں پانے کی خواہش ہوئی۔ اس لیے کہ ان تین برسوں میں میں نے تم کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھلایا۔ میں نے یک طرفہ اور خاموش محبت کی، تمہاری رسوائی کے ڈر سے میں نے اس محبت کا علم کسی کو بھی ہونے نہیں دیا۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا! اگر ذہن سے چھپانا میرے بس میں ہوتا تو میں یہ راز اپنے ذہن کو بھی نہیں بتاتا۔

سائرہ! میں اب اپنے آپ کو اس مقام پر کھڑا محسوس کر رہا ہوں جہاں سے میری واپسی ناممکن ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا...... تم میرے سوا کسی اور کی ہو جاؤ میرے لیے سوہان روح ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ جملہ میں پھر اس لیے دہرا رہا ہوں کہ میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میں تمہاری محبت کا بھوکا ہوں، مجھے تمہاری محبت کے سوا کسی اور چیز کی تمنا نہیں ہے سائرہ! اگر تم مجھے یہ محبت فراہم کر دو۔ جس کی ایک شوہر کو ضرورت ہوتی ہے تو ہم دونوں ایک ایسی خواب ناک زندگی گزار سکتے ہیں جو اس دنیا میں بہت کم لوگ گزارتے ہوں گے۔ ان تین برس میں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ تم نے مجھے بھی بہت قریب سے دیکھا ہوگا، میری حرکات وسکنات اور باتوں سے میری محبت کا اشارہ ملا ہوگا۔ تمہیں میرے جذبوں کا خود اندازہ ہوا ہوگا۔ میں نے تم سے ہمیشہ پاکیزہ محبت کی۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان داری سے بتاؤ کہ میری دوستی، قربت اور باتوں کے جذبوں سے تمہیں کبھی تصنع یا ہوس کا شبہ ہوا؟ میں نے کبھی کوئی عامیانہ حرکت کی؟

سائرہ! اب تم عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی ہو جو سب سے خوب صورت ہوتا ہے، بالکل اس طرح جس طرح چودھویں کا چاند! یہ چاند کے شباب کی آخری منزل ہوتی ہے، پندرہویں، سولہویں تاریخ سے اس کا شباب، اس کی رعنائی، حشر سامانیاں اور

چمک دمک رخصت ہونے لگتی ہے' ایک عورت کا شباب اور اس کی عمر کا یہ حصہ بھی چودھویں کے چاند کی طرح ہوتا ہے۔ یہ عمر تمہارے شباب کی آخری منزل ہے' اب گزرنے والا ہر لمحہ تمہارا حسن ماند کرتا جائے گا' اب سے میری مراد دو تین سال بعد کی ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں اپنی عمر سے بیس تیس سال زائد عمر کے مرد سے شادی کر لیتی ہیں لیکن مرد ڈھلتے شباب کی کسی عورت سے شادی نہیں کرتا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے سوا کوئی تمہیں بے انتہا پیار نہیں دے سکتا۔

تم نے اس طویل عرصے میں میرے ساتھ دفتر میں کام کرتے ہوئے مجھے اچھی طرح سے پرکھ لیا ہوگا۔ یہ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس عہدے پر فائز ہوں' میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی تمنا ایک عورت کر سکتی ہے' میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے' ہم دونوں حال کی بانہوں میں خوش و خرم رہ سکتے ہیں' زندگی کی تمام لذتوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

مجھے کل تک میرے اس خط کا جواب چاہیے' اگر تم نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا تو میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گا' میں ہر قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گا' بھلے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے' مجھے طوفان سے کیوں نہ لڑنا پڑے' میں تمہیں پانے کے لیے اپنے راستے کی بڑی سے بڑی دیوار بھی گرا سکتا ہوں' یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔

تمہارا صرف تمہارا

اصغر!"

میرے ہاتھ سے خط چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ مجھ پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری تھی۔ اس خط کی ایک ایک سطر نے میرے بدن کا سارا خون جیسے نچوڑ لیا تھا' میرے وجود کو جیسے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ مجھ پر دہشت ناک سکوت مسلط ہونے لگا میں سکتے کی سی حالت میں کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

اگر یہ خط کسی اور کا ہوتا تو میرے لیے اس میں اتنے صدمے اور حیرت کی کوئی بات نہ ہوتی۔ یہ خط کسی اور کا نہیں تھا میرے دوست کا تھا جو مجھے اپنی جان سے بھی کہیں زیادہ عزیز تھا۔ میرے جگری دوست اصغر کا تھا۔ ہم دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کو جتنا چاہتے تھے کسی اور کو نہیں چاہتے تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے' ہم دونوں میں آپس میں اتنی محبت اور چاہت تھی کہ لوگ ہماری دوستی کی مثال دیا کرتے تھے۔ ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ایسی تھی کہ جڑواں بھائیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ سوچ کا انداز' خیالات اور نظریات بھی ایک جیسے ہی تھے۔ ہماری یہ عظیم دوستی آج کی نہیں تھی۔ پورے بیس برس کی تھی۔ ہم دونوں پہلی جماعت ہی سے اسکول میں دوست تھے پھر بچپن سے جوانی' جوانی سے شباب' اسکول سے کالج' کالج سے عملی زندگی میں ساتھ ساتھ ہی قدم رکھا تھا۔ ایک دن ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ کبھی بھی کسی بھی بات پر دلوں میں کوئی میل نہیں آیا تھا۔ ہم آج جس منزل پر تھے وہ اتنی آسانی سے نہیں ملی تھی' اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے' ان کی زندگی میں کتنے نشیب و فراز آئے تھے' ہم دونوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا' ہم دونوں نے ایک دوسرے کی قدم قدم پر مدد کی تھی' دکھ میں' تکلیف میں' کڑے سے کڑے وقت میں ایک دوسرے کے کام آئے تھے۔

ان بیس برسوں میں دوستی کا یہ پیڑ سوکھا نہیں تھا' اس میں محبت کے میٹھے اور رس بھرے پھل لگتے گئے تھے۔ اس کی جڑیں پھیل کر اتنی مضبوط اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ انہیں کوئی کاٹ نہیں سکتا تھا لیکن آج......؟

"تم کیا سوچنے لگے کاشف!" سائرہ نے پوچھا۔

"کون میں!" میں چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آیا۔

"ہاں تم!" وہ ہنسی' میں نے دل میں سوچا کتنی پرکشش ہنسی ہے' اس ہنسی میں کیسی عجیب سی کھنک ہے...... جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔ "ہم دونوں کے سوا اس میز پر ہے کون؟"

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس خط نے تمہیں بڑا متاثر کیا ہوگا؟"

"کیوں نہیں!" وہ سنجیدہ ہونے لگی۔ "میں نے ان تین برسوں میں تم دونوں میں کوئی فرق کبھی محسوس نہیں کیا۔ تم دونوں ایک ہی جیسا لباس پہن کر روز دفتر آتے ہو' ہیئر اسٹائل بھی ایک ہی ہے' کئی چیزوں میں پسند بھی مشترک ہے' خیالات بھی ایک جیسے ہیں لیکن آج دونوں میں پہلی بار میں نے ایک فرق محسوس کیا ہے' تم نے مجھ سے براہ راست مل کر اپنا عندیہ ظاہر کر دیا جب کہ اصغر نے خط کا سہارا لیا' کیا تم دونوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ اس طرح ہم اپنی کوشش کر کے دیکھیں گے؟"

"اصغر نے مجھ سے بھولے سے بھی اس خط کا کوئی ذکر نہیں کیا؟" میں بڑے کرب سے بولا۔

"اگر تم یہ خط نہیں دکھاتیں تو مجھے کبھی پتا بھی نہیں چلتا۔"

"کیا تم نے اصغر کو بتایا تھا کہ تم مجھ سے براہ راست مل کر اس موضوع پر بات کرنے والے ہو؟"

"نہیں......" میں نے سر ہلایا۔

"کیوں......؟" سائرہ کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

"میں اسے تمہاری "ہاں" سنا کر سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" میں مردہ لہجے میں بولا۔

"اصغر نے مجھے خط لکھ کر تمہیں سرپرائز دے دیا کیوں؟"

میں نے رات کا کھانا اصغر کے ہاں جا کر نہیں کھایا بلکہ سائرہ کے ساتھ ہی کھا لیا تھا۔ میں رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد اسے آئس کریم کھلانے اور سیر و تفریح کی غرض سے کلفٹن کے علاقے میں لے گیا' میں نے آئس کریم کھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم میرے حق میں فیصلہ کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "میں اس میں کوئی بے ایمانی کرنا نہیں چاہتی۔"

"تم اصغر کو مجھ پر اس لیے ترجیح دے رہی ہو کہ وہ عہدے میں مجھ سے بڑا ہے' اس کی مالی حالت بھی مجھ سے کچھ بہتر ہے اور اس کی رنگت بہت زیادہ سرخ و سپید ہے۔" میں دل گرفتہ ہو گیا۔

"یہ تمہارا وہم ہے کاشف!" سائرہ میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ "اگر اصغر تمہارے حق میں دست بردار ہو گیا تو میں خوشی خوشی تمہاری بات مان لوں گی۔ ساری عمر تمہارے ساتھ ایک خوش گوار زندگی گزاروں گی۔ اصغر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔ بھولے سے بھی دل میں اس کا خیال نہیں آئے گا۔ بالکل ایسا ہی اس کے ساتھ ہوگا اگر تم اصغر کے حق میں دست بردار ہو گئے۔"

میں نے سائرہ کو منع کر دیا تھا کہ اصغر سے میری

پیش کش کا تذکرہ بالکل نہ کیا جائے۔ وہ اصغر کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے تین دن تک ٹالتی رہے۔ میں تیسرے دن اصغر سے مل کر خود بات کروں گا۔ اس موضوع کو چھیڑوں گا' اس کے بعد کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے اس وقت دیکھا جائے گا۔

میں رات گھر پہنچا تو سخت ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔ آج کا دن میری زندگی کا بدترین دن ثابت ہوا تھا۔ میں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اصغر کو سائرہ سے محبت ہو سکتی ہے۔ اصغر بھی اس سے تین سال سے محبت کر رہا ہے یک طرفہ محبت' خاموش محبت' اندر ہی اندر اسے چاہتا چلا آ رہا ہے' اصغر نے کبھی مجھ پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ وہ سائرہ کو پسند کرتا ہے' اس سے محبت کرتا ہے' اصغر نے مجھے اپنے اعتماد میں نہیں لیا' جب کہ وہ میرا دوست ہے۔ سچا' مخلص اور جان سے عزیز دوست' اس دنیا میں ایک ہی تو میرا دوست تھا۔ وہ مجھے اپنی محبت کے بارے میں بتا تو سکتا تھا اس نے کس لیے نہیں بتایا؟

پھر میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے بھی تو اصغر کے ساتھ اس معاملے میں ایسا ہی کیا جیسا اصغر نے کیا تھا۔ میں بھی تو تین سال سے سائرہ سے محبت کر رہا ہوں' یک طرفہ محبت' خاموش محبت اندر ہی اندر اس کی پرستش کرتا آ رہا ہوں' میں نے بھولے سے بھی اصغر پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس سے محبت کرتا ہوں' میں نے اصغر کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا' جب کہ وہ میرا دوست ہے' سچا مخلص اور جان سے عزیز دوست اس دنیا میں اصغر ایک ہی تو میرا دوست تھا۔ وہ مجھے اپنی محبت کے بارے میں بتا سکتا تھا' اس نے کس لیے نہیں بتایا؟

میں نے ان بیس برس میں پہلی بار یہ بات محسوس کی کہ دلوں میں میل آ گیا ہے۔ صاف وشفاف آئینے میں بال آ گیا ہے۔ آج سائرہ کی محبت ہماری دوستی اور محبت کے پیڑ کی جڑیں کاٹنے پر جیسے تُل گئی ہو۔ بڑے سے بڑا طوفان' آندھی بھی محبت کے اس چراغ کو بجھا نہ سکے تھے جو ہم دونوں نے روشن کیا تھا لیکن آج ایک عورت کی وجہ سے اس کی لو ٹمٹمانے لگی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اس بات کا بڑا دکھ اور بے انتہا صدمہ ہو رہا تھا کہ اصغر نے مجھے اعتماد میں نہیں لیا۔ سائرہ سے محبت کے بارے میں نہیں بتایا۔ دنیا والے سچ کہتے تھے کہ ہماری سوچ کا انداز ایک جیسا ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کے معاملے میں ایک جیسی راز داری برتی تھی۔

میں دوسرے دن دفتر گیا تو لفٹ میں میری ملاقات اصغر سے ہو گئی۔ میں پہلی بار اصغر سے بڑی سردمہری سے پیش آیا تھا۔ اصغر نے محسوس نہیں کیا تھا شاید اس لیے بھی کہ لفٹ بھری ہوئی تھی۔ دفتر میں جب بھی میری نظر اصغر پر پڑی میرا دل چاہا تھا کہ میں دفتر سے چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں یا پھر اس کے کمرے میں جا کر اصغر سے کہوں کہ وہ میرے حق میں دست بردار ہو جائے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کرنے کی بجائے سائرہ اور اصغر کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ سائرہ معمول کے مطابق میرے کمرے میں آئی۔ اس نے دل نواز انداز میں باتیں بھی کیں اور دل فریب انداز میں مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اور باتوں کا یہ انداز دیکھ کر میں نے دہشت ناک خواب دیکھے۔ اصغر کے خلاف دل میں نفرت محسوس کی۔ میں نے آج سائرہ پر کچھ زیادہ ہی توجہ دی تھی۔ میں نے اپنی عادت کے خلاف اس کے حسن کی بھی تعریف کی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب تقریباً روز سائرہ سے اپنی محبت کی تجدید کرتا رہوں گا۔ سائرہ کے لیے اس میں بُرا منانے کی کوئی بات نہیں تھی اس لیے کہ اس نے کانونٹ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لندن میں چھ سال رہ کر آئی تھی اور پھر اس کے گھر کا ماحول مغربی تہذیب کا نمونہ تھا۔ اس کے گھر والوں پر انگریزوں کا دھوکا ہوتا تھا۔

میرے دل کے کسی کونے میں ایک بار یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ میں اصغر کے حق میں سائرہ سے دست بردار ہو جاؤں' آخر اصغر میرا بچپن کا دوست ہے۔ اصغر کے لیے بہت کچھ کیا تھا کیا ایک دوست کی خاطر' مثالی دوستی کے لیے میں سائرہ کی قربانی نہیں دے سکتا؟

لیکن جب سائرہ میرے کمرے میں آ کر میری نظروں کے سامنے بیٹھی تو یہ خیال یہ جذبہ کسی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ وہ کسی پُرانی شراب کی مانند تھی جس کا خمار ذہن سے نہیں اترتا ہے۔ اس کی صراحی دار گردن اور بانہوں سے لہو یوں چھلک رہا تھا' جیسے بدیسی شراب کی بوتل سے شراب کا رنگ چھلکتا ہے۔ اس کا وحشی حسن بڑا خطرناک تھا' مجھے روز ہی ایسا محسوس ہوتا جیسے آج سائرہ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں میں نے اپنی زندگی میں کبھی آتش فشاں نہیں دیکھا تھا' اس پر کسی آتش فشاں کا ہی گمان ہوتا تھا۔

میں اب سائرہ کا بھکاری تھا' مجھے سائرہ چاہیے تھی' اس کی قربت کی ضرورت تھی' اس کی محبت کی ضرورت تھی' آخر میں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا کہ میں سائرہ کے موضوع پر اصغر سے کھل کر بات کروں گا۔ سائرہ کو ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا اگر اصغر میرے راستے سے نہیں ہٹا تو میں اصغر کو موت کی نیند سلا دوں گا۔

ہم دونوں چوتھے روز سائرہ کے بارے میں فیصلہ کرنے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تو ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہم دوست نہیں دشمن ہیں' دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے جذبات بھرے تھے۔ محبت کی چٹان میں دراڑیں پڑ گئی تھیں' ہم آج سائرہ کے بارے میں فیصلہ کر کے اٹھنا چاہتے تھے' ایک عورت نے جو کسی بلا سے کم نہیں تھی ہمارے درمیان نفرت کی خلیج حائل کر دی تھی۔ دوستی' محبت اور جذبے سب راستے میں پڑے رہ گئے تھے میں نے اصغر سے پوچھا۔

"تم سائرہ سے دست بردار ہونے کی کیا قیمت چاہتے ہو؟ دو لاکھ' تین لاکھ روپے......؟"

"تم مجھ سے تین لاکھ روپے لے لو اور راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"محبت بیچی نہیں جاتی ہے۔"

"خریدی بھی نہیں جاتی ہے۔"

"سائرہ کا حصول میری سب سے بڑی تمنا بن چکی ہے۔" میں اعتماد سے بولا۔

"سائرہ میرے دل کی دھڑکن ہے۔ میرا خواب ہے' میں اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا اصغر!" میرا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

"تم مجھے سائرہ کو اپنانے سے روک نہیں سکتے ہو۔" اصغر تڑختے لہجے میں بولا۔

"تم اپنی آرزو پوری کر کے دیکھ لو۔"

"یہی تمہاری دوستی کا دعویٰ تھا کہ میں اپنے دوست کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں' آج کہاں ہے تمہارا دعویٰ! تم اپنے دوست کی خاطر ایک عورت کو قربان نہیں کر سکتے؟"

ہم دونوں بڑی دیر تک آپس میں الجھتے اور بحث وتکرار کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکے تھے البتہ بدمزگی بڑھتی گئی تھی۔ تلخی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ جو فیصلہ میں کرتا تھا اسے اصغر نامنظور کردیتا تو اور اصغر چاہتا تھا وہ مجھے کسی صورت میں قبول نہیں ہوتا تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی سائرہ کی محبت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی سائرہ کے لیے بڑے جذباتی ہورہے تھے ایک عجیب سی کشمکش ہونے لگی تھی۔ کوئی بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بہت دیر بعد میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں بولا۔

"نہ تم سائرہ سے دست بردار ہونا چاہتے ہو نا میں اگر سائرہ میری ہوگئی تو تمہاری زندگی بھی حرام ہوجائے گی۔ سائرہ کو پانے کے لیے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک زندہ رہے تم یا میں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں رہا۔"

"کیا تم یہ چاہتے ہو ہم میں سے ایک خودکشی کرلے؟"

"نہیں! میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کامیابی کے لیے ڈوئیل لڑیں انگریزوں اور مغرب والوں میں ڈوئیل لڑنے کا طریقہ رائج ہے کیوں نا ہم اس پر عمل کریں۔"

"ڈوئیل تو لڑ سکتے ہیں۔" اصغر نے میری تائید کی۔ "لیکن اس میں ایک قباحت ہے؟"

"وہ کیا......؟"

"جو زندہ رہے گا وہ قتل کے الزام میں دھرلیا جائے گا اس کے قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کی صورت میں وہ سائرہ سے محروم ہوجائے گا اس لیے کہ اسے قتل کرنے کے الزام میں پھانسی ہوجائے گی۔"

"میرے ذہن میں ایک تدبیر آرہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم دونوں ایک خط لکھ کر اپنی اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں اس خط کا مضمون یہ ہوگا کہ میں محبت کی ناکامی پر خودکشی کررہا ہوں اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوں لہٰذا کسی کو موردالزام نہ ٹھہرایا جائے۔"

"ہاں! یہ زیادہ مناسب رہے گا۔" اصغر نے اس سے اتفاق کیا۔

☆......☆......☆

پھر تیسرے دن ہم دونوں مسلح ہوکر پہاڑیوں پر پہنچے۔ وہ خط بھی لکھ لائے تھے مجھے وہ دن یاد آیا جب ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا اس دن سے لے کر آج تک جو دن مہینے اور سال گزرے تھے اس میں پورے دور کی کہانی تھی۔ سب کچھ کسی سپنے کی طرح تھے اصغر نے ایک بار مجھے خون دیا تھا جب میں پھل توڑتے ہوئے درخت سے گرا تھا درخت سے گر کے زخمی ہونے سے میرا بہت سارا خون نکل گیا تھا۔ میری جان بچانے کے لیے خون کی ضرورت پڑگئی تھی اصغر کی عمر اتنی تھی کہ اس کا خون نہیں لیا جاسکتا پھر بھی اصغر نے مجھے خون دیا۔ اپنی زندگی کی پروا نہیں کی عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد میری بہن کی شادی کے لیے اصغر نے اپنا گاؤں کا مکان بیچ دیا تھا۔ یہی نہیں اصغر نے میرے گھر والوں کو قدم قدم پر سہارا بھی دیا تھا۔ ان دنوں میرے مالی حالات اچھے نہیں تھے اگر اصغر سہارا نہیں دیتا تو میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تھا اور پھر ایسا ہوا تھا کہ ایک بار اصغر کے والد کو کاروبار میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا ان کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا۔

قرض خواہوں نے اصغر کے والد کو تنگ کرنا شروع کردیا تھا۔ اصغر کے والد پر دل کا دورہ پڑا۔ میں نے اپنے باپ دادا کی نشانی جو ایک مکان کی صورت میں تھی نا صرف وہ بیچ دیا تھا بلکہ اپنی مرحوم ماں کے وہ زیورات بھی بیچ دیے تھے جو اُن کے سہاگ کی نشانی تھے اپنی بہو کے لیے رکھ چھوڑے تھے ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے بڑا ایثار کیا تھا۔ قربانیاں دی تھیں دوستی اور محبت کے جذبے کو پروان چڑھایا تھا لیکن آج ایک ایسی عورت کو پانے کے اندھے جنون میں مبتلا ہوکر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہورہے تھے ہمیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ہماری نظروں میں سائرہ کا حسین چہرہ پُرشکوہ سراپا اور غیر معمولی حشر سامانیاں گھوم رہی تھیں اس کا حصول ہمارے لیے انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔

ہم دونوں نے ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ بغل گیر ہوئے اور بوسے لیے پھر پشت سے پشت ملا کر کھڑے ہوگئے پھر ایک دو تین کہہ کر قدم گنتے ہوئے مخالف سمت بڑھنے لگے۔ بیس قدم طے کرنے تھے اور پھر فوراً ہی پلٹ کر نشانے کی زد میں لے کر فائر کرنا تھا۔ تیزی پھرتی دکھانے والا ہی فاتح بن سکتا تھا۔ میں نے بیس قدم کا فاصلہ بڑی تیزی سے طے کیا اور بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اصغر مجھ سے پہلے پلٹ چکا ہے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے نشانے کی زد میں لے لیا تھا ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خونخوار درندوں کی طرح دیکھا پھر ہماری انگلیوں نے بغیر کسی تاخیر کے لبلبی پر دباؤ ڈالا ایک دو تین چار پانچ چھ فائر ہوئے ہمارے ریوالور سے نہ تو کوئی شعلہ نکلا نہ کوئی زوردار آواز آئی نہ کوئی دھماکا ہوا نہ ہی ایک گولی نکلی...... صرف ایک ہلکی اور بے حد مدھم سی کلک کی آوازوں نے گونج کر دم توڑ دیا تھا۔

ہم دونوں تحیر زدہ کھڑے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ میں یہ سوچ کر اپنا ریوالور خالی کرآیا تھا کہ میں مرکر اصغر کے لیے راستہ صاف کردوں گا۔ میں دوست کے لیے ایثار وقربانی سے کام لینا چاہتا تھا۔ اصغر نے مجھے سبقت لے جانے نہیں دی تھی اصغر نے وہی سوچا تھا وہی کیا تھا جو میں نے سوچا تھا اور کیا تھا۔

ہم دونوں آگے بڑھ کر پہلے سے کہیں زیادہ گرم جوشی سے لپٹ گئے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد اصغر نے مجھ سے کہا۔

"تم نے اس سنہرے موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ میں نے تمہیں سائرہ کو پانے کے لیے کیسا شاندار موقع فراہم کیا تھا؟ تم نے مجھے چھوڑ دیا تم نے کس لیے ایسا کیا......؟"

"یہی سوال میں تم سے بھی تو کرسکتا ہوں؟" میں مسکرایا۔

"میرا جواب یہ ہے کہ میں نے سوچا کہ دنیا میں سائرہ جیسی حسین لڑکیاں تو بہت مل جائیں گی لیکن ایک اچھا دوست نہیں ملے گا۔" اصغر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"میرا بھی یہی جواب ہے۔" میں نے کہا۔

"بخدا میں نے بھی یہی کچھ سوچا تھا۔"

"تو ہم دونوں سائرہ سے دست بردار ہوتے ہیں۔" اصغر نے ہنستے ہوئے مجھ کو گلے لگالیا۔

علاج

محترم عمران بھائی'
السّلام علیکم و رحمتہ اللہ!
زیر نظر کہانی ایسے ایک راہ سے بھٹکے ہوئے شخص کی کہانی ہے کہ جب وہ اپنے گناہوں کے سبب ندامت کے گڑھے میں گرا تو اللہ تعالیٰ نے اسے راہ ہدایت دکھا دی اور پھر اس پر اپنا کرم کردیا۔ اس کہانی میں ایسے بہت سے لوگوں کے لیے سبق پوشیدہ ہے جو اللہ کی رحمت کو بھول کر تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ امید ہے میری گزشتہ کہانیوں کی طرح قارئین کو یہ کہانی پسند آئے گی۔ آپ سب کی آراء کی منتظر

شہنی ارشاد
کراچی

حدیث:۔
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔
اور مسلمانوں کا سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو۔ (ابن ماجہ)
حضرت ابو ہریرہ سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے قلب کی قساوت اور سختی کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔
یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر اور مسکینوں کو کھانا کھلا۔ (مشکوٰۃ)

❁ ...... ◉ ...... ❁

اس کا نام حبیب احسن تھا۔ کبھی وہ بھی ایک صحت مند اور رعب ودبدبے والا انسان تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ بہت سے ملازم تھے جو ہمیشہ اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے لیکن آج وہ بیماری اور بے کسی کی حالت میں بستر پر پڑا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسا عمل کیا کہ اس کے حالات بدل گئے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہوگئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس سے ایسی کون سی خطا ہوگئی کہ وہ بدترین حالات کا شکار ہوگیا اور پھر اس نے ایسا کیا علاج کیا کہ وہ پہلے سے بھی بہترین حالت میں واپس آ گیا۔
آیئے حبیب احسن کی روداد خود اس کی زبانی سنتے ہیں۔
میں ایک بزنس مین تھا گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا میری اپنی کئی گارمنٹس فیکٹریاں تھیں۔ میں اپنا مال ملک سے باہر بھیجا کرتا تھا۔
میرا یہ کاروبار خود میری اپنی محنت کا نہیں تھا بلکہ ساری محنت میرے مرحوم والد صاحب کی تھی میں چونکہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے تعلیم مکمل ہوجانے کے بعد والد صاحب نے یہ کہہ کر اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کردیا کہ میں اب بہت تھک گیا ہوں اب تم کاروبار سنبھالو۔
میں نے ہنسی خوشی والد صاحب کا کاروبار سنبھال

لیا۔ میری امی کو میرے برسر روزگار ہوجانے کے بعد ایک عدد چاند سی بہو کی یاد ستانے لگی اور بہت تلاش کے بعد انہیں اپنی کلاس سے نیچے کی ایک مڈل کلاس کی لڑکی پسند آ گئی۔
میری لائف میں کوئی لڑکی تھی ہی نہیں۔ اس لیے مجھے اپنی امی کی پسند پر اعتراض نہیں ہوا اور میں نے تصویر دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کردیا۔
روحی میری زندگی میں بہار کا ایک خوش گوار جھونکا ثابت ہوئی نہ صرف اس کے آنے سے مجھے دنیا کی ہر خوشی مل گئی بلکہ اس کا نصیب میرے نصیب کے ساتھ جڑتے ہی میرا کاروبار مزید ترقی کرتا چلا گیا۔
میری شادی کو آٹھ سال بخیر وخوبی گزر گئے۔ جہاں میرے گلشن میں تین عدد پھولوں کا اضافہ ہوا وہیں میرے چھپر چھاؤں میرے والدین کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔
اللہ تعالیٰ نے مجھے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ میں سوچتا کہ یہ کاروبار میرے والد نے میرے حوالے کیا تھا تو میں نے اپنی دن رات کی محنت سے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اب میرا یہ کاروبار میرے تینوں بیٹے سنبھالیں گے اور پھر ہر جانب میرا ہی نام ہوگا۔ اس ملک کے بڑے بڑے بزنس مینوں میں میرا نام بھی لیا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی دن رات کی ترقی پر اللہ کا شکر گزار ہوتا میرے اندر تکبر آ گیا اور میں سوچتا یہ سب میری ہی محنت کا ثمر ہے۔
جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ میرا سسرال مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ روحی کا صرف ایک بھائی تھا۔ وہ بھی ایک دفتر میں معمولی کلرک تھا اور روحی مجھ سے چھپ چھپ کر اپنے بھائی اور اس کے بچوں کی مالی مدد کیا کرتی تھی۔
ایک دن روحی کے بھائی اور بھابی میرے گھر آئے میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا تھا کہ میں اتنے چھوٹے لوگوں کو منہ لگاتا۔ اس لیے گھر سے جانے لگا تو روحی نے مجھ سے التجا کرتے ہوئے کہا۔
''حبیب بری بات ہے اقبال بھائی کون سا روز روز گھر آتے ہیں۔ آج آئے ہیں تو آپ تھوڑی دیر تو ان کے پاس بیٹھ جائیں اگر آپ ان سے نہیں ملیں گے تو انہیں بہت برا لگے گا۔''
''تم ہو نا تم بیٹھو اپنے بھائی بھاوج کے پاس۔ انہیں اچھے کھانے کھلاؤ اور کچھ بچوں کے اور اپنے اور میرے پرانے کپڑے دے کر رخصت کردینا بے چارے خوش ہوجائیں گے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''کیسی باتیں کررہے ہیں آپ......!'' روحی نے روہانسی ہوکر کہا۔ ''وہ کیوں ہماری اترن پہننے لگے۔''
''اترن ہی سہی' لیکن وہ لوگ تو خواب میں بھی ایسے کپڑے پہننے کا سوچ نہیں سکتے۔'' میں نے روحی کی بات پر ناگوار لہجے میں کہا۔
''اچھا پلیز تھوڑی دیر کے لیے......! پلیز میری خاطر آپ اقبال بھائی سے مل لیں۔ آپ اگر گھر پر نہ ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن آپ گھر پر ہونے کے باوجود اگر ان سے نہیں ملیں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ آپ ان کی غربت کی وجہ سے انہیں ملنے کے قابل ہی نہیں سمجھتے۔'' روحی نے میری خوشامد کرتے ہوئے کہا۔
''حقیقت میں بات بھی یہی ہے۔'' میں نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن چلو تمہاری خاطر میں ان سے مل لیتا ہوں' لیکن تم مجھے زیادہ دیر بیٹھنے کے لیے فورس مت کرنا میں صرف پانچ منٹ بیٹھوں گا۔''

”تھینک یو حبیب۔ آپ نے میرا مان رکھ لیا۔“ روحی نے تشکرانہ انداز میں کہا اور کمرے سے باہر جاتے جاتے بولی۔

”ضرور آجایئے گا۔“

روحی کے بے حد اصرار پر میں بادل ناخواستہ اٹھ کر اقبال سے ملنے کے لیے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ لیکن جانے سے پہلے میں نے غیر ملکی برانڈ کا مہنگا پرفیوم اپنے اوپر انڈیل لیا۔

ڈرائنگ روم میں اقبال اپنے دونوں بچوں اور بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا میرے ڈرائنگ روم کا قیمتی اور اعلیٰ فرنیچر، ڈیکوریشن پیس اور قیمتی قالین کے رعب سے وہ دبے دبے اور خاموش بیٹھے تھے۔ اقبال اور اس کے بیوی بچے معمولی کپڑوں میں ملبوس تھے اور افلاس ان کے چہروں سے ٹپک رہا تھا۔

میں بڑی شان سے چلتا ہوا اقبال سے قدرے دور ایک دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اقبال نے اٹھ کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملانے کے لیے آیا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کو کہا تو شرمندہ شرمندہ سا واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”بہت مصروف رہتے ہیں آپ حبیب بھائی، اللہ کے فضل و کرم سے ماشاء اللہ آپ کا کاروبار خوب ترقی کر رہا ہے۔“ اقبال نے بات شروع کی۔

”اللہ کے فضل و کرم سے......!“ میں نے طنز اور اچنبھے سے کہا۔ ”میاں میری دن رات کی محنت کچھ بھی نہیں۔ یہ سب میری محنت اور اس کا پھل ہے۔ تم لوگوں کا کیا ہے صبح سے شام فائلوں میں سر کھپاتے ہو اور مہینے کے آخر میں چند ہزار لے کر گھر آجاتے ہو اور عیش کرتے ہو، مجھے دیکھو...... نہ دن کا ہوش ہے نہ رات کا سکون جب ہی یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔“

”بے شک بے شک آپ دن رات محنت کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کا فضل تو بہر حال ہے آپ پر۔“ اقبال نے جلدی سے کہا۔

”پھر وہی اللہ کا فضل میاں تم اتنی محنت کرو تو پوچھوں کہ اتنی جان مارنے کے بعد تم کیسے کہو گے کہ یہ سب اللہ کے فضل سے ہے۔“ میں نے کہا اور چڑ کر کھڑا ہو گیا اور یہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل آیا کہ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔

میں دن و رات اپنے حال میں مست تھا کامیابی کا نشہ میرے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ میری بیوی روحی ایک نیک دل اور خدا ترس عورت تھی اگر وہ کسی غریب کی مدد کرنے کے لیے مجھ سے کچھ رقم طلب کرتی تھی تو مجھے بہت ناگوار لگتا اور میں غصے سے کہتا۔

”کیا میں دن رات ان لوگوں کے لیے محنت کرتا ہوں کچھ میرا خیال کرو اور میری محنت کی کمائی کو اس طرح مت لٹاؤ۔“

”لیکن حبیب اللہ نے ہمارے مال میں ان غریبوں کا بھی حق رکھا ہے زکوٰۃ کی صورت میں، صدقہ و خیرات کی صورت میں، ہمیں اللہ نے پابند کیا ہے اس بات کا ورنہ ہمارا مال پاک کیسے ہوگا۔“ وہ بے چارگی سے کہتی۔

”خوامخواہ حصہ رکھا ہے، محنت میں کروں اور مزے اڑائیں یہ فقیر، ہڈ حرام کہیں کے۔“ میں روحی کو بری طرح جھڑک دیتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے منع کرنے کے باوجود بھی روحی ان غریبوں کو کچھ دیتی تھی یا پھر میرے خوف سے خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔ ویسے میں اسے نمازیں پڑھتے ہوئے تو دیکھتا ہی رہتا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میری دولت میں اضافہ مسلسل جاری تھا۔ پھر میں نے بینک سے رقم نکلوا کر کچھ پراپرٹی خرید لی۔ ایک بنگلے میں تو میں رہتا تھا ایک دو بنگلے اور مکانات خرید کر انہیں کرائے پر چڑھا دیا کچھ دکانیں خرید لیں۔

اب میرے پاس مزید اضافی آمدنی ہونے لگی۔ کرائے کی مد میں اچھی خاصی رقم میرے ہاتھ آنے لگی۔ میرے بچے جوان ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں بہترین اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلوائی۔ میرا سب سے بڑا بیٹا میرے بے جا لاڈ پیار سے بہت بگڑ گیا تھا۔ وہ مجھ سے جتنے پیسے مانگتا وہ میں اسے بخوشی دے دیتا اور یہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا کہ وہ اتنی بھاری رقم کس لیے لے رہا ہے۔

یہ بات تو بہت بعد میں کھلی کہ وہ جوئے، شراب اور غلط قسم کی عورتوں کی لت میں پڑ گیا ہے۔

انہی دنوں روحی کے بھائی اقبال کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مجھے علم ہوا کہ وہ کینسر کا مریض تھا اور رقم پاس نہ ہونے کے سبب وہ ایک سرکاری ہسپتال میں کسمپرسی کی حالت میں مر گیا۔

اس کے پانچ بچے تھے اور بچے بھی لڑکیاں۔ پانچواں اور آخری بچہ لڑکا تھا جو ابھی صرف تین سال کا تھا۔ کرائے کے مکان میں وہ لوگ رہتے تھے کمانے والا ہی نہ رہا تو گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔

روحی چند دن بھائی کے گھر رہ کر واپس آئی تو اس کے ہمراہ اقبال کے پانچوں بچے اور بیوہ تھی۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور روحی سے سوال کیا۔

”یہ سب کے سب یہاں کس لیے آئے ہیں اپنے گھر کیوں نہیں جا رہے؟“ میرے سوال پر روحی اٹھنے لگی اور بولی۔

”اقبال کی بیماری ہی ایسی تھی کہ ان کے گھر کی ہر چیز بک گئی مکان بھی کرائے کا تھا جب کھانے کے لیے کچھ نہیں تو گھر کا کرایہ کہاں سے دیں گے اوپر سے چار جوان ہوتی لڑکیاں ہیں۔ اللہ نہ کرے کسی کی بری نگاہ میرے مرحوم بھائی کی عزت کی جانب اٹھے۔ میں یہ سوچ کر انہیں اپنے ساتھ یہاں لے آئی ہوں کہ یہ لوگ یہاں رہ لیں گے۔ ہمارا اتنا بڑا بنگلہ ہے کئی کمرے خالی پڑے ہیں انہیں صرف دو کمرے ہی تو چاہئیں۔ اتنا کھانا ہمارا روز بچتا ہے چند لقمے یہ بھی کھا لیں گے تو ہمارے ہاں کیا کمی آجائے گی۔“

”اور اتنا بڑا فیصلہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کر لیا۔ چھ افراد کے کھانے اور دوسری ضروریات کا تمہیں اندازہ ہے کہ کتنا خرچ آتا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”حبیب یہ یتیم اور بیوہ ہیں ہمارے گھر کے علاوہ ان کا کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ یہ کہاں جائیں گے۔“ روحی نے میرے آگے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”فرزانہ (اقبال کی بیوہ) اپنے میکے اپنے بھائی کے گھر کیوں نہیں گئی۔ وہاں چلی جائے یہ میری ذمہ داری تو نہیں۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”فرزانہ کا بھائی خود غریب آدمی ہے۔ اس کے آٹھ بچے ہیں بوڑھی اور بیمار ماں ہے وہ اس مہنگائی کے دور میں اپنے بچوں کو دو وقت کے بجائے ایک وقت کی روٹی کھلا رہا ہے۔ ان چھ جانوں کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے گھر تو اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ہم یہ بار اٹھا سکتے ہیں اور ویسے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

”میں اور یتیم کے سرپرست نیز دوسرے محتاجوں کے سرپرست ہم دونوں جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچ کی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا

اوران دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔" (بخاری سعل بن سعدؓ)

روحی کے منہ سے حدیث سن کر میں کچھ کہہ ہی نہ سکا اور منہ بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ البتہ میں نے اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ روحی سے چند دنوں کے لیے بات چیت بند کر دی۔

میں اقبال کے بچوں کو اپنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھتا تو مجھے غصہ آتا کہ وہ کس لیے میرے گھر آ کر عیش کر رہے ہیں۔ فرزانہ اور اس کی بیٹیاں کبھی ٹی وی دیکھتی نظر آتیں تو کبھی آپس میں ہنسی مذاق کرتیں اور میں جل بھن کر رہ جاتا۔

اس روز میں فیکٹری سے گھر آیا تو بہت خوش تھا میرا وہیں کا ایک ٹینڈر پاس ہو گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کنٹریکٹ تھا۔ میری کاروباری لائف میں اس سے بڑا کنٹریکٹ مجھے ابھی تک نہیں ملا تھا۔

میں خوشی خوشی یہ سوچ کر گھر آیا کہ اپنی اس خوشی کو روحی کے ساتھ بھرپور طریقے سے مناؤں گا اور اسے ساتھ لے کر باہر کھانا کھانے جاؤں گا۔ کتنے ہی دن ہو گئے ہمیں، ہم ساتھ نہیں بیٹھے اور باہر کھانا نہیں کھایا۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میری جانب پیٹھ کیے روحی گلدان میں تازہ پھول لگا رہی۔ میں دبے قدموں چلتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ ڈرائنگ روم میں اور کوئی نہیں تھا میں نے چپکے سے جا کر اسے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔

میرے اس اچانک حملے سے وہ بری طرح گھبرا گئی اور اس کے ہاتھ سے پھول اور گلدان نیچے گر پڑے۔

"چھوڑو مجھے، کون ہے؟" وہ بری طرح میری بانہوں میں کسمسائی اور خود کو میری گرفت سے چھڑا کے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا تو مجھے اسے دیکھ کر ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ روحی نہیں فرزانہ تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا اور وہ ہولے ہولے کانپنے لگی۔

میں نے آج پہلی مرتبہ فرزانہ کا یہ روپ دیکھا تھا۔ وہ پانچ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود آج بھی جوان اور حسین تھی اور شرم کی لالی نے اس کے چہرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔

"آ...... آئی ایم سوری...... میں سمجھا کہ روحی ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں غلطی آپ کی بھی نہیں ہے دراصل میں نے روحی آپی کا سوٹ جو پہن رکھا ہے۔" ان نے کہا اور جھک کر ٹوٹے ہوئے گلدان کے ٹکڑے اٹھانے لگی۔

وہ جھکی تو اس کی پتلی کمر سے ناگن سی بل کھاتی سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی پھسل کر سامنے لہرانے لگی۔

میرے شیطانی دماغ میں فرزانہ کا حسین سراپا گھوم رہا تھا۔ بے شک غربت نے اس کے چہرے کے حسن کو کملا ضرور دیا تھا لیکن آج اگر اسے اچھی خوراک اور بہتر ماحول ملے تو وہ حسن و جوانی میں بہت سی نوجوان لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ جائے...... میں چپ چاپ کھڑا اسے گھور رہا تھا اور مجھے اپنے ہاتھوں میں اس کے جسم کا گداز بار بار محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ روحی تو اب بڑھاپے کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ میں کبھی اس سے الفت کا اظہار کرتا تو وہ بے زار کن لہجے میں کہتی۔

"چھوڑیں بھی بچے جوان ہو گئے ہیں۔ اب یہ جوانی کے چونچلے بھول جائیں۔" میں اسے سمجھاتا کہ "مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔"

میں ابھی تک اس کے حسین سراپا کے سحر میں گم کھڑا اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ گلدان کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے چن کر سیدھی ہوئی اور مجھے کھڑے ہوئے دیکھ کر ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

"میں معافی چاہتی ہوں کہ آپ کا اتنا قیمتی گلدان میرے ہاتھ سے ٹوٹ گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے ہوش میں آ کر کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں دیکھا کہ روحی بستر پر دراز ہے اور چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں۔

"کیا ہوا روحی، کیسے لیٹی ہو خیریت تو ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بی پی بہت ہائی ہو رہا ہے سر میں اور کنپٹیوں میں شدید درد ہے۔" اس نے نقاہت سے کہا۔

"تم نے کوئی دوا لی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں ابھی فرزانہ مجھے دوا کھلا کر گئی تو ہے۔" اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی اپنا سارا جوش و خروش بھول گیا کہ کیا سوچ کر گھر آیا تھا اور یہاں کیا صورت حال پیش آ گئی۔ روحی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھی اور ایسا عموماً ہوتا رہتا تھا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ اب تو فرزانہ گھر پر ہے۔ وہ دیکھ بھال کر لیا کرے گی اور اس کی بچیاں بھی سارا دن فارغ بیٹھی رہتی ہیں ان سے کہا کرو کہ گھر کے کام کاج کیا کریں۔ ہم خوامخواہ نوکروں کو اتنی بھاری تنخواہ دیتے ہیں کم از کم ان کی تنخواہیں بچیں گی۔ تو ان لوگوں کا وجود اتنا ناگوار نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"فرزانہ بے چاری تو کام کرتی ہے کچن کی زیادہ تر ذمہ داری وہی اٹھاتی ہے۔" روحی نے بمشکل آنکھیں کھول کر کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم جھاڑو پونچھا کرنے والی مائی کو بھی فارغ کر دو، یہ ماں بیٹیاں سب سنبھال لیں گی۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" روحی نے آہستہ سے کہا اور کروٹ لے لی مبادا میں کوئی اور بات نہ کہہ دوں۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے کھانے کے ارادے سے باہر آ گیا۔ باہر آیا تو فرزانہ کی سب سے بڑی بیٹی شبانہ کو روتے ہوئے دیکھا فرزانہ اس کے پاس کھڑی اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔

"کیا بات ہے رو کیوں رہی ہو؟" میں نے خلاف توقع نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... انکل...... وہ شکیب بھائی۔"

"کچھ نہیں یہ تو سب ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتی ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے شبانہ کی بات کاٹی اور اسے لے کر وہاں سے جانے لگی۔

"فرزانہ۔" میں نے اسے آواز دی۔

"جی۔" وہ واپس پلٹی۔

"کھانا تیار ہے تو لگا دو۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹیبل پر چلیں ابھی لگاتی ہوں۔" اس نے کہا اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

شبانہ کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ گویا فرزانہ کی شادی کو صرف پندرہ سال ہی ہوئے ہیں اس لحاظ سے تو فرزانہ کی عمر چونتیس پینتیس سال ہی ہوگی۔ جب ہی تو اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی ہے۔

نہ جانے کیوں فرزانہ کو لے کر میرے خیالات بدلنے لگے۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ گھر کے سارے نوکروں کی چھٹی ہو گئی ہے۔ فرزانہ اور اس کی بچیاں ہی گھر کے مختلف کاموں میں لگی رہتی تھیں۔

مجھ سے روحی نے کئی مرتبہ کہا کہ لڑکیوں کو اسکول میں داخل کروا دیتے ہیں لیکن میں نے سختی سے

مخالفت کی کہ کیا ضرورت ہے پڑھانے کی بس جلد از جلد ان کی شادیاں کر کے انہیں رخصت کرو۔
میں جان بوجھ کر بہانے بہانے سے فرزانہ سے اپنے مختلف کاموں کے لیے کہنے لگا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ میرے نزدیک رہ سکے۔
ایک دن میں بازار سے اس کے لیے ایک ریشمی سوٹ لے آیا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔
"فرزانہ تم روحی کی اترن پہنتی ہو یہ سوٹ سلوا کر ضرور پہننا تم پر بہت اچھا لگے گا۔"
میرے گھر میں رہتے ہوئے اچھی خوراک نے فرزانہ پر خوب اثر دکھایا تھا اس پر دوبارہ سے جوانی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں شیطانی خیالات آنے لگتے۔
"آپ کا شکریہ حبیب بھائی، لیکن یہ بہت شوخ رنگ ہے میں شبانہ کا بنادوں گی۔" اس نے نیچی نگاہ کر کے کہا اور تیزی سے میرے سامنے سے ہٹ گئی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔
ایک دن مجھ سے روحی نے دبی دبی زبان میں شکیب میرے منجھلے بیٹے کی شکایت کی کہ وہ شبانہ کے ساتھ بہت بدتمیزی کرتا ہے اور اسے تنگ کرتا ہے، آپ اسے سرزنش کریں تو میں غصے میں آ گیا اور کہا۔
"ایک تو تم جیسی عورتوں کے دماغ میں ہمیشہ خرافات ہی بھری رہتی ہیں۔ بھئی وہ ہم عمر بچے ہیں شکیب نے ذرا سی چھیڑ چھاڑ کر دی ہوگی۔ اس میں اتنا طوفان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔"
"نہیں حبیب وہ عام چھیڑ چھاڑ نہیں ہوتی، وہ شبانہ کو بانہوں میں پکڑ کر بوس و کنار......!"
"شٹ اپ روحی شٹ اپ۔ تمہیں شرم نہیں آتی اپنے ہی بیٹے پر بے ہودہ الزام لگا رہی ہو اور وہ تمہاری بھاوج اور بھتیجی کی احسان فراموشی کی انتہا ہوئی جس تھال میں کھا رہی ہیں اسی میں چھید کر رہی ہیں۔ آئندہ اگر میں نے اپنے بچوں کے متعلق تمہارے منہ سے اس قسم کی گھٹیا باتیں سنیں تو ان سب کو اپنے گھر سے نکالنے میں لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔ پھر میری بلا سے یہ بھاڑ میں جائیں۔"
میں نے اتنے غصے سے چیخ کر کہا کہ روحی سہم کر چپ ہوگئی۔ میری آواز یقیناً باہر بھی گئی ہوگی اور ان لوگوں نے بھی سنی ہوگی لیکن مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی بلکہ یہ بھی میرے شیطانی دماغ کی پلاننگ ہی کا حصہ تھی۔
میرے اتنے زیادہ غصہ کرنے سے روحی کا بی پی شوٹ کر گیا اور اس کی طبیعت خراب ہونے لگی تو میں نے نرم لہجے میں اس سے معذرت کر لی اور کہا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ اسپتال چلی جائے۔
روحی اسپتال جانے لگی تو فرزانہ کچن میں مصروف تھی اس نے شبانہ سے کہا کہ وہ روحی کے ساتھ اسپتال چلی جائے۔
اس وقت گھر میں میرے تینوں بیٹے نہیں تھے۔ بڑا اسعدی تو گھر میں رات گئے ہی لوٹتا تھا شکیب اور ٹیپو بھی گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔ فرزانہ کی چھوٹی بیٹیاں دن بھر گھر کے کاموں کے بعد تھک کر اپنے کمرے میں تھیں۔
میں نے کمرے سے باہر نکل کر سارے گھر کا جائزہ لیا اور کچن میں آ گیا فرزانہ رات کے کھانے کے جھوٹے برتن دھونے میں مصروف تھی۔
دوپٹے سے بے نیاز فرزانہ کا گداز سے بھرپور کسا کسا جسم میرے شیطانی جذبات کو عروج پر لے آیا میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔

"فرزانہ۔"
میری آواز سن کر وہ اچھل پڑی اور بوکھلا گئی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے دوپٹا نہیں لیا ہوا ہے تو وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے اپنا دوپٹا کچن کے دروازے پر ڈالا ہوا تھا۔ میں دروازے کے قریب کھڑا تھا فوراً اپنی جگہ سے تیزی سے ہٹا اور اس کے سامنے آ گیا اور وہ تیزی میں مجھ سے ٹکرا گئی اور میری بانہوں نے ایک بار پھر اس کے جسم کے گداز کو چھو لیا۔
"اتنی تیزی کی کیا بات ہے، تم مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی ہو میں کوئی غیر تو نہیں فرزانہ......!" میں نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔
"بس...... سوری...... دراصل کچن میں گرمی بہت تھی اس لیے میں...... نے...... دو...... دوپٹا او...... اتار دیا تھا......!" وہ کسمسا کر میری بانہوں سے نکل آئی اور جلدی سے دوپٹا کھینچ کر اپنے شانوں پر پھیلا دیا۔
"ہاں تم نے صحیح کیا، کچن میں واقعی بہت گرمی ہوتی ہے۔" میں نے نرم اور بے پروا لہجے میں کہا اور باہر نکلتے ہوئے بولا۔
"میں یہ کہنے آیا تھا کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے پلیز ایک کپ اچھی سی چائے بنا کے دے دو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں تم وہیں آ جانا۔"
یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ فرزانہ کے بدن کے گداز نے میرے جذبات میں آگ لگا دی تھی اور میں اس آگ کی تپش میں بری طرح جھلسنے لگا۔ میں شدت کے ساتھ فرزانہ کا منتظر تھا۔ میرے اندر کا شیطان مجھے مسلسل اکسا رہا تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی بھی موجود نہیں۔ یہی موقع ہے کہ تو فرزانہ اور اس کے بچوں پر کیے گئے احسانات کا بدلہ لے سکتا ہے۔ شیطان مجھے یہ بھی سمجھا رہا تھا کہ یہ تو تیرا حق ہے۔ تو نے انہیں برے وقت میں سہارا دیا انہیں کھلایا پلایا تو کیا تیرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔
میں جذبات کی بھٹی میں سلگ رہا تھا۔ جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہا۔ "آ جاؤ۔"
فرزانہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اس نے ہاتھ میں چھوٹی ٹرے اٹھا رکھی تھی اس میں چائے کی پیالی رکھی تھی۔
وہ میرے نزدیک آئی اور میرے قریب بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ٹرے رکھ کر پلٹنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے متوحش نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور ہاتھ چھڑانے لگی۔
"یہیں بیٹھ جاؤ فرزانہ، یہاں اے سی چل رہا ہے تم کچن سے آئی ہو ذرا سستا لو۔" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
"نہیں کوئی بات نہیں ہے، ہم تو اس گرمی کے عادی ہیں۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا ذرا کچھ دیر میرا سر ہی دبا دو درد کی وجہ سے پھٹا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ...... وہ...... کچن میں ابھی بہت سا کام باقی ہے۔" اس نے کسمسا کر کہا۔
"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، میں تم لوگوں کے لیے اتنی محنت کرتا ہوں اور تم اتنی سی خدمت نہیں کر سکتیں۔" میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔
"اچھا۔" اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دھیرے سے بولی۔ "روحی باجی بھی گھر پر نہیں ہیں۔"

"جب ہی تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ اب روحی خود بیمار رہتی ہے۔ وہ میری خدمت کرنے کے قابل ہی کہاں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور بیڈ پر کھسک کر لیٹ گیا اور اپنے سرہانے اسے بیٹھنے کی جگہ دی اور اس کا ہاتھ اپنی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دیا۔

لیکن وہ بیٹھی نہیں اور کھڑے کھڑے میرا سر دبانے لگی۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی شدید پسینے کی بو میرے دماغ میں کسی اعلیٰ قسم کے پرفیوم سے بڑھ کر دھوم مچا رہی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور وہ میرے بیڈ پر آ گئی۔

اس کے آنسوؤں اور التجاؤں نے میرے اوپر کوئی اثر نہیں کیا اور شیطان نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

اور جب شیطان نے اپنا کام پورا کیا تب مجھے ہوش آیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ میں اسے بہلانے لگا کہ تم فکر نہ کرو اس بات کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ بس تم کبھی کبھی اس طرح موقع دیکھ کر میرا دل خوش کر دیا کرنا۔ میں تمہیں اور تمہارے بچوں کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ بس اب جاؤ اور روحی کے آگے اپنی زبان بند رکھنا۔

فرزانہ ایک لفظ بھی کہے بغیر تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی سعد اچانک ہی میرے کمرے میں آ گیا۔

میں ابھی تک بیڈ پر لیٹا تھا اور بند آنکھوں کے ساتھ لطف و سرور کی اس دنیا کی سیر کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا۔

"کیا ہوا ڈیڈی۔ یہ فرزانہ مامی آپ کے کمرے سے بڑی بری حالت میں باہر گئی ہیں۔" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے معنیٰ خیز لہجے میں کہا۔

میں چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی شرٹ اٹھا کر پہننے لگا۔

"گھبرائیں مت ڈیڈی، ممی کو کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ فرزانہ مامی تو اپنی زبان بند رکھیں گی ہی میں بھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" اس نے سرگوشی میں کہا اور مسکرانے لگا۔

"شٹ اپ سعدی، تم بہت بدمعاش ہو گئے ہو، اب اپنے باپ پر نگاہ رکھو گے۔" میں نے جھینپ کر کہا تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

دوسرے دن فرزانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ میرے پوچھنے پر روحی نے بتایا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ آج کھانا مجھے بنانا پڑے گا۔

میں فرزانہ کی مزاج پرسی کے لیے اس کے کمرے میں گیا تو چھوٹی بیٹی اس کا سر دبا رہی تھی۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر فرزانہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بیٹی سے بولی۔

"جاؤ میرے لیے پانی لے آؤ۔"

بیٹی کے جانے کے بعد میں نے فرزانہ سے کہا۔

"کیا ہوا فرزانہ تمہاری طبیعت کیسے خراب ہو گئی رات تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔"

"طبیعت تو ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی ہے۔ میرے نصیب نے جو میرے منہ پر کالک مل دی ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فضول باتیں کیوں کر رہی ہو، یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تمہارا مقدر تو چمک گیا ہے تم تو میرے دل کی رانی بن گئی ہو۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر ایک چٹکی بھری۔

اتنے میں لڑکی پانی لے کر آ گئی اور میں اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایک ماہ کے دوران مجھے تین مرتبہ ایسا موقع ملا کہ میں نے فرزانہ کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کمزور اور پیلی ہو گئی تھی بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔

روحی بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ ایک دن سعد نے کہا کہ وہ امریکا جانا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ویسے بھی مجھے اس کی جانب سے دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ روحی کے سامنے کچھ کہہ نہ دے۔ سعدی امریکا چلا گیا۔

شکیب بھی سعدی کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ وہ رات گئے گھر واپس آنے لگا میں چاہتا تھا کہ اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے تو میرے ساتھ فیکٹری جایا کرے اور میرا ہاتھ بٹائے۔ لیکن وہ ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔

ان دنوں میں بہت زیادہ مصروف تھا گھر میں رات گئے آنا ہوتا تھا۔ اس رات گھر واپس آیا تو روحی کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

"اب کیا ہو گیا ہے، ایک تو میں تمہاری روتی صورت دیکھ کر بے زار ہو گیا ہوں۔" میں نے بہت زیادہ تھکن کے باعث چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ اس گھر میں کیا پہاڑ ٹوٹا ہے۔ یا اللہ یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ اب میں اپنے اقبال کو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی اور میں سمجھا کہ میری عیاشی کا پول کھل گیا ہے میں نے بمشکل بیڈ کا سہارا لیا اور بوکھلا کر پوچھا۔

"کک...... کیا ہوا ہے آخر......!"

"میرے اپنے بیٹے نے، شکیب نے...... یہ ستم ڈھایا ہے کاش میں نے اسے پیدا ہی نہ کیا ہوتا اس نے شراب کے نشے میں شبانہ کی عزت داغ دار کر دی ہے۔ اس یتیم بچی کو روند ڈالا۔ میں نے تو انہیں سہارا دیا تھا۔ عزت کی چھت دی تھی اور میرے ہی گھر میں ان کی عزت کی دھجیاں بکھر گئیں۔" اس نے بری طرح روتے ہوئے کہا تو میں نے ایک سکون بخش سانس لی کہ میرا پردہ فاش نہیں ہوا۔

"آپ بولتے کیوں نہیں ہیں چپ کیوں ہیں۔ جائیے اپنے لاڈلے سے پوچھیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے شبانہ کی عزت خراب کر کے میرے ہی منہ پر کالک مل دی ہے۔" فرزانہ نے مجھے خاموش دیکھ کر بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

"اتنا تھکا ہوا آیا ہوں اور تم نے رونا ڈالا ہوا ہے۔ صبح ہونے دو کل اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔" میں نے بے زاری سے کہا اور کپڑے چینج کرنے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

"حد ہو گئی...... آپ تو اتنے مطمئن ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" مجھے اپنے پیچھے روحی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

میں کپڑے چینج کر کے خاموشی سے لائٹ آف کر کے لیٹ گیا اور روحی سے کہا۔ "اگر خاموش نہیں رہ سکتیں تو کمرے سے باہر چلی جاؤ اور مجھے سونے دو۔"

دوسری صبح ایک اور چیخ پکار سے میری آنکھ کھلی۔ روحی بری طرح روتے ہوئے مجھے جھنجوڑ کر جگا رہی تھی۔

"کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ سونے کیوں نہیں دیتیں کہہ تو دیا ہے کہ صبح بات کریں گے۔" میں نے بمشکل اپنی آنکھیں کھول کر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"اب صبح کہاں ہوگی۔ ہمیشہ کے لیے اندھیرے چھا گئے ہیں۔ اب اللہ کا عذاب اور قہر نازل ہوگا اس گھر پر جہاں یتیم کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔" روحی نے روتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو ذلیل عورت سکون غارت کردیا ہے۔" میں نے جھنجلا کر روحی کے منہ پر پہلی مرتبہ زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ اس کا رونا بند ہوگیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"شبانہ نے خودکشی کرلی ہے۔ اس نے خود کو ختم کرلیا ہے اس نے کیڑے مار دوائی لی ہے۔ وہ مرگئی ہے۔"

"کیا......؟" میری نیند ویند سب غائب ہوگئی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شبانہ اپنی بے حرمتی پر اس حد تک چلی جائے گی اور اپنی جان ہی دے دے گی میں تو یہ سوچ کر شکیب کی اس حرکت کو درگزر کر گیا تھا کہ جب اس کی ماں سب کچھ سہہ گئی تو وہ بھی سہہ جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی جان ہی دے دے گی۔ ہم باپ بیٹے نے تو ان لوگوں کو مفت کا مال سمجھ لیا تھا کہ چند روٹی کے ٹکڑوں اور اپنی اترن دینے کے بعد وہ ہماری غلام ہماری ملکیت ہوگئی ہیں اور ہم جو چاہے ان کے ساتھ سلوک کرسکتے ہیں۔

مجھے اب شکیب کی فکر تھی۔ خودکشی کا کیس تھا اور یہ پولیس کیس ہوتا ہے اور عموماً مرنے والا یا مرنے والی اپنی جان دینے سے پہلے کوئی خط وغیرہ لکھ کر اپنی جان دیتے ہیں اور اسی میں اپنی خودکشی کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ اگر شبانہ نے بھی ایسا کیا ہوگا تو اس نے اپنی خودکشی کی وجہ بھی ضرور لکھی ہوگی اور اس میں شکیب کا نام صاف صاف لکھا ہوگا۔ یہی ساری باتیں سوچتے ہوئے میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور روحی سے پوچھا کہ شکیب کہاں ہے۔ تو روحی نے جواب دیا کہ وہ رات سے ہی غائب ہے گھر واپس نہیں آیا۔

"چلو میں شبانہ کو دیکھتا ہوں۔" میں نے جلدی سے نائٹ گاؤن جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا اور روحی کے ساتھ شبانہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔

اندر سے فرزانہ اور اس کی بچیوں کی رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا تو شبانہ بستر پر لیٹی تھی اور خون اس کے لبوں کے کناروں سے بہہ بہہ کر اس کے گلے اور قمیض پر جم گیا تھا۔

میں نے کمرے میں چاروں جانب تیزی سے نگاہیں دوڑائیں تاکہ اگر کسی جگہ کوئی خط وغیرہ رکھا ہو تو وہ میری نگاہ میں آجائے لیکن مجھے ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ میں نے آگے بڑھ کر مردہ شبانہ کے سر کے نیچے رکھے تکیے کو دونوں جانب سے اٹھا کر دیکھا کہ وہاں تو خط نہیں ہے لیکن وہاں بھی کوئی خط موجود نہیں تھا مجھے اس طرح کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے دیکھ کر روحی نے پوچھا۔

"آپ کیا تلاش کررہے ہیں کیڑے مار دوا کی شیشی تو باتھ روم میں رکھی ہے۔"

"میں دوا کی شیشی نہیں تلاش کررہا احمق عورت' میں یہ تلاش کررہا ہوں کہ شبانہ نے مرنے سے پہلے کوئی خط تو نہیں لکھا۔"

"پتا نہیں۔" روحی نے ہارے ہوئے لہجے اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"سب سے پہلے شبانہ کو کس نے دیکھا تھا اس حالت میں۔" میں نے گھوم کر روتی ہوئی فرزانہ اور اس کی بچیوں سے پوچھا۔

"میں نے۔" فرزانہ نے روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کوئی خط ملا ہے اگر ہے تو فوراً مجھے دکھاؤ۔" میں نے سخت لہجے میں فرزانہ سے کہا۔

"جی' جی یہ پرچہ اس کی مٹھی میں دبا تھا۔" فرزانہ نے ایک کاغذ کا ٹکڑا میری جانب بڑھایا تو میں نے جھپٹنے کے انداز میں وہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھول کر پڑھا تو اس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ۔

"میری موت کا ذمہ دار شکیب ہے اس نے میری عزت اپنے قدموں تلے روند کر مجھے مرجانے پر مجبور کیا ہے۔"

میں نے فوراً ہی وہ خط پھاڑ ڈالا اور اس کے ٹکڑے اپنے گاؤن کی جیب میں رکھ لیے تاکہ بعد میں ان کو فلش میں بہا سکوں۔

ایک اطمینان ہوجانے کے بعد میں نے فرزانہ سے کہا کہ وہ ایک میلا کپڑا لے کر شبانہ کے منہ اور گردن سے سارا خون صاف کردے اور خبردار یہ بات کسی کو بھی پتا نہ چلے کہ شبانہ نے خودکشی کی ہے۔ شبانہ تو دنیا سے چلی گئی اب چاہے کوئی کچھ بھی کرلے وہ واپس آنے والی نہیں تو کیا فائدہ مرنے کے بعد اسے رسوا کرنے کا' لوگوں کو خودکشی کا پتا چلے گا تو ہزاروں سوالات اٹھیں گے اور پھر جتنے منہ اتنی ہی باتیں تم یہ سوچو فرزانہ کہ تمہارے آگے اور بھی بیٹیاں ہیں......!" میں نے اب اپنے چہرے اور لہجے کو اداسی میں ڈوبا ہوا بنا لیا۔

"یہ تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ میرے آگے اور بھی بیٹیاں ہیں۔" فرزانہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسرار بھرے لہجے میں کہا تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"سب سے یہی کہنا کہ شبانہ کو ڈائریا ہوگیا تھا وہ بچ نہ سکی۔" یہ کہتے ہوئے میں نگاہیں جھکائے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے سب سے پہلے شبانہ کے خط کے ٹکڑوں کو کموڈ میں ڈال کر فلش چلا دیا۔ سارے ٹکڑے لمحہ بھر میں غائب ہوگئے۔ پھر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ پھر کچھ رشتہ داروں کو اطلاع دی۔ رات تک ہم شبانہ کی تدفین سے فارغ ہوگئے۔ جوان موت تھی ہر کوئی کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ بس سب سے یہی کہتے رہے اللہ کی مرضی۔ اس کی اتنی ہی زندگی تھی۔

شکیب کئی دنوں تک غائب رہنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ تو میں نے روحی اور فرزانہ کے سامنے اسے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی میں نے شکیب سے کہا وہ فرزانہ سے معافی مانگے میرے کہنے پر شکیب نے فرزانہ سے معافی مانگی لیکن وہ بالکل خاموش رہی اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ اس کی بچیاں بھی بہت سہمی سہمی سی تھیں۔

اس روز روحی نے قرآن خوانی کروائی اور شبانہ کی دسویں کی فاتحہ دلوائی میں شبانہ کی موت کو ناخوش گوار واقعہ سمجھ کر بھلا چکا تھا اور دوبارہ سے اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں گم ہوگیا تھا رات کو دیر سے ہی گھر لوٹ کر آتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد روحی کی طبیعت مسلسل خراب تھی اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں لیٹی رہتی تھی۔ گھر کے سارے کام فرزانہ اور اس کی بچیاں ہی کرتی تھیں۔

اس رات جب میں گھر لوٹا تو روحی نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دیکھتی رہی۔ وہ بہت غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں ہزاروں شکوے اور شکایتیں تھیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے جوتے اتارتے

ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''فرزانہ اپنے بچوں کو لے کر اس گھر سے چلی گئی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چلی گئی ہے۔ مگر کہاں......؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پتا نہیں۔'' روحی نے کہا اور تکیے میں منہ دے کر سسکیوں سے رونے لگی۔

''پتا نہیں کیا مطلب اس نے جانے سے پہلے کچھ تو بتایا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور تم نے اسے جانے کیوں دیا' اسے روک لیتیں۔ معصوم بچیوں کو لے کر وہ کہاں گئی ہوگی۔'' میں نے روحی کی دل بستگی کے لیے کہا۔

''میں اسے کیسے روک سکتی تھی جبکہ میں اس کے اس گھر سے جانے کا سبب اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔'' روحی نے روتے ہوئے سسکیوں کے درمیان کہا تو میں خاموش ہوگیا۔

''پھر بھی اس گھر کی چار دیواری میں اسے اور اس کے بچوں کو تحفظ......!'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ روحی پھٹ پڑی۔

''تحفظ...... اسے اور اس کی بچیوں کو تحفظ تھا کہاں اس گھر میں......!''

''کیا مطلب؟'' میں گھبرا گیا۔

''اسے تحفظ ہی تو نہیں تھا...... تحفظ ہی تو نہیں تھا۔'' روحی نے اپنا سر تکیے پر زور زور سے مارتے ہوئے کہا۔

پھر اس کی کیفیت ہیجانی ہوگئی۔ وہ جیسے اپنے حواسوں میں نہ رہی۔ اس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور زور زور سے چیخنے لگی اور بولی۔

''سب سے بڑے لٹیرے تو آپ تھے حسیب۔ آپ نے تو مجھے فرزانہ کیا خود اپنی نظروں میں گرا دیا۔''

''تم سے یہ سب کس نے کہا۔'' میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح آہستہ سے کہا۔

''شکیب نے۔ مجھے شکیب نے بتایا ہے کہ سعدی نے ایک رات خود تمہیں دیکھا تھا۔ تم نے اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی اس بیوہ کو نہ چھوڑا تو تمہاری اولاد اس کی جوان بچی کو کیسے چھوڑ دیتی۔ تم سب شیطان ہو' اللہ تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں' کبھی نہیں......!''

اور وہ بے ہوش گئی۔ میں نے جلدی سے تھاما۔ اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی میں نے بھاگ کر شکیب اور رقیب کو ان کے کمروں سے بلایا اور کہا کہ روحی کو فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔

ایک تو روحی کی باتیں دوسرے اس کی طبیعت کی خرابی کے سبب خود میرا بی پی ہائی ہوگیا تھا اس لیے شکیب اور رقیب نے کہا کہ ڈیڈی آپ گھر میں رکیں' ہم امی کو اسپتال لے جاتے ہیں۔

روحی کو اس رات ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ جانبر نہ ہوسکی۔

روحی کی یوں اچانک موت میرے لیے' بہت بڑا جھٹکا تھی۔ میرا اور اس کا پچیس سال پرانا ساتھ تھا۔ میں کافی دنوں تک افسردہ رہا۔ روحی کے آخری الفاظ بار بار اپنے کانوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ایک لمحہ کو تو میں نے سوچا کہ اچھا ہوا روحی اس دنیا سے چلی گئی۔ ورنہ میں کیسے اس کا سامنا کرتا کہ جو حقیقت وہ جان چکی تھی میں نے شکیب سے اس بارے میں معلوم کیا تم نے روحی سے وہ بکواس کیوں کی تو اس نے جواب دیا کہ جب امی نے مجھے برا بھلا کہا اور ناراض ہوگئیں تو میں نے انہیں بتا دیا کہ سعدی بھائی نے مجھے یہ سب بتایا ہے۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ جب ڈیڈی مزا اڑا سکتے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں۔ وہ بھی شبانہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ وہ تو امریکا چلے گئے اور اگر یہاں ہوتے تو مجھ سے پہلے یہ حرکت کر چکے ہوتے۔

سعدی کو میں نے روحی کے انتقال کی خبر دے دی تھی تو اس نے بتایا کہ وہ پاکستان نہیں آسکتا۔ اس کے کچھ مسئلے مسائل ہیں۔

اب میں گھر واپس آتا تو گھر کے سناٹے میری روح کو اندر تک چھید ڈالتے۔ اب روحی کی طرح میں بلڈ پریشر کا مریض بن گیا تھا۔ میرے بیٹوں کو میری ذرہ برابر بھی فکر نہیں تھی۔ کاروبار پر صحیح طریقے سے توجہ نہیں دی تو وہ زوال پذیر ہونے لگا کتنے ہی کنٹریکٹ میرے ہاتھوں سے نکل گئے۔ شکیب اور رقیب بینک میں رکھا روپیہ تیزی کے ساتھ اپنی عیاشیوں میں اڑا رہے تھے۔

اور ایک صبح قیامت آگئی۔ سب کچھ فنا ہوگیا۔ دیواریں اور چھت میرے اوپر آن گریں اور میں ملبے تلے دب کر دنیا جہان سے بے خبر ہوگیا۔

میں دو دنوں تک ملبے تلے دبا رہا۔ امدادی پارٹیوں نے بڑی تلاش کے بعد مجھے باہر نکالا تھا میں بھی کتنا ڈھیٹ تھا دو دن تک ملبے تلے دبے رہنے کے بعد بھی زندہ بچ گیا۔ ہوش آیا تو اسپتال میں تھا۔ لوگوں نے بتایا بہت قیامت خیز زلزلہ آیا تھا۔ ہزاروں لوگ مر گئے۔ سیکڑوں مکانات ملبے کا ڈھیر ہوگئے۔ میرا گھر بھی مٹی کا ڈھیر بن گیا اور میرے دونوں جوان بیٹے اس مٹی میں ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئے۔

مجھے اپنے زندہ بچ جانے کی ذرا بھی خوشی نہیں تھی۔ میرا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔ گھر' بزنس اولاد کچھ بھی نہیں بچا۔

ایک بہت حیرت انگیز بات تھی کہ میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ معمولی چوٹیں تھیں لیکن......!

لیکن میرا جسم مفلوج ہوگیا تھا میرا نچلا دھڑ بالکل بے جان ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ریڑھ کی ہڈی کے ایک مہرے کے ساتھ کوئی رگ دب گئی ہے۔ اس لیے میں چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا ہوں۔

مجھے کتنا فخر تھا کہ میں دولت مند ہوں اور یہ دولت اللہ کے فضل سے نہیں آئی بلکہ میری محنت کا ثمر ہے میں نے ہر غریب کو حقیر سمجھا اللہ نے مجھے جنت کمانے کا موقع فراہم کیا اور میں نے بجائے ان یتیم بچوں کے سروں پر اور بیوہ کے سر پر عزت کا آنچل رکھنے کے ان کے ساتھ بد سے بھی بدترین سلوک کر کے اپنے لیے جہنم خرید لی۔ بیوی اپنے دل میں میرے لیے نفرت اور حقارت لیے دنیا سے چلی گئی۔ ایک بیٹا خود مجھے چھوڑ گیا۔ دو جوان بیٹے اس طرح موت کے منہ میں چلے گئے کہ میں نہ تو ان کا آخری دیدار کر سکا اور نہ ان کے جنازے کو کندھا دے سکا۔ آج میں خود عبرت کی تصویر بن کر رہ گیا ہوں میرا وجود زندہ لاش بن گیا ہے۔ کہاں گیا' سارا بینک بیلنس وہ کوٹھیاں وہ بنگلے وہ غرور سے تنا ہوا جسم اور تکبر سے اکڑی ہوئی گردن۔ نہ فیکٹری رہی نہ کاروبار۔

مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں کہاں جاؤں میں تو خود اپنے پیروں پر چل بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا حال اتنا برا ہوگیا تھا کہ دوسروں کو مجھ سے اڑیل انسان پر رحم آ رہا تھا۔ میں بوڑھا اور لاغر ہوگیا تھا۔

''بابا جی اب آپ کو اسپتال کا یہ بیڈ خالی کرنا ہوگا۔'' اسپتال کے وارڈ بوائے نے میرے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔

”خالی کرنا ہوگا۔“ میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بابا جی اسپتال مریضوں کے رہنے کی جگہ ہے اور جب کوئی مریض صحت یاب ہو جاتا ہے تو اسے اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔“ اس نے کچھ شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

”لیکن میں کہاں جاؤں، ایک تو میرا گھر بار تباہ ہوگیا۔ بچے مر گئے، دوسرے میں اپاہج ہوگیا ہوں۔ خود سے چل پھر نہیں سکتا۔ کون میری دیکھ بھال کرے گا۔ اف میرے اللہ۔“ مارے بے بسی کے میری آواز رندھ گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ لڑکا اداس ہوگیا اور بولا۔

”نہ روئیں بابا جی۔ ایک آپ ہی تباہ نہیں ہوئے ہزاروں لوگ تباہ ہوگئے ہیں۔ مر گئے ہیں اور جو زندہ بچ گئے ہیں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے جو آپ کو اپنے ساتھ گھر لے جائے۔“ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”رشتہ دار......!“ میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا پھر میرے ذہن میں فرزانہ اور اس کے بچے آگئے۔ وہ پتا نہیں کہاں ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قابل بنایا تھا کہ میں دوسروں کا سہارا بنتا میں نے شیطانیت کی انتہا کردی اب دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو آج میں کس طرح لاچار اور بے یار و مددگار پڑا ہوں کون مجھے سہارا دے گا۔ میں نے بیوہ اور یتیموں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ سب میرے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کاش میں نے اس وقت ایک لمحہ کو یہ سوچا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ برا وقت کسی پر بھی ڈال سکتا ہے آج اگر ان پر برا وقت آیا ہے تو کل میرے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لیکن میں تو فرعون بن گیا تھا۔

اے میرے اللہ مجھے معاف کردے۔ میں تیرا گناہ گار ہوں۔ میں نے تیری اور تیرے رسول کی نافرمانی کی۔ اس کے برعکس عمل کیا جس کا تُو نے حکم دیا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے بلک بلک کر رو رہا تھا۔

”نہ روئیں بابا جی چپ ہوجائیں۔ اللہ اپنے بندوں پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا اٹھانے کی ان میں طاقت ہوتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بھی کوئی انتظام کردے گا۔“ اس اچھے لڑکے نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ پھر بولا۔ ”اچھا آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اب رہ رہ کر اپنے سارے گناہ یاد آ رہے تھے اور میں رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ تب ہی مجھے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک دوسرا جوان لڑکا تھا۔ جس کے ہاتھ اور ماتھے پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بولا۔

”نہ روئیں بابا جی۔ اللہ کی جانب سے یہ زلزلہ کسی کے گناہوں کی سزا ہے تو کسی کی آزمائش ہزاروں لوگ مر گئے ہیں گھر بار تباہ ہوگئے ہیں۔ اپنے پیارے جدا ہوگئے ہیں۔ آپ کا بھی کوئی نہیں رہا اور میرا بھی۔ میرے بابا اور ماں جی تو بہت نیک متقی اور پرہیزگار لوگ تھے اس تباہ کن زلزلے نے انہیں مجھ سے چھین لیا۔ صرف میں زندہ بچا ہوں۔ آپ کے بچے نہیں رہے کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی ذات میں اپنے پیاروں کو تلاش کریں آپ میرے ساتھ آئیے میں آپ کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ آپ کی خدمت کروں گا میں یہ سمجھوں گا کہ میرے بابا میرے پاس ہیں اور آپ میرے چہرے میں اپنے بیٹوں کا چہرہ ڈھونڈ لیجیے گا۔“

”مجھے یقین ہے بیٹا کہ تم حقیقت میں نیک لوگوں کی اولاد ہو۔ جو مجھ مجبور اور لاچار بوڑھے کو اپنا باپ سمجھ کر خدمت کرنا چاہتے ہو لیکن تم میرے بیٹے نہیں ہوسکتے۔“ میں نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

”کیوں بابا جی کیا میں اس قابل نہیں کہ آپ مجھے بیٹا کہہ سکیں۔“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

”نہیں میرے بچے یہ بات نہیں ہے، میرے بیٹے تو تم جیسے اچھے لڑکے کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہوسکتے تم بہت نیک اور اچھے لڑکے ہو۔“

”یہ تو آپ کی محبت ہے بابا جی۔ آپ خود بہت اچھے ہیں جب ہی ایسا کہہ رہے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن بیٹا ہم جائیں گے کہاں تمہارا گھر بار کیا تباہ ہونے سے بچ گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میرا گھر بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ لیکن زلزلے کو اب مہینہ ہونے والا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں کی مرمت کرلی ہے۔ میں نے بھی رہنے کے قابل گھر کرلیا ہے۔ میرے یہ چوٹیں آئی تھیں محنت کا کام کیا تو زخم پھر سے ہرے ہوگئے۔ اس لیے یہاں مرہم پٹی کرانے آیا تھا۔ آپ کو دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں یہاں چلا آیا۔“ وہ میرے پاس بیٹھ کر بات کرنے لگا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ سن کر اس حادثے کو ایک مہینہ ہونے والا ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا خود فراموشی میں یہ مہینہ کیسے گزر گیا۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ وہی وارڈ بوائے آتا ہوا دکھائی دیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میرے پاس والا لڑکا بول اٹھا۔

”بابا جی کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ پھر اس نے اپنے گھر کا پتا اسے سمجھایا اور مجھ سے میرا نام اور دوسری شناخت وغیرہ پوچھ کر اس وارڈ بوائے کے پاس لکھوا دیں اور ہدایت کی کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی بابا جی کو تلاش کرتا ہوا ادھر آجائے اس کو میرا پتا بتا دینا۔ اس نے اپنا نام عبدالصمد بتایا۔

اور عبدالصمد مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔ وہ مزدوری کرتا تھا۔ ایک کمرہ تھا اس کے کچے گھر میں باقی آگے سارا صحن تھا۔ وہ مزدوری کر کے آتا کھانا بناتا مجھے کھلاتا میرے کپڑے دھوتا، مجھے نہلاتا، وہ حقیقت میں ایک سگے بیٹے کی طرح دن رات میری خدمت کرتا تھا اور اس معصوم اور بے لوث لڑکے کو دیکھ کر میں سوچتا کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر کتنا کرم ہے کہ اس نے اس بچے کو شیطان کے سائے اور اس کے شر سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

میں گھر میں تنہا رہتا تھا عبدالصمد مزدوری پر نکل جاتا۔ میں اپنی پچھلی زندگی کی ایک ایک بات یاد کرتا اور اللہ کے عذاب کا سوچ سوچ کر کانپ اٹھتا روتا اور گناہوں کی معافی مانگتا۔

عبدالصمد میری دوا بھی لاتا اور پابندی سے اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلاتا جو ڈاکٹر نے اسے لکھ کر دی تھیں۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں نے نہ جانے کب سے نماز نہیں پڑھی اور قرآن تو جو بچپن میں والدین نے پڑھوا دیا تھا پھر کبھی کھول کر نہیں دیکھا۔

اس رات عبدالصمد میری کمر پر آہستہ آہستہ تیل

کی مالش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''بابا یہ تیل بہت اچھا ہے جس نے دیا ہے وہ کہہ رہا تھا کہ اس تیل کی مالش سے تم بہت جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

دوسری صبح اس نے مجھے نہلایا اور بولا۔ ''بابا آج جمعہ کا دن ہے میں تمہیں نہلا کر جا رہا ہوں' جمعہ کو غسل کرنا سنت رسول ہے اور نماز جمعہ فرض ہے لیکن بابا تم تو مسجد جا نہیں سکتے۔ اس لیے گھر پر ہی لیٹے لیٹے نماز پڑھ لینا۔'' پھر عبدالصمد نے مجھے ایک ٹوپی اور تسبیح لا کر دے دی۔ میں لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز ادا کرتا اور تسبیح پڑھتا رہتا۔

عبدالصمد کی کوششوں سے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ میں اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ عبدالصمد میرے ارد گرد تکیہ لگا کر مجھے دیوار سے ٹیک لا کر بیٹھا دیتا تھا۔ لیکن ابھی میں خود اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی چل پھر سکتا تھا۔

مزدوری پر جاتے وقت عبدالصمد گھر کا دروازہ کھول دیتا اور میری چارپائی دروازے کے قریب بچھا دیتا میں عبدالصمد کی غیر موجودگی میں تسبیح پڑھتا رہتا یا پھر گلی میں جھانکتا رہتا۔

ایک دن میں یوں ہی بیٹھا اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا تب ہی ایک سات آٹھ سال کا ہری ہری آنکھوں اور سرخ و سفید رنگت والا ایک چھوٹا سا لڑکا آیا اور میرے پاس رک گیا اور بولا۔

''السلام علیکم!'' میں چونک کر حال میں واپس آ گیا اور اس بچے کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ ''تم کون ہو؟''

''بابا آپ کا کوئی کام ہے تو مجھ سے کروا لو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بیٹا کوئی کام نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو اس بچے کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔''

''کچھ نہیں۔ مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے میں نے سوچا کہ تم سے کوئی کام مانگتا ہوں تمہارا کام کروں گا تو روٹی ملے گی۔'' اس نے کہا۔

''ارے تم بھوکے ہو' آؤ اندر آ جاؤ۔'' میں نے تڑپ کر کہا تو وہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''حیران مت ہو بیٹا' میں بیمار ہوں اٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ تم اندر آؤ اور ادھر دیکھو جہاں چولہا بنا ہوا ہے ادھر ایک چھینکا لٹکا ہوا ہے۔ وہاں روٹی اور سالن رکھا ہے۔ تم اتار کر کھا لو' عبدالصمد مجھے کھانا دے کر گیا تھا وہ میں کھا چکا ہوں۔''

بچہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا اندر آیا۔ وہ چھوٹا تھا اس کا ہاتھ اوپر نہیں جا رہا تھا تو میں نے ایک لکڑی کے اسٹول کی جانب اشارہ کیا کہ اس پر کھڑے ہو کر اتار لو۔ بچہ خوش ہو گیا اور اس نے کھانا اتار لیا اور روٹی سالن میرے پاس لے کر آ گیا۔ میں نے چارپائی پر اسے بٹھا لیا اور اسے کھانا کھانے کو کہا۔

کھانا کھا کر بچہ چلا گیا۔ شام کو میں نے عبدالصمد سے کہا کہ تمہیں اور روٹی بنانا پڑے گی۔ میں نے ایک بھوکے بچے کو کھانا کھلا دیا۔

''کوئی بات نہیں بابا وہ روٹی اس کے نصیب کی تھی۔'' عبدالصمد نے برا مانے بغیر کہا۔ دوسرے دن میں نے عبدالصمد سے ایک روٹی زیادہ مانگ لی اور کھانا اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نہ جانے کیوں اس بچے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ آ گیا۔

اسے دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا اور میں نے کہا۔

''آؤ کھانا کھاؤ گے؟'' تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور شرمانے لگا۔

''آؤ اندر آؤ' میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ دونوں مل کر کھاتے ہیں۔''

وہ بھاگ کر اندر گیا ہاتھ دھو کر آیا اور میرے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ وہ بچہ میرے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور میرے دل کو ایک انجانی سی مسرت ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد بچے نے برتن سمیٹے اور دھو کر رکھ دیے اور بولا۔ ''آپ کا کوئی کام ہے؟'' میں نے حسب سابق منع کر دیا۔

مسلسل چار روز وہ بچہ آتا رہا اور میرے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''آپ مجھے روزانہ مفت میں کھانا کھلا دیتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرواتے مجھے اچھا نہیں لگتا آپ مجھ سے اپنی خدمت ہی کروا لیا کریں۔ تب میں نے پہلی مرتبہ اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ زلزلے میں اس کا سارا خاندان مر کھپ گیا ہے وہ بکریاں چرانے گیا تھا کھلا میدان تھا اس لیے وہ زندہ بچ گیا۔

''تم کہاں رہتے ہو رات کو کہاں سوتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے سارا دن کام کی تلاش میں گھومتا ہوں کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام مل جاتا ہے تو کر لیتا ہوں ایک ہوٹل میں نوکری ملی تھی رات کو وہیں سو بھی جاتا تھا لیکن ایک رات وہاں خراب لوگ آ گئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا۔ میں شور مچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اب اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہوں۔ رات کو کہیں پڑ کر سو جاتا ہوں۔ لیکن رات کو مجھے اندھیرے میں بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے بڑے بڑے دانت والے بہت سے بھوت مجھے کھانے کے لیے آ رہے ہیں۔ لیکن بابا آپ بہت اچھے آدمی ہو۔ محبت والے آپ جیسے لوگوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔''

اس نے مجھے یہ جملہ کہا تو میں رونے لگا۔ مجھے اپنے سارے گناہ اور زیادتیاں یاد آنے لگے۔

''آپ رو کیوں رہے ہو بابا' میں نے کیا آپ کا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دو ورنہ اللہ ناراض ہو گا۔'' بچے نے تڑپ کر میرے آنسو پونچھے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔

میں نے کہا۔ ''تم بہت اچھے لڑکے ہو مجھ سے معافی مت مانگو۔'' اس لمحے مجھے اپنی بدبختی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس معصوم سے بچے تک کو اللہ کی ناراضگی کا خوف ہے اور میں کیسا ناشکرا' ذلیل اور کمینہ انسان تھا جس نے کبھی بھی اپنے ربّ کا شکر ادا نہیں کیا اور اپنے ربّ کی دی ہوئی نعمتوں پر اکڑتا رہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عبدالہادی۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں پڑھنے کا شوق ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''جی بابا بہت زیادہ میں مدرسے میں پڑھتا تھا۔ تیسری جماعت میں تھا۔ آج میں بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں شائد کبھی نہ پڑھ سکوں اگر محنت مزدوری کروں گا تو تعلیم کیسے حاصل کروں گا۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''اچھا ہادی ایسا کرو' آج تم کہیں مت جاؤ تم یہاں رہو گے میرے ساتھ۔'' میں نے کہا تو وہ مسرت اور حیرت سے میری جانب دیکھنے لگا۔

''یہاں آپ کے گھر میں آپ کے ساتھ۔'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرے ساتھ لیکن یہ میرا گھر نہیں ہے عبدالصمد کا گھر ہے لیکن وہ بہت اچھا لڑکا ہے میں اسے کہوں گا تو وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھ لے گا۔''

میں نے کہا تو وہ خوشی سے میرے گلے لگ گیا۔

شام کو عبدالصمد آیا تو ہادی کو دیکھ کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ تب میں نے ہادی کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ اس یتیم اور مسکین کو بھی اپنے گھر میں پناہ دے دو۔ اللہ تعالیٰ اس کے نصیب کا رزق بھی تمہیں دے گا۔

"آپ کی خوشی ہے بابا' تو میری کیا مجال کہ انکار کروں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سعادت مند اولاد کی طرح کہا۔

اور یوں ہادی میرے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے عبدالصمد سے کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ مزدوری پر لے جایا کرے لیکن اس نے ہنس کر منع کر دیا کہ "بچے مزدوری تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ تم بابا کے پاس رہو اور ان کا خیال رکھو۔"

میں نے عبدالصمد سے کہہ کر ہادی کے لیے کچھ کتابیں اور کاپیاں منگوائیں اور دن بھر میں اسے پڑھاتا رہتا پھر ایک دن میں نے عبدالصمد سے کہا کہ وہ ہادی کا اسکول میں داخلہ کروا دے اور عبدالصمد نے ہادی کا اسکول میں داخلہ کروا دیا۔

ایک دن عبدالصمد بولا۔ "بابا یہ ہادی بڑا خوش نصیب بچہ ہے جب سے یہ ہمارے گھر آیا ہے میری روزی میں بڑی خیر و برکت ہو گئی ہے اور اب میں مزدور سے راج مستری کا کام کرنے لگا ہوں۔"

ہادی کو اس گھر میں رہتے ہوئے پانچ ماہ ہو گئے تھے کہ دو بہت ہی خوش گوار باتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ میں خود سے اٹھ کر کھڑا ہونے لگا اور سہارا لے کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ ایک دن مجھے تلاش کرتے کرتے میری فیکٹری کا منیجر آ گیا اس نے بتایا کہ فیکٹری تو تباہ ہو گئی کچھ بھی نہیں بچا۔ لیکن آپ کی اسائنمنٹ جو آسٹریلیا گئی تھی وہاں سے مجھ سے رابطہ کیا گیا تھا ان لوگوں نے۔ وہاں سے آپ کی پے منٹ کا ڈرافٹ آیا ہے۔ آپ کی امانت میرے پاس تھی۔ آپ کو کب سے تلاش کر رہا ہوں خوش قسمتی سے جس علاقے میں میرا منیجر راشد رہتا تھا وہ علاقہ زلزلہ سے محفوظ رہا تھا۔ اس نے میرا حال دیکھا تو دیر تک روتا رہا۔

اس دن کے بعد سے اللہ کا کرم میرے اوپر یہ ہوا کہ میں بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ اب میں بخوبی اپنے پیروں پر چل سکتا تھا۔

میں نے راشد صاحب کے ساتھ مل کر اپنا کاروبار چھوٹے پیمانے پر دوبارہ شروع کر دیا اور ابھی تک عبدالصمد کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عبدالصمد اور ہادی دونوں میری صحت یابی سے بہت خوش تھے۔ میں نے نسبتاً بہتر جگہ پر ایک چھوٹا لیکن صاف ستھرا مکان کرائے پر لے لیا اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔

میری معمولی محنت اور اللہ کے فضل و کرم سے میرا کام پھر سے چل نکلا۔ سارے کنٹریکٹ ملنے لگے۔

میں نے عبدالصمد کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ اس نے بھی جان توڑ محنت کی میرے کاروبار کو جیسے پر لگ گئے۔ صرف دو سال کے قلیل عرصے میں' میں اپنی سابقہ حالت میں واپس آنے لگا۔

ایک دن ہادی نے مجھ سے کہا۔ "بابا میرا دوست ہے اس کے بھی بابا اور اماں نہیں ہیں کیا میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آؤں۔"

"کیوں نہیں بیٹا ضرور لاؤ۔" میں نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔

پھر میں نے عبدالصمد کی ایک اور ڈیوٹی لگا دی کہ اس علاقے میں گھوم پھر کر بے سہارا بچے تلاش کرو اور انہیں میرے گھر میں لے آؤ۔

میرا کاروبار بڑھتا چلا گیا۔ میرے گھر میں کل پندرہ بچے رہتے ہیں سب بہترین اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ میں ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔ اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ رات کی تنہائی میں اور اندھیرے میں روزانہ مجھے روحی کی ملامت زدہ آواز اور جملے سنائی دیتے ہیں۔ فرزانہ کی سسکیاں اور آنسو' شبانہ کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور میں روتے ہوئے بے ساختہ اللہ کے آگے سجدے میں گر جاتا ہوں اور اللہ سے معافیاں مانگتا ہوں۔ ان یتیم اور بے سہارا بچوں کو سہارا دے کر سوچتا ہوں کہ شاید میرا ربّ مجھے معاف کر دے۔ لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یقیناً میرے ربّ نے مجھ پر رحم کیا اور مجھے معاف کر دیا اور اس یقین کی گواہی یہ ہے کہ اس نے مجھ سے بھٹکے ہوئے اور بہکے ہوئے شخص کی رسی ذرا سی کھینچی اور مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔

میرے ربّ نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید کی سورۃ توبہ کی آیت نمبر 104 میں ارشاد فرمایا ہے۔

"کیا ان کو خبر نہیں اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے میں اور رحمت کرنے میں کامل ہے۔"

میرے اللہ نے سورۃ المومن کی آیت 3 میں بھی ارشاد فرمایا ہے۔

"وہ (اللہ) گناہ کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

میرے ساتھیوں توبہ کا مطلب ہے کہ بندہ نافرمانی کے بعد اطاعت پر لوٹ آئے اور اپنے گناہ پر نادم ہو تو ربّ کریم اس کی خطاؤں کو معاف فرماتے ہیں اور اس کی نیکیاں برقرار رکھتے ہیں۔

سورۃ التغابن کی آیت نمبر 17 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اگر تم اللہ کو اچھا قرض دو گے (یعنی اس کی راہ میں خرچ کرو گے) تو وہ اسے تمہارے لیے بڑھاتا رہے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا اللہ بڑا قدر دان بڑا بردبار ہے۔"

اللہ وہ ذات ہے جو بندے کے تھوڑے عمل پر بھی بہت زیادہ اجر دیتا ہے اللہ تعالیٰ انسانوں کی عبادات کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ان کو کئی گنا بڑھا کر عطا کرنے والا ہے۔ اللہ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو بے انتہا اجر و ثواب سے نوازتا ہے اور ان کے گناہوں کے مواخذہ سے درگزر فرماتا ہے۔

ڈر نا آشنا

جناب مدیر اعلیٰ نئے افق'

تسلیمات!

ماہنامہ نئے افق حقیقت میں ایک نیا طرز جہاں ہے جس کی سبق آموز کہانیاں یقیناً کتنی بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لاتی ہوں گی اور کتنی ایک کو بھٹکنے سے بچا چکی ہوں گی۔ اسی لیے بہت حوصلہ کرکے ہم نے بھی ایک انتہائی سچے واقعے کو تھوڑا سا رد و بدل جو کہ ضروری سمجھی جاتی ہے کے ساتھ کہانی کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔

والسلام

فرحین ناز طارق

چکوال

''مما ہم کہاں جارہے ہیں؟'' اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلتے بلکہ بھاگتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاسپٹل۔''

''نہیں...... مما ہم وہاں کیوں جارہے ہیں؟''

ہسپتال کا نام سن کر تشویش سے گویا ہونے کے ساتھ ہی وہ رک کر بھرپور زور لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچنے لگی۔ گویا اس کو وہاں جانے سے باز رکھ رہی ہو۔ وجہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔ بس اکثر بچوں کی طرح اسے بھی ہسپتال سے خوف آتا تھا اور عنقریب ہی کچھ ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا کہ اس کا یہ ڈر مستقل روپ دھارے آج اتنے سالوں بعد بھی اس کے سینے میں موجود ہے اور وہ آج بھی ہسپتال کا نام سن کر اسی روز کی طرح اپنی ماں کا پلو تھام لیتی اور آنکھیں میچ لیتی ہے مگر اس کے سینے میں کنڈلی مارے پھن پھیلائے بیٹھا یہ خوف کیا ہے اسے جاننے کے لیے ہمیں کئی سال پہلے رونما ہوئے اس ناخوشگوار واقعے کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہوگا۔ اس کے سینے میں دفن اس راز کو مقفل کرنا ہوگا۔ بات کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی اس کے لیے معذرت۔ تو آیئے سلسلہ کلام دوبارہ وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے یہ چلا تھا۔

''ہنی کیا کررہی ہو بیٹا...... چلو آگے۔'' آس پاس سے گزرتے لوگوں سے خفت محسوس کرتی اسے پیار سے پچکارتے ہوئے بولی۔ پھر اسے کھڑا دیکھ کر اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔

''بچے نانو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم انہیں دیکھنے جارہے ہیں۔ تم نانو سے نہیں ملو گی کیا۔'' وہ محض آنکھیں پٹپٹا گئی۔

''السلام علیکم خالہ کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔'' اندر داخل ہوتے ہی وہ ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے نیچے اتار کر ان کے گال پر بوسہ دیتے وہ بولی۔

''ارے اس عمر میں کیا طبیعت ہوگی بیٹا تم لوگ تو خواہ مخواہ میں ہی گھبرا گئے ہو۔'' انہیں باتوں میں مگن دیکھ کر وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

''ہنی کہاں گئی خالہ۔'' کافی دیر کے بعد اسے خیال آیا تو اسے نہ پاکر وہ بری طرح ٹھٹکی۔

''آپ پریشان نہ ہوں آپی میں دیکھتی ہوں۔'' اسے اٹھتا دیکھ کر اس کی خالہ زاد نادیہ اسے تسلی دیتی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''م...... م...... ما...... ں...... با...... بھ......''

وہ جیسے ہی وارڈ میں داخل ہوئی اسے دلدوز نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ اس کا کمزور دل سہم کے رہ گیا۔ وہ پلٹ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر ان آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ کوئی غیر مرئی طاقت اسے کھینچتے ہوئے اس ہجوم کی طرف لے گئی۔ وہ آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ اس کے کان کے پردے پھاڑ ڈالتی یا اس کے ننھے دل کی دھڑکن روک دیتی۔ مگر وہ ان سے ذرا فاصلے پر کھڑی رہی اس کی پوزیشن میں کوئی بدلاؤ نہ آیا۔

''نرس جلدی سے انجکشن لاؤ۔'' ان آوازوں کے ساتھ کچھ اور آوازوں کا اضافہ ہوا۔

''move fast'' ڈاکٹر نرس پہ چلایا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ وہ فلک شگاف چیخیں جلد ہی مدھم ہوتے ہوتے خاموش ہوگئیں۔

رفتہ رفتہ ہجوم چھٹنے لگا۔ ایک خوب صورت کلائی لہراتی ہوئی نیچے گری اور منظر ساکت ہوگیا۔ قریب ہی غم کی تصویر بنی بے بس بیٹھی ایک معمر خاتون ماحول کو مزید سوگوار بنارہی تھیں۔

''ہنی کہاں گھومتی پھر رہی ہو تم۔ ہاسپٹل میں یوں نہیں جاتے اِدھر اُدھر۔ گم ہوجاؤ گی۔'' اسے گود میں لیتی وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ جواباً وہ اسے اس لڑکی کے بارے میں بتانے لگی۔ تو وہ بھی اشتیاق کے ہاتھوں مجبور ہوکر اسے لے کر اس سمت چل دی۔ اس کے زردیوں میں کھلے بے انتہا خوب صورت چہرے کو دیکھ کر وہ مبہوت ہی تو رہ گئی۔

''نادیہ تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' وہ اتنی منہمک تھی اسے دیکھنے میں کہ اپنی نرس دوست شہلا کی وہاں آمد کو بھی نوٹس نہ کرسکی۔

''شہلا' وہ لڑکی......'' بمشکل تمام وہ کہہ پائی جیسے کسی ٹرانس کی حالت میں ہو۔

''وہ لڑکی بیچاری' بہت ظلم ہوا ہے اس پر۔'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولی اور پھر جو کچھ اس نے کہا وہ سن کر ان کے کلیجے حلق کو آنے لگے اور آنکھیں حیرت اور رنج سے پھٹی رہ گئیں۔

❀......❀......❀

''بشریٰ جا ذرا جلدی سے پڑوس سے آسیہ کو بلا لا مجھے کچھ کام ہے اس سے۔'' چاول صاف کرتے وہ مصروف سے انداز میں بولی تو وہ باہر بھاگ گئی۔

''باجی تم نے بلایا مجھے۔ کیا ہوا خیریت ہے۔ اتنی جلدی میں بلایا مجھے۔''

''ہاں آ آسیہ بیٹھ۔''

''کہاں دو گھڑی بیٹھنے کا بھی وقت ملتا ہے باجی پھر سو کھیڑے منہ کھولے منتظر بیٹھے ہیں۔ تم بتاؤ خیریت تو ہے۔'' اس کے قریب چارپائی پر براجمان ہوتے وہ مسلسل بولتی رہی۔

''اری خیریت کہاں آسیہ۔ اچھا خاصا کاروبار تھا تیرے بھائی صاحب کا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ سب تہس نہس ہوگیا۔ اب تو فاقوں کی نوبت آچکی ہے۔'' وہ روہانسی ہوتی بولی۔

''ہائے ہائے باجی اتنا سب کچھ ہوا اور ہمیں پتا تک نہ چلا۔ ارے باجی ہم کیا غیر تھے تمہارے۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''نہیں آسیہ بس ان پریشانیوں نے ایسی مت ماری کہ کچھ دھیان نہ رہا۔ تیرے بھائی صاحب

ایک باباجی کے پاس گئے تھے' انہوں نے اپنے موکلات کے ذریعے بتایا ہے کہ کسی نے جادوٹونہ کرر کھا ہے اور جنات وغیرہ کا بھی ڈیرہ ڈلوار کھا ہے ہمارے گھر پر۔ آج وہ باباجی آئیں گے ہمارے گھر۔ کنکر مار مار کر ان سب نحوستوں کو بھگادیں گے ہمارے گھر سے۔ تجھے اس لیے بلایا تھا کہ اگر کوئی پتھر وغیرہ آئے تمہارے گھر تو ڈرنا مت۔"

"نہیں باجی بھلا ڈر کی کیا بات ہے۔ دو تین کنکر ہمارے گھر پر بھی پھنکوا دینا۔ ان سے کہہ کر کہیں یہ ہمارے ہی گھر نہ ڈیرہ ڈالنے آجائیں۔ دیوار سے تو دیوار جڑی ہے باجی ذرا ہمارا بھی دھیان رکھنا۔" وہ تشویش سے بولتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو ڈر مت۔ باباجی کہہ رہے ہیں انہیں یہ سارا علاقہ ہی چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔"

"اری بشریٰ تجھے کہا ہے میں نے کہ نئی سفید چادریں جو میں نے ابھی نکال کے رکھی ہیں بکسے سے وہ بچھا چارپائیوں پر۔ اتنی بڑی ہستی خود چل کر ہمارے گھر آرہی ہے۔ ان کے لیے اچھا سا انتظام کرنا ہے ضیافت کا۔" تیزی سے کہتی وہ گوشت کی طرف متوجہ ہوگئی۔

❀......❀......❀

شام کوان کے سامنے انواع اقسام کے پکوان چنتے آنسہ بیگم اور صداقت حسین پیر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے آگے بچھے جارہے تھے۔ اس دسترخوان کو دیکھنے والا کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ اس گھر کے مکینوں کے پاس کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ ان میں سے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ اس ضیافت میں پیرجی اور ان کے موکلات وغیرہ کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ ہوسکیں۔

"اری بشریٰ کہاں ہے تو' اری آجا۔ پیر سائیں سے پردہ کررہی ہے۔ گناہ کا ارتکاب کیوں کرتی ہے اری بیوقوف...... آدعا لے ان سے۔ زندگی سنور جائے گی تیری۔" وہ اندر گیا اور اپنے ساتھ شرمائی لجائی اک بچی کو ساتھ لیے پلٹا۔ خود سے قطعاً بے خبر قدرے معمولی نظر آتی انتہائی غیر معمولی بچی ایک لمحے کے لیے اسے اچنبھے میں ڈال گئی۔

"جیتی رہو۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے دعا دی گئی مگر ان کے انداز پر وہ چونک کے فوراً دور ہٹی۔ خود پر اٹھنے والی ہر ہر نظر صرف ایک لڑکی ہی باآسانی پہچان سکتی ہے۔ وہ بھی سمٹ کر اندر بھاگ گئی۔

❀......❀......❀

اس دن باباجی کے چلہ کشی کے بعد اسے ایک بار پھر کاروبار کرنے کی تلقین کی گئی۔ سو وہ کچھ ادھار ادھر ادھر سے جاننے والوں سے جمع کرنے کے بعد کاروبار جمانے میں لگ گیا۔ ہمیشہ سے بڑھ کر محنت کرتے اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہ رہا۔ مگر وہ پرامید تھا کہ کامیابی اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ کیونکہ پیرومرشد کا دست شفقت اس کے سر پہ سایہ کیے ہوئے تھا۔ بالآخر چند سالوں کے بعد بے انتہا محنت کے باعث لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں کو سنبھالتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وقت یونہی اپنی رفتار چلتے کئی سالوں کا پلٹا کھاتا چلا گیا۔ یکے بعد دیگرے چار بیٹوں کی پیدائش کے بعد اس کی عقیدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پیر صاحب کی عنائتیں شمار کرتے کرتے وہ یہ بھول ہی گیا کہ جو لوگ پتھروں کو پوجتے ہیں انہیں بھی اپنے حصے کا رزق بہم پہنچتا ہے۔ اس پروردگار کائنات کی طرف سے جو کہتا ہے کہ مجھ سے مانگ میں تیری شہ رگ سے بھی نزدیک ہوں۔"

جو کسی وسیلے کے بغیر بھی عطا کرتا ہے۔ انہیں بھی دیتا ہے جو اس کی ذات پاک کی نفی کرتے ہیں اور انہیں بھی جو اس کے ہی تخلیق کردہ مٹی کے پتلوں کی پرستش کرکے اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔

❀......❀......❀

"بشریٰ ادھر آ کر باباجی کے پیر دبا۔ میں ابھی آتی ہوں۔ ذرا پڑوس میں کام ہے مجھے۔ اچھا باباجی اجازت۔ ابھی صداقت حسین بھی آتا ہوگا۔" گہرے مراقبے میں غرق بابا جو دو دن سے ان کے گھر براجمان تھے۔ ہنوز بند آنکھوں سے اس کی آدھی ادھوری بات سن کر ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جو ہمیشہ سے ان سے خوف محسوس کرتی تھی۔ ماں کے حکم پر مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق آ کر ان کے پیر دبانے لگی۔ نرم ہاتھوں کالمس محسوس کرتے اس نے چونک کر غور سے اس دوشیزہ کو دیکھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیزی سے جانے ہی لگی کہ اسے اپنی کلائی برف ہوتی محسوس ہوئی۔

"ہمارا لگایا پودا جڑ پکڑ چکا ہے۔ بلکہ تناور درخت بن چکا ہے اب تو ہمارے پھل کھانے کا وقت ہے۔" اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ اتنے برسوں سے اس کے اندر موجود خوف آج اس کے سامنے کھڑا روپ دھار رہا تھا۔ قریب پڑا گلاس اٹھا کر پوری قوت سے بنا دیکھے مارتے ہی باہر بھاگی۔

"یہ تُو نے اچھا نہیں کیا لڑکی۔ تو نے ہمارے غضب کو للکارا ہے۔ اب اس کا انجام بھگتنے کو تیار ہوجا۔ تجھے اپنا سب کچھ کھونا ہوگا۔ سب کچھ۔ اب تو دیکھ ہماری طاقت کو۔" دروازہ عبور کرنے تک اس کی منحوس آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ آنسوؤں سے تر چہرہ لیے وہ آسیہ کے گھر داخل ہوئی۔ تمام ماجرا جاننے کے بعد وہ جلدی سے اس کی ماں کو بھی ڈھونڈ لائی۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر آنسو بہاتی حیرت سے بت بنی بیٹھی رہیں کہ صداقت کے بلاوے پر اسے وہیں آسیہ کے سپرد کرکے گھر چل دی۔ اس کے بیٹی کے متعلق استفسار کرنے پر ٹال مٹول کرکے مطمئن کرگئی۔ اس ڈھونگی بابا کے روانہ ہونے کے بعد ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے کئی بار اپنے شوہر کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ اس ہستی کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کا روادار نہ تھا جس کی وہ پرستش کرتا تھا۔ اس کا سب کچھ انہی کی تو دین تھا۔ شب وروز اسی کشمکش میں گزر رہے تھے۔

مگر اسے تو اپنی توہین کا بدلہ لینا ہی تھا۔ ہر کوئی اس کے ایک اشارے کا غلام۔ اس کے گھٹنوں کو چھو کر اس کے پیروں میں بیٹھنے والا اور وہ بالشت بھر کی لڑکی اس کی یہ مجال......

اس کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ اس کے لیے کڑی سے کڑی سزا تجویز ہوچکی تھی۔ جس سے وہ قطعاً بے خبر تھی۔

❀......❀......❀

"تیرے چاروں بیٹے نافرمان ہیں صداقت۔" ان کے منہ سے ادا ہوتے الفاظ ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر برسے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ سائیں جی۔ وہ تو ابھی ذرا سے بچے ہیں اور بچے تو جنت کے فرشتے ہوتے ہیں۔''

''تو سچ کہتا ہے صداقت حسین۔ بچے تو جنت کے فرشتے ہی ہوا کرتے ہیں اور یہی سوچ کر ہم نے تجھے خدا کے ہاں سے لا کر دیئے تھے۔ مگر یہ تیرے بیٹے فرشتے نہیں شیطان نکلے۔ یہ بڑے ہو کر ہمارے تمہارے ہی نہیں خدا کے بھی نافرمان ہوں گے۔ شیطان کے چیلے بن جائیں گے۔ شر پھیلائیں گے۔ برائی کریں گے۔ فتنہ وفساد برپا کریں گے۔ اس برائی کو یہاں ہی ختم کر ڈال۔ بڑھنے مت دے اس گندگی کو۔ خدا تجھے اس کا اجر دے گا۔ اس برائی کے بدلے نیک متقی دس اولادیں دے گا۔ ہم خود لا کر دیں گے تجھے۔ بس تو اس برائی کو روکنے کا موجب بن جا۔ تو سمجھ رہا ہے ناں ہم کیا کہہ رہے ہیں۔''

اپنی بات ختم کرتے اس کی آنکھوں میں کمینگی کی چمک دیکھی جا سکتی تھی اگر وہاں کوئی سر اٹھانے کی جسارت کر سکتا تو۔

''وہ شیطان ہی ہوں گے سائیں مگر ہیں تو میری ہی اولاد ناں۔'' آنسوؤں سے تر چہرہ لیے بھرائی آواز میں گویا ہوا۔

''مطلب تجھے ہماری بات کا یقین نہیں رہا تو بھی اپنی اولادوں کی طرح نافرمان ہو گیا ہے صداقت حسین۔ جا چلا جا یہاں سے ہمارے در پہ نافرمانوں یا بے اعتقادوں کا کوئی کام نہیں۔ جا جا یہاں سے۔'' نہایت جاہ وجلال میں تیز تیز بولتے اسے اپنی خفگی کا یقین دلایا گیا۔

''نن...... نہیں پیر سائیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں کیسے آپ کی نافرمانی کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے ہاتھوں سے کیسے یہ کام کر دوں۔'' وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''دیکھ صداقت قربانی دینا تو پیغمبروں کی صفت ہے۔ خدا نے تجھے بھی اپنی اس آزمائش کے لیے چنا ہے تو تو خوش قسمت ہے۔ اور تیرے بیٹے بھی وہ سب کر کے جہنمی ہونے سے بچ جائیں گے۔ خدا کے ہاں تیرے لیے بڑا اجر تیار ہے۔ ارے یہ مال اور اولاد تو ہیں ہی نرا فتنہ۔'' اس کے کندھے کو تھپکتے ایک پل کو بھی اس کا دل لرزا نہ تھا۔ وہ سفاکی کی ہر حد پار کرتا چلا گیا۔

اس کے برعکس وہ بے ڈول ہوتے قدموں سے کسی عمر رسیدہ پیڑ کے جیسے بے ڈول ہوتے اس کے پیروں کے قریب گر گیا۔

❁......❁......❁

''ٹھاہ ٹھاہ...... ٹھاہ......'' انتہائی بھیانک آواز کے ساتھ بیدار ہوتے ہی ننگے سر ننگے پیر سرپٹ وہ باہر دوڑی۔ کسی انہونی کا خوف زندہ ہو گیا تھا۔ سامنے فرش پر تین فرشتہ صفت معصوم مگر مردہ وجود پڑے تھے۔ اور ان پر گرتی پڑتی ان کو بچاتی اس کی زخمی ماں خون میں لت پت ایک طرف پڑی تھی۔ وہ ہذیانی چیخوں میں اپنے ماں اور بھائیوں کو بلاتی کچھ فاصلے پہ کھڑے سہمے کانپتے اپنے چوتھے بھائی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جس کا ننھا سا وجود اس کے سامنے بالکل چھپ گیا تھا۔ اس ظالم شخص نے اسے زور سے دھکا دیا وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری مگر پھٹے سر کے ساتھ پھر پلٹی۔ اس کا گریبان پکڑ کر اس پہ مکوں کی برسات کرنے لگی۔ اس بدبخت نے اپنے ہاتھوں اپنی جنت اجاڑ لی تھی۔ اس پر خون سوار ہو چکا تھا۔ اسے ایک بار پھر پوری قوت سے دور پھینکا۔ اب کی بار اس سے پلٹنے میں دیر ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر وہی منحوس آواز گونجی اور اس نے زندگی کو آخری ہچکی لیتے دیکھا اور بس کھیل ختم...... وہ تیزی سے فرش پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھی اور اس مردہ وجود کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کی بد سے بدتر ہوتی چیخوں میں بھی اس نے زندگی کی ایک رمق ڈھونڈنے کے لیے باری باری ان کے سر اپنی گود میں رکھے۔ مگر ہر طرف سوائے خون کے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ آخری چہرہ اس کی ماں کا تھا۔ جو پتھرائی آنکھوں اور ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ بے خبری کی وادی میں جا سمائی۔ وہ زندہ تھی یا مر گئی تھی اس سے فیصلہ نہ ہو پایا تھا۔ باہر پولیس کی گاڑیوں اور لوگوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ ہتھکڑیوں میں جکڑے اپنے مجرم باپ پر آخری اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ بہت سے لوگ اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ شاید جانتے تھے کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ اس کی چیخیں تھمی تھی یا نہیں اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ کسی کے بھی قریب آنے سے پہلے وہ تیزی سے دوسری منزل کی چھت سے کود گئی۔

❁......❁......❁

''فی الحال اس کی جان تو بچ گئی ہے مگر اس کے دونوں گردے مکمل طور پر ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اسے مصنوعی مشینوں کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر اس کا بچنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے اندر زندگی کی کوئی رمق نہیں بچی۔ اس کی ماں مر چکی ہے یہ عورت اس کی خالہ ہیں جو اپنی بہن کی اس آخری نشانی کے بچ جانے کی دن رات دعائیں مانگ رہی ہے۔ مگر یہ بچ ہی نہیں سکتی۔ اگر بچ گئی تو وہ بھیانک منظر اس کے حواس ضرور سلب کر لے گا اور میں تو کہتی ہوں کہ اس آزمائش کی زندگی سے اس کے لیے موت ہی بہتر ہو گی۔ وہ بدبخت ابھی بھی یہی کہہ رہا ہے کہ سائیں جی! اسے بچا لیں گے۔ جبکہ سائیں خود غائب ہو چکا ہے۔ اب کسی دوسری جگہ جا کر طبع آزمائی کر لے گا۔ ایسے ظالموں کو تو چوک پہ کھڑا کر کے سنگسار کرنا چاہیے۔''

وہ بول بول کر بالآخر چپ ہو گئی۔ ان کے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑے نہ جانے کب سے رواں تھے۔ تبھی وہ چیخیں پھر سے گونجنے لگیں۔ اور وہ ڈری سہمی بچی اٹھائے بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

شاید سب لوگ برے نہ ہوں۔ شاید ان میں کچھ اللہ والے سچے لوگ بھی ضرور ہوں گے کہ انہی کی نیکی کی وجہ سے یہ دنیا اب تک قائم ودائم ہے۔ مگر اپنی زندگی کسی کے سپرد کرنے سے پہلے سوچیے ضرور۔ یقیناً کسی بھٹکے ہوئے کو صرف وقت اور حالات کی ٹھوکریں ہی راہ راست پر لا سکتی ہیں۔

لیکن ایک معمولی سی کریم کی بوتل پر بھی یہ عبارت اکثر دیکھنے کو ملتی ہے ''نقالوں سے ہوشیار رہیے'' تو پھر یہ تو ہماری زندگیاں ہیں...... انہیں کیسے کسی دوسرے کے ہاتھوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ سوچیے گا ضرور......!

⌘
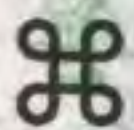
روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

انجینئر عمر......راولپنڈی

سوال: محترم السلام علیکم! ہمارا کاروبار (بڑے بھائی کے ساتھ) بہت اچھا شروع ہوگیا ہے پھر بھی کبھی کبھی رکاوٹ آجاتی ہے۔ رکاوٹ دور کرنے کے لیے وظیفہ' حسد اور بدنظر سے بچنے کا وظیفہ عنایت فرمادیں۔

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ کاروبار کے لیے دعا کریں۔

نسرین اختر......میانوالی

جواب:۔ مسئلہ نمبر1:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل اول وآخر 77 مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کردم کریں۔ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔ عشاء کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کراپنے اوپر اور شوہر کو تصور میں لا کردم کریں۔ (دعا بھی کریں)۔

مسئلہ نمبر2:۔ یا مذل دکان پر بیٹھ کرایک تسبیح کرلیا کریں۔ یہ پریشانی نہیں ہوگی۔ پڑھتے وقت ان کا تصور رکھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نماز کی پابندی کریں ہر نماز کے بعد سورۃ قریش پڑھا کریں 21 مرتبہ برکت کے لیے۔ بیٹے کے لیے بھی دعا کریں۔

گرمیوں میں ٹھنڈی چیزیں استعمال کریں۔

رینا شاہد......شورکوٹ شہر

جواب:۔ یا علیم 41 مرتبہ اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف صبح نہار منہ پانی پر دم کرکے پلائیں اور پڑھنے بیٹھتے وقت 11 مرتبہ پڑھ لیا کریں۔

سدرہ......شورکوٹ

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ یا فتاح پڑھا کریں۔

عائشہ رحمت علی......گوجرانوالہ

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ والضحیٰ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت یہ تصور ہو کہ بھائی رابطہ کررہا ہے۔ اس کا دل اور دماغ گھر کی طرف راغب ہورہا ہے۔ پابندی سے پڑھیں مسئلہ حل ہوجائے گا۔ ان شاءاللہ

مس ن۔ پ۔ س......کھڑیانوالہ

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں جلد اور اچھے رشتے کے لیے۔

ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھیں۔ تصور یہ ہو کہ والدین سنجیدہ ہورہے ہیں۔ گھر میں کوئی اثرات نہیں۔

س۔ خ......خانیوال

جواب:۔ بہن بھی وہی وظیفہ پڑھیں رشتے کے لیے۔

41 مرتبہ سورۃ العصر بھائی کے سرہانے کھڑے ہوکر پڑھیں جب وہ نیند میں ہو۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

نائلہ اعوان......منڈی بہاؤالدین

جواب:۔ مسئلہ نمبر1۔ سورہ الم نشرح ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

۲:۔ شوگر' بلڈ پریشر اور بواسیر کے لیے مسواک پڑھی جاتی ہے آنچل کے ذریعے منگوالیں۔ (نیم کی مسواک)۔

۳:۔ سر پر تیل لگائیں۔

س۔ م۔ ک۔ ن......فیصل آباد

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہوجائے۔

احمد شیراز......سانگھڑ

جواب:۔ انسان کوشش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے اپنے حق میں بہتری کے لیے۔ استخارہ کریں۔

ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر دعا کریں فوج میں شمولیت کے لیے۔

رضیہ......کمبوہ

جواب:۔ بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یٰسین اور 1 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھیں اول وآخر 3'3 بار درود ابراہیمی اپنے لیے دعا کریں۔

ام سالار......جہلم

جواب۔ آیت شفاء کا ورد رکھیں۔ ماہواری کے لیے حکیم صاحب سے رجوع کریں۔

درخشاں معاذ

جواب:۔ ایک گیلن پانی پر 1 مرتبہ سورۃ بقرۃ پڑھ کردم کریں۔ روزانہ گھر میں چھڑکیں۔

عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورہ قریش (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) پڑھتے وقت دونوں مسئلوں کو ذہن میں رکھیں۔ بعد میں دعا بھی کریں۔ دونوں کا ایک ہی جواب ہے۔

مسز شہزاد......سندھ

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

روزگار کے لیے۔ سورۃ القریش 111 مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

گھر اگر کرائے کا ہے تو تبدیل کریں۔ اگر اپنا ہے تو کسی عامل سے رابطہ کریں اثرات ہیں۔

غ۔ ق......خانیوال

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز عشاء 41 مرتبہ آیتہ الکرسی پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں۔ استغفار کثرت سے کریں۔

م۔ ش......سیالکوٹ

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اپنے دونوں مسئلوں کے لیے دعا کریں۔

بشریٰ ملک......فیصل آباد

جواب:۔ ہر ماہ صدقہ دیں والدہ کا اور گھر کے تمام افراد کا سوچ کر۔ حسب حیثیت (مرغی/بکرا) پریشانی نہیں آئے گی۔

فجر کی نماز کے بعد ایک مرتبہ سورۃ یٰسین اور ایک مرتبہ سورۃ رحمن پڑھا کریں۔ ٹھیک ہوجائیں گی۔

شازیہ نذیر......ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب:۔ فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر 11 مرتبہ یا قوی پڑھیں۔

ر۔ ا۔ ش......فیصل آباد

جواب:۔ مسئلہ نمبر1:۔ رشتے کے لیے جو بتایا جاری رکھیں۔ کبھی دیر ہوتی ہیں پر کام ہوجاتا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ جو رکاوٹ' بندش ہے ختم ہو۔ (آپ دونوں بہنیں کریں)۔

مسئلہ2:۔ سورۃ مومن روزانہ پڑھیں دونوں بھائی۔ اپنے مرض پر دم کریں۔ اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف۔ اگر کوئی دوا بھی استعمال میں ہے تو اس پر بھی ایک مرتبہ دم کرلیں۔

حنا علی......کراچی

جواب:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ہر نماز کے بعد 11'11 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ نیت رکاوٹ ختم ہو۔ گھر کے تمام افراد پڑھیں۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ سورۃ البقرۃ پانی پر دم کر کے پورے گھر میں چھڑکیں۔

P۔ع......پسرور

جواب:۔ فرض نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر یا قوی پڑھیں۔ پڑھنے بیٹھنے سے پہلے 11 مرتبہ یا علیم پڑھیں۔ اپنے رشتے کے لیے پہلے استخارہ کریں پھر کوئی فیصلہ کریں۔

علی حسن......ماڈل ٹاؤن

جواب:۔ سورۃ الشمس روزانہ 40 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلائیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

دعا......کالا گوجراں جہلم

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف)۔ نوٹ:۔ جن کے بھی رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں۔

بھائی کے لیے استخارہ کرلیں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ نماز کی پابندی کریں قرآن کی تلاوت اور صدقہ بھی دیں۔

ش۔ت......ملک وال

جواب:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز عشاء 111 مرتبہ سورۃ القریش اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اپنے لیے دعا کریں نوکری اور دوسرے مسئلوں کے لیے۔

بہتر ہے بیٹی خود کرے۔ ورنہ آپ کرلیں۔

(3 ماہ)

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن مئی ۲۰۱۲ء

نام......... والدہ کا نام......... گھر کا مکمل پتا.........

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پذیر ہیں.........

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

گیت

خفا خفا سی بات کرو نا تم
دھیمی دھیمی آنچ کرو نا تم
مجھ سے نگاہیں پھیر کے او یارا
ایک میرے دن رات کرو نا تم
میری کھلی آنکھوں کی
چاہت کو تو دیکھ ہرجائی
آہٹ سے ڈر جاتا ہے
یہ دل میرا ماہی
اچھے میرے حالات کرو نا تم
ایک میرے دن رات کرو نا تم
بانہوں کے گھیرے میں جو
دیوانہ وار ہو جاؤں
تجھے پیار سے چوم کر
شوق میں مر جاؤں
کبھی پھولوں کی برسات کرو نا تم
ایک میرے دن رات کرو نا تم
خفا خفا سی بات کرو نا تم
دھیمی دھیمی آنچ کرو نا تم

سید عبداللہ شاہد......حیدر آباد

غزل

ہر طرف آہیں سسکیاں اور پکاریں
الٰہی آخر یہ ماجرا کیا ہے
بشر ہی بشر کو کاٹ رہا ہے
لاشوں کے تحفے بانٹ رہا ہے
آدم نے تو نہ بوئی یہ فصل
جو آج کل بشر کاٹ رہا ہے
کبھی کشمیر کبھی فلسطین کبھی برما
کائنات میں ہر طرف مسلم پر ظلم بپا ہے
طارق و قاسم نہیں ہیں تو کیا ہوا
آج کا کافر خود کو سمجھتا کیا ہے
غیرت مسلم اگر ہو اُجاگر تو
بھارت، اسرائیل، امریکا کیا ہے

محمد فہد......مظفر گڑھ

دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں
تو کیسے بھلاؤں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
کمبخت!
بھلا نہ پایا وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں
وہ اک خیال جو آواز تک گیا نہیں
وہ اک بات جو میں کہہ نہیں سکی تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

این شاہین......کراچی

تیری عظمت کو سلام

اے سُروں کے بادشاہ مہدی حسن
ترے گیتوں میں
دریا کی روانی

دھڑکتے دلوں کی کہانی
اے سُروں کے بادشاہ، مہدی حسن
تری غزلوں میں
من پیاسے نے پیاس بجھائی
روٹھوں نے بھی تیری مانی
صبح اجلی، شام سہانی
رَت جگوں میں خوش گمانی
اے سُروں کے بادشاہ، مہدی حسن
ترے نغموں میں
اپنے پیاروں کو دلوں کی سب سنانی
دیپ، ستارہ، جگنو، آنکھیں جگمگاتی
یادِ سفر میں زیست بتانی
اے سُروں کے بادشاہ، مہدی حسن
تری گائیکی کی عظمت کو
ہر عہد کا سلام
صبح و شام، ظریف احسن کا سلام

ظریف احسن......کراچی

غزل

لاشوں کا یہ ڈھیر لگا کے
خوش ہوتے ہو خون بہا کے
اونچے محلوں میں رہتے ہیں
ظلم کے سارے ظلم مٹا کے
امن کے ٹھیکیدار بنے ہیں
دولت یہ ناجائز کما کے
انسانوں کے سوداگر یہ
چلتے ہیں بندوق اٹھا کے
حق داروں کو حق ملے کب
بیٹھے ہیں سب آس لگائے
وطن کا پرچم اونچا کردے
رانا اپنی جان لٹا کے

قدیر رانا

غزل

عشق میں قائم کردی مثال میں نے
وفا کے رشتے کو کردیا لازوال میں نے
دل توڑنا پرانی رسم ہے زمانے کی
اس رواج کو کردیا خواب و خیال میں نے
رات بھر وہ تھا میری بانہوں میں جکڑا
بچھا دیا اس پر مدہوشی کا جال میں نے
تیری جدائی میں ہمیں غموں کے سوا کچھ نہ ملا
اب لوٹ آؤ کردیا ہے دیوانوں سا حال میں نے
ڈھونڈنے سے نہیں ملتے وفا نبھانے والے
تیرے عشق کی انتہا میں کردیا کمال میں نے
تیرے پیار میں لٹ گیا بد نصیب مجاہد
تیرے انتظار میں کردیا ایک پل کو سال میں نے

مجاہد ناز عباسی......سنجر پور

غزل

ٹوٹے ساغر کو اچھالو یارو
پیاس اشکوں سے بجھالو یارو
آدمیت کی ہے معراج یہی
گرتے انساں کو سنبھالو یارو
آنے والا ہے کوئی پھر گھر میں
در و دیوار سجا لو یارو
ٹوٹ جائے نہ سکوت صحرا
اپنی آواز دبا لو یارو
وہ ہے ٹھکرایا زمانے کا جمال
تم ہی سینے سے لگالو یارو

سمیع جمال......کراچی

غزل

مدتوں بعد جب واپس آئے گھر اپنے
مشکل سے پھر پہنچ پائے گھر اپنے

بستیاں اجاڑیں جنہوں نے اپنی
کہلائے یہاں پہ وہی رہبر اپنے
اس شہر بے چراغ میں کیا کریں گے
آؤ لوٹ چلیں ہم نگر اپنے
اس بار عجب فصلِ تیار ہوئی
جدا کردیے جسم سے سر اپنے
لوگوں ہوشیار رہو جاگتے رہنا
قاتل پھرتے ہیں شہر شہر اپنے

وسیم اختر......راولپنڈی

غزل

دوست کیا خوب چاہتوں کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پر پھر زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں
یہ ضروری تو نہیں دل جلے اور دھواں نہ ہو
کھا کے چوٹ تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں
کوئی دیتا نہیں ساتھ مشکل لمحات میں کسی کا
دل اداس ہو تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں
جن پر تھا میرے دل کو بہت بھروسا جاوید
وقت پڑنے پر وہی لوگ دغا دیتے ہیں

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی الجھن میں پڑا ہے کب سے
اے کڑی چپ کے در و بام سجانے والے
منتظر کوئی سرِ کوہِ ندا ہے کب سے
چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا
حیران اس کی دیوار پہ کھڑا ہے کب سے
بات کرتا ہوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے
شعبدہ بازئ آئینہ احساس نہ پوچھ
حیرت چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے
دیکھیے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے
شہر پر چھائی ہوئی سرخ گھٹا ہے کب سے
کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم
ورنہ ہر ذرہ تیرا عکس تمنا ہے کب سے
کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے واجد
ڈھونڈتی کس کو سر دشت ہوا ہے کب سے

واجد نگینوی......کراچی

اکھیاں

اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
پہلے دل کا حال کہیں
پھر اپنے بھید بھی کھولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
ان پر گزری جیسی جیسی
بات کریں تو ویسی ویسی
روتے روتے بھی ہنسیں
کبھی ہنستے ہنستے رولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
کاجل کے سنگ بہتے بہتے
تھک جائیں سچ کہتے کہتے
سیج بچھا کر سپنوں کی تب تھوڑی دیر کو سولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں

انتخاب: فقیر محمد بخش صابر لنگاہ......پرانا خانیوال

شکوہ

میں نے تم سے
تمہیں مانگا
تو تم مسکرادیے
تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے
میری جان!

اپنی چیزیں بھی بھلا مانگی جاتی ہیں

صابرہ کلثوم صابر لنگاہ.....خانیوال

غزل

کوئی نئی چوٹ پھر سے کھاؤ اداس لوگو!
کہا تھا کس نے کہ مسکراؤ اداس لوگو!
گزر رہی ہیں گلی سے پھر ماتمی ہوائیں
کواڑ کھولو دیے بجھاؤ اداس لوگو!
جو رات مقتل میں بال کھولے اتر رہی تھی
وہ رات کیسی رہی سناؤ اداس لوگو!
کہاں تلک بام و در چراغاں کیے رکھو گے
بچھڑنے والوں کو بھول جاؤ اداس لوگو!
اجاڑ جنگل، ڈری فضا، ہانپتی ہوائیں
یہیں کہیں بستیاں بساؤ اداس لوگو!

چوہدری سلیم احمد.....خانیوال

غزل

رنج و غم کے بعد ملتی ہے خوشی
دیکھ لی میں نے کتابِ زندگی
ہے بڑا مشکل اسے جانچے کوئی
کس قدر گہرا ہے زخمِ آگہی
مسکرا کر اس نے دیکھا ہے مجھے
کھل اٹھی ہے آرزوؤں کی کلی
ناامیدی کے اندھیروں پر ابھی
آس کی چھانے لگی ہے روشنی
ہم پہ جو تم نے روا رکھا ستم
کیا اسے ہم بھول پائیں گے کبھی
نعمتیں ہیں جس کی بے حد و حساب
کیوں نہ ہم اس کی کریں گے بندگی
اس قدر تم پر عنایت ہے قمر
ہے پسند اللہ کو تیری سادگی

ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

غزل

آنکھوں میں نئے درد سجانے کے نہیں ہیں
اب اور کوئی بوجھ اٹھانے کے نہیں ہیں
ہم کو نہ کسی ایک زمانے کا سمجھنا
ہم لوگ کسی ایک زمانے کے نہیں ہیں
اک عمر لگے گی تجھے یادوں سے نکلتے
آسانی سے ہم لوگ بھلانے کے نہیں ہیں
کہنا کہ منڈیروں سے چراغوں کو اٹھا لے
بچھڑے ہوئے اب لوٹ کے آنے کے نہیں ہیں
ہر بات پہ بچوں کی طرح ضد نہ کیا کر
سب زخم تجھے دل کے دکھانے کے نہیں ہیں
اے دنیا تجھے دور سے آداب ہمارا
درویش تری چال میں آنے کے نہیں ہیں
ہم خانہ بدوشوں سے محبت نہیں کرنا
ہم لوگ کسی ایک ٹھکانے کے نہیں ہیں
خیمے کا دیا آپ بجھائیں نہیں مولا
ہم لوگ کہیں چھوڑ کے جانے کے نہیں ہیں

میثم علی آغا

حسنِ بیاں

اے میرے رب!
مجھے اتنی توفیق دے کہ
میں ہر ایک سے اس طرح پیش آؤں کہ
ساری دنیا میرے مرنے کے بعد
مجھے بھول جائے
مگر میرے حسنِ بیاں کو یاد رکھے!

نامعلوم

ذوقِ آگہی

عفان احمد

فراست کی انتہا

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فراست اور علم کی وسعت سے کون واقف نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو باب العلم کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلی دفعہ عقل و دانش سے ریاضی میں "صفر" کا استعمال کیا جو ناگریز تھا۔ ایک مرتبہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین لوگ حاضر خدمت ہوئے۔ بڑے بے چین لگ رہے تھے۔ اجازت لے کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ حضور ہمارے پاس 17 اونٹ ہیں اور یہ ہم تینوں میں تقسیم ہونے کی وصیت کی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا۔ وصیت میں کس حساب سے ان کی تقسیم کا کہا گیا ہے۔ تینوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ حضرت ہم میں سے ایک کو 1/2 حصہ، دوسرے کو 1/3 اور تیسرے کو 1/9 کے حساب سے اونٹ ملیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ گھبراؤ مت ایسے کرو 17 اونٹ میں ایک فرضی جمع کرلو تو یہ 18 ہوں گے۔ اب 1/2 کو 9 اونٹ ملیں گے۔ 1/3 والے کو 6 اونٹ ملیں گے اور 1/9 والے کو 2 اونٹ ملیں گے تو تمہاری پریشانی دور ہوگئی نا۔ ان کے حصوں کے اونٹ جمع کرو تو 17 ہی بنتے ہیں۔ تینوں آنے والے لوگ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور بے اختیار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ چوم لیے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فہم و فراست اور حاضر دماغی کو سراہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی.....راولپنڈی

عدل کا نظام

عدل کا اہتمام جس معاشرے میں ہوگا وہاں امن وسکون اور اللہ کی طرف سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا تاکہ وہاں کے پھلوں اور فصلوں کا تخمینہ لگا آئیں۔ یہودیوں نے رشوت کی پیش کش کی۔ انہوں نے فرمایا "اللہ کی قسم میں اس کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا ہوں جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہو لیکن اپنے محبوب اور تمہاری دشمنی مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ میں تمہارے معاملے میں انصاف نہ کروں۔"

یہ سن کر انہوں نے کہا۔ "اسی عدل کی وجہ سے آسمان و زمین کا یہ نظام قائم ہے۔"

(تفسیر ابن کثیر)

وسیم اختر.....راولپنڈی

محبت اور عزت کو
کبھی سمجھو نہ ساکن تم
یہ اس جھیل کی مانند ہوتی ہے
جس میں گر پانی نا بڑھے تو
گھٹتا چلا جاتا ہے

ناز سلوش ذشے.....میرپور آزاد کشمیر

خوش قسمت

پھول والا "صاحب یہ پھول اپنی گرل فرینڈ کے لیے لے جائیں۔"
آدمی "میری کوئی گرل فرینڈ نہیں۔"
پھول والا "پھر اپنی منگیتر کے لیے خرید لیں۔"
آدمی "میری کوئی منگیتر نہیں۔"

پھول والا "پھر اپنی بیوی کے لیے لے جائیں۔"
آدمی "میری کوئی بیوی بھی نہیں ہے۔"
پھول والا "اے دنیا کے خوش قسمت انسان! میری طرف سے یہ پھول آپ مفت ہی لے جائیں۔"

عبدالمالک کیف

معلومات کا خزانہ

☆ بنگال کے نوبل انعام یافتہ مصنف رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف "گیتان جلی" ہے۔
☆ مشہور شاعر ریاض خیر آبادی کو اردو کا عمر خیام کہا جاتا ہے۔
☆ مرزا اسد اللہ خان غالب نے کتاب "عود ہندی" اپنے بھانجے کے لیے لکھی تھی۔
☆ اردو زبان کے عہد حاضر کے شاعر ناصر کاظمی کے مجموعے کا نام "برگ نے" ہے۔
☆ مشہور ادیب خلیل جبران کا تعلق لبنان سے تھا۔
☆ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے اپنا ادبی رسالہ شہاب نکالا تھا۔
☆ علامہ راشد الخیری کی تصانیف "صبح زندگی" شام زندگی اور غم زندگی ہیں۔
☆ ہندوستان کی پہلی کابینہ کے وزیر تعلیم کا آبائی وطن کھیم کرن ہے۔
☆ قدیم اور مشہور شاعر محمد ابراہیم ذوق اپنے ہم عصر شاعر داغ دہلوی اور مصنف محمد حسین آزاد کے ادبی استاد تھے۔
☆ مشہور روسی ناول نگار کاؤنٹ ٹالسٹائی کا مشہور ناول وار اینڈ پیس ہے۔
☆ علامہ شبلی نعمانی نے 1914ء میں مشہور کتاب "سیرت النبی" پہلی جلد لکھ کر مکمل کی تھی۔
☆ "سیرۃ النبی" کی بقیہ جلدیں علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھی تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....بلیز کراچی

پھول نے کہا

میں وہ کلمہ ہوں جسے فطرت نے اپنی زبان سے ادا کیا پھر واپس اپنے دل کی تہوں میں چھپالیا اور اس کے بعد دوبارہ ادا کیا۔
میں وہ ستارا ہوں جو نیلے آسمان سے سبز مٹی پر اترا۔
میں عاشق کا تحفہ ہوں۔
میں زندوں کی طرف سے مردوں کی خدمت میں آخری پیش کش ہوں۔
میں شبنم کی مے پیتا ہوں کوئل کے گیت سنتا ہوں اور گھاس کے تختوں پر ناچتا ہوں۔
میں وہ دانائی ہوں جسے انسان نے فراموش کر رکھا ہے۔
لیکن
مجھے انسان سے ایک گلا ہے جب میں اپنی لطافت کھو دیتا ہوں تو مجھے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جاتا ہے کاش مجھے بھی عزت واحترام کے ساتھ اسی زمین میں دبا دیا جاتا جس کی کوکھ سے میں نے جنم لیا ہے۔

ریاض بٹ.....حسن ابدال

ہم اور عداوتوں کے تیر

میں نے جن کا دل کبھی نہیں توڑا وہی لوگ میرے سکھ کے کھلونے توڑ دیتے ہیں نا جانے کیوں ایسا ہوتا ہے ویسے بھی صحراؤں کی پیاس بادلوں کی مجبوری کب ہوتی ہے یا ساحل پر بچھڑی تشنگیاں سمندروں کا مسئلہ تھوڑی ہوتی ہے؟ اور پھولوں کا مسکرانا یا بکھر کر پتیاں بن جانا ہواؤں کی فطرت پر اثر انداز ہوا ہے کبھی یا بچھڑی کونجیں اڑتی ڈاروں کو یاد آئی ہیں کبھی؟ سنو! کسی کی آنکھ کی نمی کبھی کے دل کا دکھ تو نہیں ہو سکتی۔ کبھی جدائیوں کے کسی موڑ پر کھو جاتے ہیں اور تار تار دامن میں الجھے وعدے رہ جاتے ہیں اور پور پور سلگتی جان میں وچھوڑے کا ساڑھ رہ جاتا ہے ویسے بھی خوب صورت پرندے اڑ جائیں تو ان ڈالیوں کو کب دکھتے ہیں جو ان کے جاتے ہی اجڑ گئی ہوں۔ پھر اجاڑنے والے بھول کیوں جاتے ہیں لوٹ کر کیوں نہیں آتے۔ کبھی دریاؤں کے راستوں میں صحرا نہیں ہوتا۔ خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں بکھر جائیں تو کس سے سمٹتی ہیں؟ کوئی کھو جائے تو کب ملتا ہے؟ کوئی چلا جائے تو کب لوٹتا ہے؟ کوئی وعدہ کر کے لوٹ کر نہ آئے تو ڈھلتی شام کو اس سے کیا غرض اور تارے کب سوچتے ہیں کہ انہیں گنتے گنتے کس نے ہجر کی لمبی راتیں آنکھوں میں کاٹ لی ہیں۔ تکلیف دینے والے کہاں پوچھتے ہیں کہ نینوں میں بھرے آنسو کس لیے؟ یادوں کے ناگ ڈسنے سے پہلے کہاں اجازت لیتے ہیں۔ سنو! اب یہ جدائیاں سہی نہیں جاتیں آؤ ہمارے دیدہ دامن سے اپنے اجلے اجلے وعدے چن لو۔ ہمارے ہونٹوں کی مسکان لے جاؤ۔ ہماری دعاؤں کی قبولیت کا مان لے جاؤ۔ ہمارے سکھ لے جاؤ ہماری نیندیں ہمارے خواب لے جاؤ اور نئے سفر پر ہمارے نیک جذبوں کی آشائیں لے جاؤ۔ ہمیں تو تمام تر آسائشوں کے باوجود ذات کی تنہائیاں نہیں چھوڑتی ہیں ہم ہیں اور عداوتوں کے تیر یہ تیرا عزم سفر یہ میرے ہونٹوں کا سکوت اب تو دنیا نہ کہے گی کہ شکایت کی تھی میں سمجھ لوں گا میں نے اک انسان کے عوض اک بے جان ستارے سے محبت کی تھی۔

مجاہد ناز عباسی.....سنجر پور

اخلاص نیت

☆ اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص دل سے ہونی چاہیے ورنہ مغز سے خالی چھلکے سے کیا فائدہ؟ اپنے کو اتنا ہی ظاہر کرو جتنا کہ تم ہو، اگر تم پست قد ہو تو نا سمجھ لوگوں کی نظر میں اونچا دکھانے کے لیے مصنوعی پاؤں کا استعمال نہ کرو۔
☆ دھات اور تانبہ کی چیز پر سونے، چاندی کی ملمع سازی دیکھ کر کوئی ناواقف آدمی تو دھوکا کھا سکتا ہے لیکن اے میرے پیارے عقل مند سنار تو اس کو ضرور پہچان لے گا اور اس کے بدلے میں تمہیں کوئی چیز نہیں دے گا۔
☆ وہ عبادت اور اعمال صالحہ جہنم کے دروازے کی چابیاں ہیں جو لوگوں کی نظر میں اپنے کو اچھا ظاہر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، آج دنیا میں جو آدمی جانی مالی عبادات کی محنت کر کے غیر اللہ کو خوش کر رہا ہے کل قیامت کے دن اس کو خداوند قدوس کی طرف سے کوئی اجر و ثواب ملنے والا نہیں ہے۔
☆ اے صاحب زادے! اگر تو قاسم کے گھر کا کام کرتا ہے تو پھر موسیٰ کے گھر سے اجرت حاصل کرنے کی امید چھوڑ دے، ریاکاری کی عزت سے ذرا بھی خوش مت ہونا اس لیے کہ اس پانی کے نیچے کیچڑ ہے۔
......اے بیٹے! اگر تم دل سے سنو گے تو اخلاص کی یہ نصیحت کافی ہوگی۔ ریاکار عبادت گزار سے وہ گنہگار بہتر ہے جو اللہ کے خوف سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا ہو۔

عبدالنادر انصاری.....کراچی

⌘

سفرِ زندگی

محمد شاہد

تمنائوں کا سفر زندگی کے سمندر میں راستے بدلتا رہتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا. کبھی کبھی جو سفر ہم اپنی طرف سے ختم کرلیتے ہیں وہ پھر سے کسی نئی طرز پر کسی نئے انداز میں شروع کرنا پڑتا ہے یہ ہی زندگی ہے جسے سمجھنا اور پڑھنا اور گزارنا مشکل ہے.
منزل پر پہنچ کر راہ بدل لینے والی ایک دوشیزہ کا احوال' وہ اپنی جھولی میں بھرے دکھ کے کانٹے کسی اور کے دامن میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھی.

"کیا یہ نیٹ صرف آپ کا ہے؟" ارمین نے پوچھا۔
"نہیں یہ تو ISP کا ہے جو ہمیں نیٹ پروائیڈ کرتی ہے، میرا کیسے ہوگیا؟" ارسل نے جواب دیا۔
"میرا مطلب ہے کہ اس کمپیوٹر پر صرف آپ ہی بیٹھ سکتے ہیں کیا؟" ارمین نے لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا۔
"مگر اس طرح تو یہ ٹوٹ جائے گا۔ ارسل نے پریشانی کے عالم میں کہا۔"
"کیا مطلب کیوں ٹوٹ جائے گا؟" ارمین نے حیران ہو کر کہا۔
"اس لیے کہ یہ بیٹھنے والی چیز نہیں۔ اتنا طاقت ور میٹریل تھوڑی لگا ہوتا ہے کہ کوئی بیٹھ سکے۔ بس ہلکی سی کوالٹی کی لوہے کی چادر ہوتی ہے اور کوئی بیٹھے گا تو ٹوٹ ہی جائے گا بے چارہ۔" ارسل نے یوں وضاحت دی جیسے کسی بچے کو سمجھایا جاتا ہے۔
"اف! میرا مطلب ہے کہ یہ کمپیوٹر صرف آپ کا نہیں کہ ہر وقت آپ ہی اس پر براجمان رہیں اور اٹھنے کا نام تک نہ لیں۔" اب ارمین سچ میں غصے سے لال ہوگئی۔
"نام تو اٹھنے کا میں لے لوں کوئی اتنا مشکل کام تو نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم لوگ کتنے ہو استعمال کرنے والے؟" ارسل نے تھوڑی کو پکڑ کر خوب سوچ بچار کے لہجے میں کہا۔
"کیا مطلب کتنے لوگ ہیں میں اکیلی ہوں اور کتنے نظر آرہے ہیں آپ کو؟" ارمین کا پارہ مزید چڑھ گیا، وہ جان چکی تھی کہ ارسل اسے جان بوجھ کر تنگ کر رہا ہے۔
"تو پھر ہم کا لفظ استعمال کرنے کا کیا مقصد ہوا، ایسے کہو نہ کہ تمہیں استعمال کرنا ہے۔" ارسل نے یوں کہا جیسے بہت اہم نکتہ پیش کیا ہو۔
"او کے۔ جو کچھ بھی ہے آپ کی اس بے ہودہ وضاحت کے بعد یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ مجھے ابھی کے ابھی کمپیوٹر چاہیے، وگرنہ میں سچ بول رہی ہوں کہ کوئی چیز مار کے توڑ دوں گی اسے۔" ارمین نے گلا پھاڑ کر تقریباً چیخ کر کہا۔
"ارے بیٹیوں کو اس طرح گھر میں اونچی آواز سے بات نہیں کرنی چاہیے برا شگون ہوتا ہے۔ ارے باپ رے۔" ارسل نے جلدی سے اٹھ کر ارمین کے ہاتھ سے گل دان پکڑا وگرنہ اس کا سر یا پھر کمپیوٹر دونوں میں سے کوئی ایک جان سے جاتا۔
"ارے پیار محبت سے طے کرتے ہیں ناں، میری بہنا، میرے گھر کا گہنا، کمپیوٹر ہی چاہیے ناں! ارے تو لے لو۔" ارسل نے انتہائی پیار بھرے لہجے میں کہا۔
"چلیں جلدی اٹھیے پھر۔" ارمین کا غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
"مجھے صرف پندرہ منٹ دو اور اتنی دیر میں تم ایک کام کرو بھاگ کر جاؤ اور دو کپ چائے یا کافی بنا لاؤ، تب تک میں فری ہو جاؤں گا۔" ارسل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"فری تو آپ ابھی سے ہو رہے ہیں، یہ دو کپ کس خوشی میں چاہیے موصوف کو۔" ارمین نے دانت پیس کر کہا۔
"ارے تم بنا کر لاؤ گی تو تمہارا بھی تو حق بنتا ہے ناں کہ تم بھی پیئو اور ویسے بھی پندرہ منٹ تم کھڑے کھڑے بور ہو جاؤ گی تو سوچا کہ کچھ ایسا ہو کہ تمہیں آسانی ہو جائے انتظار کرنے میں۔" ارسل نے بنا ارمین کی طرف دیکھے جواب دیا، اس کے ہاتھ مسلسل اپنی آسائمنٹ پوری کرنے میں مصروف تھے۔
"دو کپ چائے یا کافی اور پندرہ منٹ، ابھی دیتی ہوں۔" ارمین نے کہا اور ارسل کو لگا کہ واقعی وہ کچن میں گئی ہے مگر اسے تب پتا چلا جب اس کا کمپیوٹر ایک دم سے آف ہوگیا۔
"یہ، یہ کیا کر دیا تم نے پاگل لڑکی، میری اسائنمنٹ تھی اور میں آخری پیج سیو بھی نہیں کر پایا اور تم نے......" ارسل نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر تقریباً رونے کے انداز میں کہا۔ ارمین جانتی تھی کہ بھائی کام سیو کر چکا ہے مگر اتنی جلدی جان چھوٹنے والی نہیں تھی اس لیے ایسا کرنا مجبوری تھی۔
"اسے آن ہوتے ہوتے پندرہ منٹ تو گزر ہی جائیں گے، اس لیے میرا خیال ہے کہ اب چائے کی ضرورت تو نہیں رہی، اگر ہے تو اب یہ کام آپ خود بھی کر سکتے ہیں، تو اب آپ جا سکتے ہیں۔" ارمین نے مسکرا کر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اف! کیا نادر نمونہ بن کر زمین پر اتری ہو تم، حد ہے، پتا نہیں کب جان چھوٹے گی تم سے۔" ارسل نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔
"تب تک جب تک یہاں عورتوں کو آزادی نہیں مل جاتی، عورتوں کے حقوق دبانے کی کوششیں ختم نہیں ہوتیں۔" ارمین بول رہی تھی کہ ارسل نے بات کاٹ کر کہا۔
"بی بی بس کرو، یہ جلسہ پھر کسی دن کر لینا ابھی کمپیوٹر کو استعمال کر لو اس سے پہلے کہ لائٹ چلی جائے۔ جلدی سے جو کرنا ہے کرو مجھے ابھی اسائنمینٹ بھی پوری کرنی ہے۔" ارسل نے مرتا کیا نہ کرتا والی بات پر عمل کرتے ہوئے کہا۔
"جب آپ کمپیوٹر استعمال کر رہے تھے تو میں یہاں تھی؟" ارمین نے الٹا سوال کر دیا۔
"نہیں تم باہر تھیں۔" ارسل نے کہا۔
"تو پھر آپ کو باہر جاتے ہوئے کیا ہوتا ہے؟" ارمین نے کہا۔
"میں اسٹڈی کے لیے استعمال کر رہا تھا تمہاری طرح فیشن ڈیزائننگ کے شوز نہیں دیکھتا ہر وقت۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا۔
"ہاں جانتی ہوں جو اسٹڈی ہوتی ہے، تھوڑا سا کام اور پھر چیٹنگ پر چیٹنگ، کتنا کام کرتے ہو۔" ارمین نے طنز کیا۔
"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا کمپیوٹر۔" ارسل نے پیر پٹختے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔ ارمین ہنس پڑی اور اپنا کام کرنے لگی۔
ارسل اور ارمین دونوں بہن بھائی تھے اور ان کی

نوک جھونک بچوں کی طرح لگی رہتی تھی جبکہ ارسل MBA کررہا تھا اور ارمین گریجویشن کرچکی تھی اور اب اس پروفیشن ڈیزائننگ کا بھوت سوار تھا اتنے بڑے ہوکر بھی ان کو ٹام اینڈ جیری کی طرح رہنا بہت پسند تھا مگر دل میں غصہ اور نفرت بلکل نہیں تھی سب اوپر اوپر سے تھا۔ دونوں بظاہر ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے ایک دوسرے کو مگر حقیقت میں ایک دوسرے کے بنا رہ نہیں سکتے تھے اور یہ بات ان کے والدین اچھی طرح جانتے تھے۔

......☆......☆......

ارسل کے ڈیڈی ملک مجید صاحب اندر داخل ہوئے تو ارسل لیپ ٹاپ پر اپنی اسائنمینٹ بنانے میں مصروف تھا، جیسے ہی اس کی نظر پڑی وہ فوراً کھڑا ہوگیا۔

"ارے بیٹھو بیٹھو، میں بس سونے جارہا تھا تو تمہاری لائیٹ آن دیکھی تو تھوڑی گپ شپ کے لیے چلا آیا، تو کیسی چل رہی ہے تمہاری سٹڈی؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"اچھی جارہی ہے ڈیڈ، بس MBA کے بعد آپ کو بھرپور آرام کرنے کا موقع دوں گا۔" ارسل نے مسکرا کر کہا۔

"پہلے بھی کون سا سارا کام میں کرتا ہوں، تم وقتاً فوقتاً میرا ہاتھ بٹا ہی رہے ہو جو بہت اچھا لگتا ہے، ارسل اکثر لوگ یہ سمجھ کر اپنے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہیں کہ اب انھیں آرام کی ضرورت ہے یا وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب ان سے کام نہیں ہوگا، مگر بیٹے باپ کا جب بھی ہاتھ پکڑو تو اس انداز سے پکڑو کہ ان کو وہ سہارا نہ لگے ورنہ وہ جلد قبر میں اتر جائیں گے، ان کی طاقت بنو ان کا بازو بنو مگر سہارا نہ بنو، جسے بھی سہارے کی عادت پڑی وہ پھر خود سے چلنے کا ہنر کھو دیتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم میری طاقت ہو سہارا نہیں، وگرنہ تم MBA نہ کررہے ہوتے۔" ملک صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"جی ابو جان! بس آپ کی ہی تربیت ہے تو اچھی ہی ہوگی۔" ارسل نے انتہائی سعادت مندی سے جواب دیا۔

"او کے بیٹا، تم اپنا کام کرو، صبح ناشتے پر ملاقات ہوتی ہے گڈ نائٹ اینڈ اللہ حافظ۔" ملک صاحب نے کہا اور چلے گئے۔ مگر دروازہ پھر سے کھلا اور اس بار ارمین اندر آئی۔

"کیا ہوا ڈیڈ کیا کہہ رہے تھے؟" ارمین نے پوچھا۔

"ڈیڈ چاہتے ہیں کہ میں کبھی انہیں یہ احساس نہ دلاؤں کہ آپ بوڑھے ہورہے ہیں یہ ایسا واحد احساس ہے، جس پر کوئی زور نہیں چلتا اور عمر کے روز بروز کم ہوتے دن نفسیاتی طور پر انسان کو کمزور سے کمزور کرتے جاتے ہیں۔" ارسل نے کہا۔

"ہاں، آپ ان کی طاقت ہی بننا سہارا نہیں بھائی۔" ارمین نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، انشاءاللہ۔" ارسل نے کہا۔

"لگی چپٹی باتیں کرکے ڈیڈ کو خوش کردیا۔ انھیں کیا پتا ان کا بیٹا ان کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا، پڑھائی کے بہانے جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے چیٹ سے کوئی کسی کی طاقت نہیں بنتا۔" ارمین نے ایک دم پینترا بدلتے ہوئے کہا، کیوں کہ ایک دوسرے کو زیادہ دیر تک سنجیدہ رکھنے کا رواج رکھا ہی نہیں تھا انھوں نے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں صرف چیٹ کرتا ہوں؟" ارسل نے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اور کون سا تیر مار رہے ہو یہاں بیٹھ کر، پتا نہیں کون سی پڑھائی ہے جو گھر میں بیٹھ کر ہورہی ہے، بھلا نقل مار کر پڑھنے کا کوئی فائدہ ہے، ڈگری مل بھی جائے رہو گے تو جاہل ہی ناں۔" ارمین نے خوب ناک چڑھا کر بات کی تاکہ ذرا وزن پیدا ہوسکے۔

"پتا تمہیں کچھ ہے نہیں اور ٹانگ تم نے ہر جگہ اڑائی ہوتی ہے، جاؤ جا کر دیکھو اپنے غریب فیشن شوز۔" ارسل نے بھی خوب منہ بنا کر جواب دیا۔ انھوں نے حال ہی میں ایک ٹی وی سیریل میں دیکھا تھا محلے کی عورتوں کو لڑتے ہوئے تب سے دونوں کے انداز ہی بدل گئے تھے۔

"کیا؟ غریب فیشن شو کیسے ہوگیا، ارے اتنے پیسے لگتے ہیں اسٹیج تیار ہوتا ہے، کپڑے تیار ہوتے ہیں، ماڈلز کا ارینج ہوتا ہے، سپانسرز آتے ہیں، کیمرا، شوٹنگ اور آپ اسے غریب کہتے ہو۔" ارمین نے حیران ہوکر پوچھا۔

"جتنے پیسے اسٹیج کی ڈیکوریشن پر خرچ کرتے ہیں، ان کا پچاس فیصد بھی پورے کپڑے بنانے پر لگائیں تو ایک مہذب شو ہوتا۔" ارسل نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"ہاں! بھائی یہ بیماری پتا نہیں فیشن کے نام پر کیسے پیدا ہوگئی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اپنی روایات کو سامنے رکھ کر کرنٹ نئے ڈیزائن پیش کیے جاتے جو ہمارے کلچر کی عکاسی کرتے اور ہم فخر سے ہر جگہ ان کو دکھا سکتے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم مغربی اور انڈین کلچر کو دکھانے میں اتنے مگن ہیں کہ اپنے کلچر کا تو ہوش ہی نہیں رہا۔ آپ دیکھنا میں گھر میں بیٹھ کر دوسروں کی طرح صرف باتیں کرکے یا سوسائٹی اور سسٹم کو برا کہہ کر اپنا فرض ادا نہیں کروں گی بلکہ عملی طور پر کچھ اچھا کرکے دکھاؤں گی۔" ارمین نے مثبت لہجے میں اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"اچھا ہے ضرور کرو ویسے بھی یہ غلط ہے وہ غلط ہے ہمیں صرف یہ کہنے کی عادت ہے، اس غلط کو صحیح کرنے کے لیے کوئی آگے نہیں آتا۔" ارسل نے ہمت بندھائی۔

"ہاں بھائی یہ ہی تو اس ملک کا المیہ ہے۔" ارمین نے کہا

"اس ملک کو اچھے لوگوں کی ضرورت ہے مگر معاف کرنا موٹے لوگوں کی نہیں۔" ارمین جو بہت محو ہوکر اپنی تعریف سن رہی تھی ایک جھٹکے سے اٹھی۔

"موٹا کسے کہا آپ نے؟ اتنا بھی نہیں پتا کے اس کو اسمارٹنیس کہتے ہیں، آئے بڑے، ہونہہ۔" ارمین نے گردن کو گھما کر ہونہہ کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہے جو انسان خود سے بھی نہیں کرتا شاید سچ سننے کا یا پھر اسے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اپنے دلوں دماغ کی سوچ اپنے خیالات کا پردہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا آئے اور اٹھائے۔ اپنی ذات کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے ہی شاید دوستوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اسی بہانے ہم وہ بات بھی کرجاتے ہیں جو ہم اپنے بڑوں سے بھی نہیں کرپاتے۔ ارسل رات کو اکثر اپنے دوستوں سے چیٹ کیا کرتا تھا۔ گو کے اس کے زیادہ دوست فی میل ہی تھے کچھ تو مخالف جنس یا ہم پرواز والی بات بھی مگر اکثر چیٹ کا کوئی ٹاپک ہوتا تھا کوئی اشو ہوتا تھا۔ کہتے ہیں اچھائی اور برائی انسان کے اندر ہوتی ہے، خود سے نا تو کوئی برا ہوتا ہے اور نہ ہی اچھا جب تک دیکھنے اور سمجھنے کا نظریہ واضح نہ ہو تب تک ہم اس میں تمیز کرہی نہیں پاتے۔ ابھی چند دن پہلے اس کی ایک اور دوست بنی تھی جس کا نام صائمہ تھا۔ کافی

خاموش طبیعت کی لڑکی تھی بہت ریزرو اور کام سے کام رکھنے والی۔ ارسل بہت حیران ہوتا تھا کہ فی میل میں ابھی ایسی ورائٹی ہے۔

ابھی وہ اپنا کام کر رہا تھا کہ صائمہ آن لائن آ گئی۔

"السلام علیکم، کیسے ہو آپ؟" صائمہ نے پوچھا۔

"وعلیکم السلام، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سناؤ کیسے ہو؟" ارسل نے جواب دیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" صائمہ نے کہا۔

"اور کیا ہو رہا ہے؟" ارسل نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس اپنی میلز چیک کر رہی ہوں۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"کوئی خاص میل آنی تھی کیا؟" ارسل نے پوچھا۔

"خاص میل سے مطلب؟" صائمہ نے کہا۔

"ارے مطلب یہ کہ کوئی خاص میل جو تم چیک کرنے آئی ہو۔" ارسل کا اشارہ اس کے کسی بوائے فرینڈ یا منگیتر سے تھا مگر بات گول مول کر رہا تھا۔ ویسے تو اسے فرینک ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی مگر یہاں بالکل ایک الگ طبیعت کا انسان تھا اس لیے کھل کر نہیں کہنا چاہتا تھا کہ کہیں اسے برا نہ لگے۔ ارسل نے کہا۔

"جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا میری زندگی میں ممکن نہیں۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"کیوں آستانہ بنانے کا ارادہ ہے جہاں لوگوں کو تعویز دھاگے دینے کا پروگرام ہو۔ پھر تو تمہیں اپنا نام صائمہ بنگالن رکھنا چاہیے تاکہ ابھی سے مشہور ہو سکے۔" ارسل نے کہا۔

"جی نہیں ایسا تو کوئی ارادہ نہیں مگر کچھ زندگیوں کے گرد محدود دائرے ہوتے ہیں اور وہی دائرہ ان کی زندگی ہوتا ہے۔" صائمہ نے کہا۔

"ایسا کیوں کہتی ہوں میں نے اکثر نوٹ کیا ہے کہ تمہارا لہجہ بہت تاسف بھرا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں؟" ارسل نے پوچھا۔

"لہجوں کی زبان چیٹ میں کہاں سمجھ آتی ہے، صرف تحریریں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر ہم اپنے ہی آپ میں مفروضے قائم کرتے ہیں جو کبھی غلط اور کبھی صحیح ہو جاتے ہیں۔" صائمہ نے کہا۔

"انسان کی تحریریں اس کے خیالات، اس کی سوچ اور اس کے کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔ تم ان کو صرف تحریر نہیں کہہ سکتیں۔" ارسل نے کہا۔

"زندگی میں درد کی لہریں ہوں تو کردار کے عکس اکثر دکھائی نہیں دیتے۔" صائمہ نے کہا۔

"تم لوگ زندگی کو اتنا منفی کیوں لیتے ہو، زندگی سے اتنا پریشان کیوں رہتے ہو؟ کیوں نہیں سمجھتے کہ زندگی ہنسی اور خوشی کا نام ہے۔ جہاں دکھ ہوگا وہاں خوشی بھی ہوگی یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں ضد ہیں ایک دوسرے کی، سب ہی چاہتے ہیں دکھ کا موسم پل بھر کا ہو اور خوشی کا موسم ہمیشہ کے لیے مقدر بن جائے۔ مگر دونوں کے ساتھ زندگی چلتی ہے۔" ارسل نے کہا۔

"ارسل! زندگی میں جو لوگ سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو سنا ہوگا، پڑھا ہوگا مگر انہیں اس کا احساس نہیں ہو سکتا کہ ان حالات میں جینا کیا ہوتا ہے؟ جن کو گھر کی چار دیواری میں غربت و افلاس اور کسی جرم کے قید و سلاسل ملتی ہے وہاں دکھ اتنے معنی نہیں رکھتے کیوں کے روز کا کام ہوتا ہے وہاں دو پل کی خوشی کو ترسا جاتا ہے اور اس امید میں احساسات زندگی کب دم توڑ جاتے ہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔" صائمہ نے کہا۔

"ایسا کیا ہے جو تمہارے لہجے میں اتنی تلخی ہے زندگی کو لے کر۔ تم چاہو تو شیئر کر سکتی ہو۔ ٹھیک ہے تمہاری ذاتیات ہیں اور شاید میں پوچھ کر بھی نا پاؤں مگر اپنے دل کا غبار نکالو، ہلکا کرو اسے۔ اگر میں ان بھروسے پر پورا نہیں اترتا یا تمہیں ہچکچاہٹ ہوتی ہے تو کسی دوسرے سے کرلو مگر کرو ضرور۔ دل کی بات دل میں رہ جائے تو درد بڑھا دیتی ہے۔" ارسل نے کہا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں پچھلے دو سال سے نیٹ کو یوز کر رہی ہوں اور اس میں اتنا فراڈ اور دھوکا ہے کہ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم میرے اچھے دوست ہو اس میں کوئی شک نہیں مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک گندی چھینٹ پورے پکوان کو خراب کر دیتی ہے اور اسے باہر پھینکنا مجبوری بن جاتا ہے جب کہ وہ بہت لذیذ بھی ہو سکتا ہے۔ برا مت ماننا میری بات کا۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"نہیں تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ نئے رشتوں کا اعتماد چاہتے تھے نئے دوست چاہتے تھے، اس دنیا میں آ کر ایسے تنہا ہوئے کہ اب ان کے لیے ہر محفل بے معنی ہے۔ مجھے قطعی کوئی اعتراض نہیں تم مجھے کیا سمجھتی ہو اور نہ ہی اس پر کہ تمہیں مجھ پر کتنا اعتماد ہے؟ تمہیں جب مجھ پر بھروسہ ہو کہہ دینا، مجھ سے نا ہو سکے تو کسی اور سے کہہ دینا کیونکہ جو کچھ تمھارے دماغ میں چل رہا ہے یہ تمہیں اور تمہاری سوچ کو اندر ہی اندر ختم کر دے گا۔" ارسل نے کہا۔

"ہاں تب کی تب دیکھیں گے فی الحال مجھے اب جانا ہوگا کیونکہ میرے کچھ کام باقی ہیں جو وقت پر نا کیے تو بڑی ڈانٹ سننے کو ملے گی۔ صائمہ نے کہا۔

"تم کرتی کیا ہو کیسے کام؟" ارسل نے پوچھا۔

"پھر بتاؤں گی ابھی دیر ہو جائے گی۔ ابھی مجھے اجازت دو۔" صائمہ نے کہا۔

"کیسے دوں، تم دور بہت ہو اور مجھے تو گھر کا بھی نہیں پتا۔" ارسل نے کہا۔

"کیا مطلب کیا دینا ہے آپ کو؟" صائمہ نے پوچھا۔

"اجازت۔" ارسل نے جواب دیا۔

"اچھا میں چلتی ہوں پھر بات ہوگی بشرط زندگی۔ اللہ حافظ۔" صائمہ نے کہا اور سائن آف کر دیا۔

"ہاں ضرور۔ اللہ حافظ۔" ارسل نے کہا۔

ارسل سوچنے لگا کہ جانے زندگی نے کون سا روپ دکھایا ہے جو صائمہ اس قدر مایوس ہے زندگی سے، پھر اسے لگا کہ آج کل ایسی باتیں ہم دردی حاصل کرنے کے لیے بھی کی جاتی ہیں یہ بھی اس دور کی ایک نفسیات بن چکی ہے کہ بس مجھ سے زیادہ دکھی اور کوئی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی سوچ کو جھٹک دیا کیونکہ جسے چوٹ لگی ہو درد کی شدت وہی جان سکتا ہے۔

☆☆

"میری بہنا تمہیں کب تک پڑے گا سہنا' کہاں ہو؟" ارسل نے گھر آتے ہی ایک لمبی سی صدا لگائی وہ جانتا تھا ارمین جہاں کہیں بھی ہوگی اس تک آواز پہنچ جائے گی۔

"میں ادھر ہوں بھائی، آ گئے کر کے کمائی۔" ارمین بھی آخر اس کی بہن تھی کہاں باز آنے والی تھی۔ اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا جس انداز میں ارسل نے آواز لگائی تھی۔

"ہم لوگ اس لیے کمائی نہیں کرتے کہ تم لوگ گھر میں بیٹھ کر کھا کھا کر غبارہ بنتی رہو اور ہم بے چارے مرد حضرات باہر دھول مٹی کھاتے رہیں۔ کوئی کام وام بھی کیا کرو، ویلی بیٹھی رہتی ہو جب دیکھو۔ دوسرے گھر جانا ہے تمہیں وہ کوئی رونالڈو نہیں جو فٹ بال دیکھ کر خوش ہوگا۔" ارمین کے ہاتھ میں پکوڑوں کی پلیٹ دیکھی اور جس طرح مزے لے لے کر وہ کھا رہی تھی یہ دیکھ کر ارسل کے تو جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔

"اور کچھ میری شان میں کہنا ہے تو کہہ لیں، کیا کہا تھا ابھی کہ کھاتی رہتی ہوں، ویلی رہتی ہوں اور کچھ۔" ارمین بھی اب غصہ میں آ گئی تھی اور ارسل اسے تپانا ہی چاہتا تھا۔

"نہیں نہیں تم کہاں غبارہ بن رہی ہو میں نے تو ساتھ والی ہمسائی کی بیٹی کو کہہ رہا تھا اور تم کہاں اتنا کھاتی ہو تم تو صرف چکھتی ہو کھاتے تو باقی گھر والے ہیں۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا۔

"اوہ! اچھا پھر ٹھیک ہے۔ میں سمجھی میری بات کر رہے تھے آپ۔ ویسے ساتھ والی ہمسائی کو کب سے جانتے ہو؟" ارمین نے ایسے بھویں اچکا کر پوچھا جیسے سچ میں ایسا کچھ ہے۔

"کوئی چکر نہیں اور اگر ہوتا بھی تو کیوں بتاؤ تمہیں تم لگتی کیا ہو میری؟" ارسل کو لڑائی سے زیادہ پکوڑوں کی فکر تھی جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے۔

"آپ کو نہیں پتا میں کیا لگتی ہوں آپ کی۔ لگتا ہے کوئی چوٹ لگی ہے جس نے سیدھا دماغ پر اثر کیا ہے۔ ہائے میرا اکلوتا بھائی۔" ارمین نے ایک دم سے بین ڈالنا شروع کر دیا۔

ارسل نے پیر پٹخ کر ہونہہ کہا اور اپنے کمرے کی طرف مسکرا کر چل دیا وہ جانتا تھا آج باگیں اس کے ہاتھ میں ہیں تو اس نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

"بھائی سنو تو کہاں چل دیے۔ ارے ایک بڑی

ضروری خبر دینی تھی آپ کو۔ ارے رکو تو۔" ارمین نے آوازیں دیں مگر ارسل نہیں رکا۔ وہ جانتا تھا پھر سے اس کے شیطانی دماغ میں کوئی نئی بات آئی ہوگی۔

"ارے میں تو آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ خالہ جان بنفس نفیس عزت بخش رہی ہیں ہمارے ڈرائنگ روم کو۔" ارمین نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا جیسے اسے بہت مزا آ رہا ہو اور ارسل دروازے سے یوں نمودار ہوا جیسے اندر آگ لگی ہو یا بوتل سے جن۔

"کیا! خالہ آئی ہیں، وہ بھی اہم کام سے۔ ارے باپ رے۔ اللہ پاک میری مدد فرما۔ مم میں آیا، تم ایسا کرو ان کی باتیں سنو۔ امی اور خالہ کیا بات کر رہی ہیں۔ جلدی کرو جاؤ۔" ارسل نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور واقعی صرف پانچ منٹ میں وہ باہر تھا۔

"کیا بات ہوئی ابھی تک؟" ارسل نے شرٹ کے بٹن بند کرتے کرتے پوچھا۔

"ارے ایسے ہی منہ اٹھا کر چلے جاؤ گے۔ ذرا کنگھی شنگھی کرو۔ آفٹر آل خالہ جان آئی ہیں۔" ارمین نے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے کہا۔

"ارمین کی بچی میں سچ مچ غصے میں ہوں۔ ہٹ جاؤ اور یہ بتاؤ بات کیا ہو رہی ہے؟ دفع کرو بالوں کو۔" ارسل نے ارمین کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ارے خالہ ہی آئی ہیں کوئی جن تو نہیں نکل آیا اور ویسے بھی مجھے کسی کی باتیں سننے کی عادت نہیں۔ میں تو بس اس لیے کھڑی تھی کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ آج مال پلازہ میں ایک بڑا ہی کمال کا سوٹ دیکھا ہے میں نے، بس یہی کوئی سات یا آٹھ ہزار کا ہوگا۔" ارمین نے یوں خوش ہو کر بتایا جیسے چالیس پچاس روپے کی بات ہو۔

"کیا؟ سات آٹھ ہزار۔" ارسل کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

"منہ تو بند کرو کوئی سات لاکھ تو نہیں کہہ دیے۔" ارمین نے منہ بنا کر کہا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا تم بنا رشوت کچھ نہیں بتانے والی۔" ارسل نے کہا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ ارمین نے بازوؤں سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔

"کیا کہا رشوت۔ پورے دس منٹ کھڑے ہو کر باتیں سنی ہیں وہ بھی صرف آپ کے لیے۔ ٹانگیں تھک گئیں میری کھڑے ہو کر اور آپ میری محنت کو رشوت کہتے ہو۔ شرم آنی چاہیے آپ کو اپنی معصوم بہن پر الزام لگاتے ہوئے۔" ارمین نے باقاعدہ تقریر کر ڈالی۔

"اف! کیا چن کے نصیب پایا ہے میں نے۔" ارسل نے ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر کہا۔

"جی! آپ واقعی میں قسمت والے ہیں۔ عقل مند بہن جو ملی۔" ارمین نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ عقل مندی کی حد بے وقوفی پر ختم ہوتی ہے اور تم اس حد کو کب کی پار کر چکی ہو۔" ارسل نے کہا مگر اس کے کان مسلسل اندر ہونے والی باتوں پر لگے تھے۔

"دیکھو بھائی ساس بہو کا سیریل نہ شروع کرو، سوٹ لے کر دینا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جاؤ خود سن لو جا کر۔" ارمین نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"اچھا لے دوں گا۔ اب تو بتاؤ بات کیا ہوئی؟" ارسل نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ وہ ہی پچھلی بار کی طرح رشتے کے لیے آئی ہیں اور امی نے پھر سے آپ پر ہی چھوڑ رکھا ہے۔ ابھی چونکہ صرف تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے آئے ہوئے اس لیے اطلاعات یہ ہی ہیں فی الحال۔"

رمین نے یوں کہا جیسے وکی لیکس کی خبر ہو۔

"یہ تو سب پرانی باتیں ہیں اس میں تم نے کون سا کمال کیا؟ سوٹ کینسل۔" ارسل نے کہا اور جلدی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

"السلام علیکم خالہ جان!" ارسل نے سلام کیا اور ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسے ہو؟" خالہ نے پوچھا۔

"جی میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں کیسی ہیں اور گھر میں سب کیسے ہیں؟" ارسل نے پوچھا۔

"بیٹا! شکر ہے پروردگار کا سب ٹھیک ہے۔ تم سناؤ پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری؟" خالہ نے پوچھا۔

"جی خالہ! آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہے۔" ارسل نے کہا۔

"سب ٹھیک کہاں جا رہا ہے خالہ! بہت پریشان ہیں بھائی۔ جب آفس سے آتے ہیں تو میں یا امی دونوں میں سے کوئی ہو تو چائے پانی مل جاتا ہے وگرنہ یہ ہوتے ہیں اور ان کی تنہائی۔" ارمین ارسل کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ لہجہ انتہائی افسردہ تھا جس پر ارسل نے گھور کر دیکھا۔

"ہائے بیٹا! ایسا کیوں؟ شمیم کب سے کہہ رہی ہوں تمہیں کہ اب ارسل کی شادی کر دو۔ ماشاء اللہ سے جوان ہو گیا ہے۔ باپ کے ساتھ کاروبار بھی دیکھتا ہے۔ پڑھائی بھی کر لی تو اب کر دو شادی یہ بھی تھوڑا سکھی ہو جائے۔ دیکھو کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا ہونا چاہیے۔" خالہ نے ارسل کی طرف دیکھ کر انتہائی فکرمندی سے کہا۔

"ارے آپا! میں تو کب سے کہہ رہی ہوں مگر یہ لڑکا کسی کی مانے تب نا۔ جب کہو تو کہہ دیتا ہے کہ ابھی پڑھائی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی موڈ نہیں ابھی یہ ابھی وہ۔" شمیم بیگم نے کہا۔

"بیٹا! کیا ہو گیا ہے تجھے؟ ابھی سے شادی کر لے گا تو کل کو اولاد جلدی تیرا سہارا بنے گی اور یہی تو عمر ہے شادی کی۔ ابھی نہیں کرو گے بھلا کب کرو گے۔" خالہ نے ارسل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"خالہ! ابھی عمر ہی کیا ہے بھائی کی۔ جب پوچھو تو بیس سال بتاتے ہیں۔ عمر آگے بڑھے گی تو شادی کے لیے ہاں کریں گے نا۔ میرا تو خیال ہے کسی ہندو دیوداسی کی طرح باقی ماندہ زندگی پوجا پاٹ میں گزارنے کا ارادہ ہے بھائی کا۔" ارمین کا سوٹ کینسل ہوا تھا تو اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا تو بات بے بات بول رہی تھی۔

"ارمین! خاموش رہو۔ بڑے بات کر رہے ہوں تو نہیں بولتے۔" شمیم بیگم نے ڈانٹ کر کہا۔

"اتنی عقل ہوتی تو لے نہ جاتے جن کی امانت ہے۔" ارسل کو بھی موقع مل گیا بات کرنے کا۔

"بس انتظار کر رہے ہیں کہ بیس سال سے بڑھ کر میرا بھائی اتنا بڑا ہو جائے کہ اپنی بہن کو وداع کر سکے۔" ارمین کہاں خاموش رہنے والی تھی۔

"بیٹا! اتنا نہیں بولتے وگرنہ سسرال میں جا کر بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اللہ نا کرے۔ تم لڑکی ہو تمھارے منہ سے تو صرف ہاں جی اور نہیں جی ہونا چاہیے بس۔" خالہ نے ارمین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ان کی زبان جب تک چار گھروں کے قصیدے نہ پڑھ لے سکون نہیں ملتا۔" ارسل نے بھی خالہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور ارمین کا منہ پھول گیا۔

"ارے چھوڑو بیٹا! یہ بتاؤ کیا سوچا پھر تم نے شادی کا۔" خالہ دوبارہ سے متوجہ ہوئی ارسل کی طرف۔

"خالہ! شادی کے بعد پڑھائی نہیں کر پاؤں گا۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔" ارسل نے اتنا کہا اور فون آیا ہے کا بہانہ کر کے باہر آ گیا۔

"اگر شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں تو شادی اگلے سال رکھ لو مگر منگنی تو کر دو نا شمیم۔ میں کب تک تم لوگوں کی آس پر جمیلہ کو گھر بٹھا کر رکھوں گی۔" خالہ نے شمیم بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپا! اولاد جب بڑی ہو جائے تو ان پر زور زبردستی نہیں چلتی اور ویسے بھی یہ عمر بھر کے فیصلے ہیں میں ضد سے نہیں رضامندی سے سلجھانا چاہتی ہوں وگرنہ دونوں کے لیے کل کو نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔" شمیم بیگم نے کہا۔

"دیکھو شمیم! بات سیدھی کرو۔ کہہ دو کہ تمہیں یہ رشتا منظور نہیں بات کو اتنا گھما پھرا کر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ٹھیک ہے تم لوگ پیسے والے ہو گئے ہو مجید کا کاروبار چل نکلا ہے مگر ہم بھی کوئی چھوٹے لوگ نہیں۔ اچھی خاصی زمین، جائیداد ہے اور اچھا خاصا جہیز بنا رکھا ہے میں نے اپنی بیٹی کے لیے۔" خالہ نے غصے سے منہ بنا کر کہا۔

"ارے ناہید آپا! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ بس میں نہیں چاہتی کہ ارسل کو اس بات کے لیے زبردستی منایا جائے۔ وہ یہ فیصلہ خود سے کرے تا کہ آنے والی زندگی لڑائی جھگڑوں سے پاک رہے۔" شمیم بیگم نے کہا۔

"دو سال ہونے کو آئے یہ سن رہی ہوں۔ تمہیں یاں تمھارے بیٹے کو منظور نہیں تو بتا دو۔ دو اور اچھے رشتے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر چلی آئی کہ گھر کی بات ہے گھر ہی میں رہے تو اچھا ہے۔" ناہید بیگم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"آپا میں تو خود یہ چاہتی ہوں کہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے مگر...... اچھا آپ فکر نہ کریں میں آج ارسل کے ابو سے بات کرتی ہوں۔" شمیم بیگم نے بڑی بہن کا موڈ اچھا کرنے کے لیے کہا۔

"میں چلتی ہوں۔ میرا سلام دینا مجید بھائی صاحب کو اور تم لوگ مشورہ کر کے آج فائنل جواب دو میں مزید بدمزگی نہیں چاہتی۔" ناہید بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"امی مجھے لگتا ہے اس بار آپ کو بھائی سے فل اینڈ فائنل بات کر لینی چاہیے۔ خالہ کے ساتھ اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کو جمیلہ اچھی لگتی ہے ٹھیک ہے مگر ارسل بھائی نہیں مان رہے تو سیدھی طرح جواب دیں تا کہ وہ بھی کچھ اور سوچنے پر تیار ہوں۔ مگر یہ صحیح نہیں لگ رہا۔ آپ کے نواب صاحب ہیں نہیں مان رہے تو کب تک بات کو لٹکا کے رکھیں گی۔" ارمین نے کہا۔

"جس طرح آج ناہید آپا بول کر گئی ہیں اسے دیکھ کر کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں تو صرف اس لیے ٹال رہی تھی کہ چلو آج نہیں کل ارسل مان ہی جائے گا، مگر کیا پتا تھا یہ سب ہو گا۔ کہاں ہے ارسل بلاؤ اسے ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔" شمیم بیگم کے لہجے میں غصہ عود کر آیا تھا۔

"نہیں ابھی نہیں رات کو ابو بھی ہوں گے کھانے کے بعد آپ بات کرنا۔" شمیم بیگم غصے میں آ رہی تھیں اور ارمین جانتی تھی کہ اس حالت میں امی سے بات نہیں ہونی بلکہ حکم ہو گا جب کہ رات تک امی کا غصہ اتر چکا ہو گا اور ابو بھی ہوں گے تو بات خوش گوار ماحول میں ہو سکتی ہے۔ شمیم بیگم نے بہر حال ارادہ کر لیا تھا کہ آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔

......☆......☆......

"ارسل! بیٹا ادھر آؤ۔" شمیم بیگم نے کھانے کے بعد ارسل کو ڈرائنگ روم میں بلایا جہاں ملک مجید پہلے سے موجود تھے۔

"جی امی! آیا۔" اور تھوڑی دیر تک شمیم ارمین اور ارسل بھی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"بھئی کیا بات ہے آج تو سب کو ایسے بلا رکھا ہے جیسے تمہارے خلاف عدم اعتماد کی درخواست دائر کر دی گئی ہو اور تمہیں اعتماد کا ووٹ کے لیے ہم سب کو قائل کرنا ہے۔" ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ڈیڈ! آج امی کی کابینہ میں ایک انتہائی اہم بل پاس ہونا ہے اس کے لیے ہنگامی بنیادوں پر یہ اجلاس بلایا گیا ہے۔" شمیم بیگم کا موڈ صحیح نہیں تھا اس لیے ارمین نے دبی دبی آواز میں ملک صاحب کے کان میں کہا۔

"کیا مطلب؟" ملک صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

ابھی پتا چل جائے گا ڈیڈ!" ارمین نے کہا۔

"آج ناہید آپا آئی تھیں اور بڑے غصے سے بول کر گئی ہیں کہ انھیں ہر صورت میں آج جمیلہ اور ارسل کے لیے فائنل جواب چاہیے۔" شمیم بیگم نے آج کی میٹنگ کا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ارسل! بیٹا تم جانتے ہو پچھلے دو سال سے وہ جمیلہ کے لیے کہہ رہی ہیں تم آج ہاں یا نا میں جواب دو۔ آخر تمہیں اعتراض کیا ہے۔ اس طرح سے گھر کی بیٹیاں باہر جانے لگیں تو دکھ ہوتا ہے۔ دیکھو تمہیں مجبور نہیں کیا جا رہا مگر جمیلہ گھڑ ہے سلیقہ شعار ہے پھر ایسا کیا ہے جو تمہیں منظور نہیں۔" شمیم بیگم نے پیار سے پوچھا۔

"امی! اس میں کوئی برائی نہیں اور نہ ہی مجھے اس رشتے سے اختلاف ہے مگر میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میرا ابھی MBA اسٹارٹ ہوا ہے مجھے ابھی بزنس کا صحیح طرح پتا نہیں۔ میں چاہتا ہوں جب میں کوئی ذمہ داری سنبھالوں تو کم از کم اپنی طرف سے اپنی ذمہ داریاں پوری ہوں۔ یہ کھیل نہیں پوری زندگی کا سوال ہے۔" ارسل نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"ارسل! بیٹا بات تمہاری اچھی ہے مگر پکی بات ہے نا کرنے کی وجہ یہ ہی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر تمہیں کوئی اور پسند ہے یا کوئی نظر میں ہے تو بتاؤ۔" ملک صاحب نے پوچھا۔

"نہیں ڈیڈ! ایسا کچھ نہیں۔" ارسل نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی مگر بعد میں یہ رشتہ تو نہیں رہے گا اور شاید میری بہن بھی مجھے چھوڑ دے۔" شمیم بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"امی جان! جو لوگ صرف رشتہ نہ ہونے کی وجہ بنا کر برسوں کے رشتے توڑنے پر تیار ہو جائیں میرا نہیں خیال کہ وہ رشتہ داری کہ بھی لائق ہیں۔ آپ خود بتائیں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک رشتہ نہیں ہوا تو آپ اپنے خون کے رشتوں سے منہ موڑ جائیں۔ اتنی سنگ دلانہ سوچ کیسے ہو سکتی ہے۔" ارسل نے کہا۔

"بیٹا! پرانے لوگوں میں یہ سوچ ہوتی ہے ان کی عزت ان کی زبان اور ان کا اپنوں پر بڑا مان ہوتا ہے اور مان جب ٹوٹتا ہے تو دکھ ہوتا ہے۔" ملک صاحب نے کہا۔

"ڈیڈ! ان کی عزت ان کا بھرم سر آنکھوں پر مگر ایک بات کے انکار پر اتنا سخت رویہ کس لیے؟ فرض کریں آج میں ہاں کر دیتا ہوں مگر جس رشتے کو میں دل سے اپنانے کے لیے تیار نہیں کیا میں اس رشتے سے انصاف کر پاؤں گا۔ کیا یہ صحیح ہو گا جن دونوں کو زندگی ایک ساتھ گزارنے کے عہد میں جوڑا جا رہا ہے ان میں سے کوئی ایک راضی نا ہو تو کیا یہ رشتہ چل پائے گا؟ آپ کو لگتا ہے کہ چل پائے گا تو میں تیار ہوں۔" ارسل نے شمیم بیگم اور مجید صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں بیٹا! نہیں چل پائے گا۔ ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی دلیلوں سے تمہارے فیصلے کو تبدیل کروں۔ تم اب بچے نہیں کہ تمہیں بتایا جائے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط مگر بیٹا! بس اتنا یاد رکھنا کہ اپنے خواب اتنے رکھنا جتنی زندگی اجازت دے ورگرنہ خواب پورا کرتے کرتے کہیں زندگی ادھوری نہ رہ جائے۔" شمیم بیگم نے پیار سے ارسل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں امی جان! میرے خواب اتنے نہیں کہ زندگی ان کا بوجھ نہ اٹھا پائے۔ انشاء اللہ وہ جلد پورے ہوں گے اور آپ کی ہی مرضی سے آپ کی خوشی سے اس رشتے میں بندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا مگر کچھ وقت دیجیے۔" ارسل نے شمیم بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا! تمہاری زندگی ہے فیصلے بھی تمہارے اپنے ہونے چاہئیں ہم تو بس مشورہ دے سکتے ہیں یا اپنی زندگی کا تجربہ تمہارے سامنے رکھ سکتے ہیں تاکہ تم ان سے کچھ سیکھ سکو۔ ستائیس سال کی عمر میں اتنی عقل اور شعور پیدا ہو چکا ہے کہ تم خود سے فیصلے کر سکو۔" ملک صاحب نے کہا۔

"شکریہ ڈیڈ! مگر یہ سب آپ کی اور امی جان کی تربیت ہے۔ آپ کے ہی فیصلوں کی وجہ سے آج ہم کچھ ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بھروسے کو ہمیشہ قائم رکھوں گا۔" ارسل نے کہا۔

"ویسے بھی میں چاہتا ہوں کہ اس چڑیل کی شادی پہلے ہو جائے ورگرنہ میری ہونے والی بیوی بھی میری طرح اس کے ظلم برداشت کرے گی اور میں اپنی بیوی سے ایسا سلوک کبھی برداشت نہیں کروں گا۔" ارسل نے ارمین کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"آہاہاہاہا! آئی ہے نہیں اور طرف داری شروع بھی ہو گئی۔ چڑیل ہو گی آپ کی بیوی۔ ہمیں تو لوگ پری کہہ کر بلاتے ہیں۔" ارمین نے سر اونچا کر کے فخر سے کہا۔

"ڈیڈ! اس سے پوچھیے ذرا کون لوگ ہیں جو اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔" ارسل نے بغور ارمین کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مم مم میرا مطلب ہے میری سہیلیاں مجھے پری کہتی ہیں۔" ارمین نے بوکھلا کر جواب دیا۔

ارمین اپنے چچازاد کو پسند کرتی تھی اور اس کا رشتہ اپنے چچازاد سے طے ہو چکا تھا۔ دونوں گھرانے بھی اس رشتے سے خوش تھے اور ارمین کا منگیتر اسے پری کہتا تھا۔ ارمین کے منہ سے بے دھیانی میں یہ جملہ نکل گیا تو ارسل نے بات پکڑ لی۔

"ایک عورت دوسری عورت کی تعریف کر رہی ہے یقین نہیں آ رہا اور اگر کہہ بھی دیا تو تم نے ان کی بات پر یقین کیسے کر لیا جب کہ روز تم خود کو آئینے میں دیکھتی ہو۔" ارسل نے پھر سے ٹانگ کھینچی۔

"یہ اپنی جیسی احمقانہ فلاسفی اپنے پاس رکھو۔ ہم تم مردوں کی طرح نہیں جو پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اور ہوں۔" ارمین نے چڑ کر کہا۔

"باپ رے! اس نے تو آپ کو بھی اس میں شامل کر لیا ڈیڈ دیکھیں ذرا کیا کہہ رہی ہے۔" ارسل نے عورتوں کے انداز میں منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"امی! دیکھو نا بھائی۔ آپ کچھ کہتی نہیں بس سنتی

رہتی ہیں۔" ارمین نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔
"مت ستایا کرو یار اتنا اپنی بہن کو۔" ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کچھ ہی دنوں کے لیے تو ہے ڈیڈ! پھر کس کو تنگ کروں گا میں۔" ارسل نے بظاہر مسکرا کر کہا مگر لہجے میں کچھ افسردگی تھی۔

☆......☆......

ارسل نے رات کو اپنا لیپ ٹاپ آن کیا تو صائمہ آن لائن تھی۔ ارسل نے جلدی سے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ؟" صائمہ نے پوچھا۔
"میں ٹھیک ٹھاک تم سناؤ کیسی ہو؟" ارسل نے جواب دیا
"ویسی ہی جیسی کل تھی۔" صائمہ نے کہا۔
"یعنی منہ پر اب بھی بارہ ہی بجے ہیں۔ ارے چوبیس گھنٹے میں لوگوں کی دنیا بدل جاتی ہے تم ابھی تک وہی کی وہی ہو۔" ارسل نے کہا۔
"بس دیکھ لیں۔" صائمہ نے کہا۔
"تم فلمیں دیکھتی ہو؟" ارسل نے پوچھا۔
"نہیں، فلموں کا زندگی کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" صائمہ نے جواب دیا۔
"کیا مطلب اس میں زندگی کہاں سے آ گئی؟" ارسل نے پوچھا۔
"یہاں لکھنے والے کے پاس پورا اختیار ہوتا ہے جب کہ زندگی میں یہ اختیار تقدیر کے پاس ہوتا ہے۔ فلمیں حقیقت سے دور کرتی ہیں۔" صائمہ نے جواب دیا۔
"صائمہ! تمہیں پتا ہے قسمت اور تقدیر میں کیا فرق ہوتا ہے؟" ارسل نے پوچھا۔
"ہاں! اتنا ہی جتنی ہماری خواہش اور اختیار میں ہوتا ہے۔" صائمہ نے جواب دیا۔
"شاید مگر تقدیر تمہاری زندگی کے حادثات کا نام ہے اور قسمت تم اپنی خود بناتے ہو جسے مرنا تمہاری تقدیر ہے تم چاہو تو ابھی مر جاؤ۔ تقدیر لکھی جا چکی اس سے کوئی منہ نہیں موڑتا' کوئی انکار نہیں کرتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود سے کچھ نہ کرو۔ جہاں تقدیر کا سبق ملتا ہے وہاں تدبیر کی تلقین بھی کی جاتی ہے اور تدبیر سے جو بھی حاصل وصول ہو وہ ہماری تقدیر کا حصہ ہے۔" ارسل نے کہا۔
"کتنی اچھی لگتی ہیں نہ یہ کتابی باتیں، بولنا اور سمجھانا' مگر جن لوگوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہو ان کے لیے تقدیر اور تدبیر کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔" صائمہ نے کہا۔
"کیا دیکھا تم نے زندگی میں؟ کیوں اتنے بلند و بانگ دعوے کرتی ہو؟ کیوں اتنی مایوسی کی فضا قائم کر رکھی ہے تم نے کہ خوشی کا جھونکا آتے ہی دم توڑ جاتا ہے۔ کیوں صائمہ کیوں؟ آج یا تو بتا کر جاؤ یا پھر دوبارہ ایسی باتیں نہ کرنا۔ پتا نہیں تم گلاس آدھا خالی دیکھتی ہو جب کہ وہ آدھا بھرا ہوا بھی تو ہے۔" ارسل کو سچ میں غصہ آ رہا تھا۔
"ہاں! صحیح کہا تم نے۔ اوکے اب نہیں کروں گی۔ میں کرتی بھی نہیں خود سے ہو جاتی ہیں۔" صائمہ نے کہا۔
"کچھ سیاق وسباق تو بتاؤ میں بھی جان سکوں کہ آخر زندگی کو کتنے قریب سے دیکھا ہے؟" ارسل نے کہا۔
"ارسل! میری ٹائپنگ کی سپیڈ نہیں کہ میں اپنی سرگزشت سنا سکوں۔" صائمہ نے کہا۔
"ایک بات کہوں تم سے؟" ارسل نے کہا
"جی کہیں۔" صائمہ نے کہا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم شاید سمجھو کہ میں بھی دوسروں کی طرح نکلا مگر میں تم سے تمہارے لیے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہاری زندگی کے لیے' تمہاری سوچ کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کرنا۔ میں جاننا چاہتا ہوں زندگی کی وہ تلخی جو تمہیں آج بھی اپنی بانہوں میں جکڑے ہوئے ہے۔ میں اس سے آزادی کے لیے تمہارے ساتھ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔" ارسل نے کہا۔
"نہیں میں آپ کو ان جیسا تو خیر خیال نہیں کر سکتی کیوں کہ پچھلے چھ مہینوں سے جانتی ہوں آپ کو مگر مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔" صائمہ نے کہا۔
"اوہ! کیا اتنی سختی ہے گھر والوں کی؟" ارسل حیران تھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ارسل نے کہا۔
"جی! گھر سے جانے والوں پر سختی ہے مگر گھر آنے والوں پر سختی نہیں۔ صائمہ نے کہا۔
"کیا مطلب' میں سمجھا نہیں؟" ارسل نے پوچھا۔
"میں ایک اولڈ ایج ہوم یا جسے نرسنگ ہوم بھی کہتے ہیں وہاں رہتی ہوں۔" صائمہ نے جواب دیا۔ ارسل کو یہ سن کر دھچکا سا لگا۔
"دیکھو ایسا مذاق نہیں کرتے بری بات ہے۔" ارسل نے کہا۔
"میں مذاق نہیں کر رہی' میں سچ میں وہیں رہتی ہوں۔ کیوں بری بات ہے؟" صائمہ نے کہا۔
"نہیں بری بات نہیں۔ ایڈریس بتاؤ۔" ارسل نے جان بوجھ کر اس کے گھر کی یا اس کی فیملی کی بات نہیں کی تھی۔ کیوں کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔ صائمہ نے اسے ایڈریس لکھوا دیا۔ چوں کہ دونوں ایک ہی شہر سے تھے تو ارسل نے سوچا کہ اب وہ ضرور جان جائے گا کہ کیا حقیقت ہے اور اگر یہ سب فراڈ ہوا تو خوب سنا کر آئے گا۔ ارسل نے کہا۔
"سنڈے کو آنا اس دن کافی لوگ آتے ہیں اپنے اپنے والدین سے ملنے کے لیے۔" صائمہ نے کہا۔
ارسل نے ہامی بھر لی اور پھر دونوں نے مزید کوئی بات کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو گڈ بائے کہا اور صائمہ بھی آف لائن ہو گئی اور ارسل نے بھی سائن آوٹ کر دیا۔

☆......☆......

"بھائی مجھے ماڈل کالونی تک ڈراپ کر دو۔ شمائلہ سے ملنے جانا ہے بڑا ضروری کام ہے۔" ارسل آج صائمہ سے ملنے جا رہا تھا مگر ارمین کی فرمائش راستے میں ہی پڑ گئی۔
"ارے یہ لو نا دو سو روپے اور رکشہ سے چلی جاؤ۔" ارسل نے کہا۔
"تو یہ احسان عظیم آپ اپنی جان پر کیوں نہیں کرتے۔ چابی مجھے دیں اور یہ لے پانچ سو میری طرف سے اور آپ چلیں جائیں۔" ارمین کو غصہ آ گیا۔
"نہیں شہزادوں کی توہین ہوتی ہے اس طرح۔" ارسل نے سر اونچا کر کے کالر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو بھائی! تم کتنے اچھے ہو رات کو پالک گوشت بنا کر کھلاؤں گی قسم سے۔" ارمین کو پتا تھا لڑتے لڑتے شام ہو جاتی ہے اور وہ واقعی جلدی میں تھی تو اس نے صلح جو طریقہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔
"وعدہ کرو پہلے۔" ارسل نے جھٹ سے کہا کیوں کہ یہ اس کی پسندیدہ ڈش تھی۔
"ہاں وعدہ۔" ارمین نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ سوٹ بھی کینسل جو اس دن تم نے زبردستی مجھ پر تھوپا تھا۔" ارسل نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو، مگر۔ اچھا کینسل۔" ارمین نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"اوکے ویری گڈ۔ تو آجاؤ پھر دیر کس بات کی ہے۔" ارسل نے تقریباً خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ اور ارمین بنا کچھ بولے بیٹھ گئی۔ ارسل حیران تھا کہ آج ارمین اتنے پیار سے سب کیسے مان گئی اور پھر پالک گوشت کی آفر بھی کر دی۔

ارسل نے ارمین کو ماڈل کالونی ڈراپ کیا اور اولڈ ایج ہوم پہنچا اس نے گاڑی پارکنگ میں لگا کر گارڈ سے ایڈمن کا آفس پوچھا اور پھر شکریہ کہہ کر وہ گارڈ کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا۔ کوئی دو کنال کے قریب یہ ہاسٹل نما بنگلا تھا جہاں تقریباً ایک کنال میں رہائش اور ایک کنال میں لان نما گراؤنڈ تھا جہاں کچھ لوگ اپنے ماں باپ سے ملنے آئے تھے اور کچھ بچارے اولاد کی ستم ظریفی کا شکار تھے اور تنہا ہی دھوپ اور کھلی ہوا سے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش میں مگن تھے۔

ارسل یہ منظر دیکھ کر بہت اپ سیٹ ہو گیا اس کا دل بھر آیا کہ کیسے بدبخت اور بدنصیب ہوں گے وہ لوگ جن کے لیے ماں باپ جیسا انمول اور قیمتی سرمایہ کوئی معنی کوئی حثیت نہیں رکھتا۔ ارسل یہ سب دیکھتا ہوا آفس میں پہنچا تو سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی اور اس کے دوسری جانب شاید انچارج کا کمرہ تھا۔

"السلام علیکم۔" ارسل نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام، جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟" لڑکی نے پوچھا۔

ارسل سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے تو جلدی میں پوچھا ہی نہیں کہ وہ آ کر کیا کہے گا تو ملاقات ہو سکتی ہے اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"جی میرے دوست ہیں ان کے والد صاحب یہاں ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ ان سے ملتے آنا جو کیئر کرتی ہیں شاید آپ لوگ نرس کہتے ہیں اسے۔" ارسل نے پاؤں باندھ کر جھوٹ بولا۔

"جی یہاں تو مختلف ڈیپارٹمنٹ تقسیم ہیں آپ کن کی بات کر رہے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"جی شاید نائمہ نام بتایا تھا انھوں نے جو ٹریٹ کرتی ہیں۔" ارسل نے جان بوجھ سوچنے کے سے انداز میں غلط نام لیا۔

"نائمہ تو کوئی بھی نہیں یہاں، اوہ صائمہ کی بات تو نہیں کر رہے آپ؟" لڑکی نے کہا۔

"اوہ ہاں جی! بالکل یہ ہی نام تھا۔ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔" ارسل نے مسکرا کر کہا۔

"جی شکریہ۔" لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے نام کیا ہے؟ آپ کے دوست کے والد صاحب کا۔" لڑکی نے تو شاید اب اجازت دے ہی دیتی مگر اتنے میں انچارج آن ٹپکا اور اسے پوری بات جب پتا چلی تو اس نے ارسل سے مخاطب ہو کر کہا۔ مگر اس کی نظریں مسلسل ارسل کو ٹٹول رہی تھیں۔

"جی ان کا نام شیخ وجاہت ہے۔" ارسل نے ایک فرضی سا نام لے لیا یہ سوچ کر کہ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ ہیں اگر ملاقات قسمت میں ہے تو ہو جائے گی وگرنہ پھر پوری جانچ پڑتال کے بعد آئے گا۔

"اوہ اچھا آپ شیخ صاحب سے ملنے آئے ہیں وہ ہمارے بہت اچھے کلائنٹ ہیں۔ آپ تشریف رکھیں میں بلواتا ہوں مس صائمہ کو۔" ارسل نے دل ہی دل میں ڈھیروں شکر ادا کیا اور سوچا کہ وہ ان شیخ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرے گا کہ وہ یہاں ہیں۔

اتنے میں لڑکی کو بریفنگ دی جا چکی تھی اور اس نے انٹر کام سے رابطہ کر لیا تھا اور کہا تھا کہ مس صائمہ کو آفس میں بھیجا جائے اور کوئی دس منٹ کے بعد ایک لڑکی اندر داخل ہوئی تو ارسل کھڑا ہو گیا۔ بہت سادہ اور معصوم چہرہ، رنگ فیئر عمر کوئی چھبیس کے لگ بھگ، کپڑوں سے اور چال ڈھال سے ہی قرینہ جھلکتا تھا۔ معصومیت اور حسن کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتا تھا۔ ارسل کو یوں لگ رہا تھا جیسے معصومیت نے ٹھان رکھی ہو کہ اس چہرے پر میرا راج ہے اور خوب صورتی نے کہا ہو کہ میرا راج ہے۔

"جی یہ ہیں مس صائمہ اور مس صائمہ! یہ ہیں۔" انچارج تعارف کرواتے کرواتے ایک دم رک گیا کیوں کے اس نے اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔ پہلے تو ارسل نے چاہا کہ اپنا نام بتا دے مگر پھر اس نے جان بوجھ کر ارادہ ترک کر دیا۔

"جی میرا نام اسد ہے اور میں شیخ وجاہت صاحب کے صاحب زادے کا دوست ہوں اور ان کے ریفرنس سے ان کی خیریت اور آپ سے ان کا حال احوال پوچھنے آیا ہوں۔" ارسل نے مسکرا کر انتہائی شائستہ لہجے میں کہا اور اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کا چہرہ شروع سے لے کر اس کے بات پوری کرنے تک سپاٹ ہی رہا گو کہ ارسل بہت بن ٹھن کے آیا تھا مگر عام لڑکیوں کی طرح صائمہ کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا نہ اچھا اور نا ہی برا۔ چونکہ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی تصویر نہیں دیکھی تھی اس لیے دونوں ہی نا آشنا تھے مگر اب ارسل جان چکا تھا۔

"جی آئیں میں آپ کو ان سے ملواتی ہوں اور جو کچھ پوچھنا ہے آپ کو وہ آپ مس فرزانہ سے پوچھ سکتے ہیں وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی انچارج ہیں۔" صائمہ نے کہا اور باہر کی جانب مڑ گئی۔ ارسل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

"آپ کو آج ناشتا نہیں دیا کسی نے؟" ارسل نے چلتے چلتے ایک دم سوال کر دیا۔

"جی! کیا کہا آپ نے؟" صائمہ جسے بالکل اس سوال کی امید نہیں تھی ایک دم سے مڑی اور بہت حیران ہو کر ارسل کی طرف دیکھنے لگی جیسے ارسل کی دماغی حالت ٹھیک نا ہو۔

"آپ کو اردو نہیں آتی؟" ارسل نے پھر سے سوال کیا مگر انتہائی سنجیدگی تھی اس کے لہجے میں۔

"جی آتی ہے، مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس بار صائمہ کے لہجے میں ہلکی سی تختی کی جھلک موجود تھی۔

"میں نے چھوٹا سا سوال پوچھا تھا کہ آپ کو آج ناشتا نہیں ملا؟ تو آپ ایسے حیران ہوئیں جیسے میں نے پشتو میں کچھ کہا ہو اسی لیے دوسرا سوال پوچھنے کی جسارت کی تھی۔" ارسل نے کہا مگر لہجہ بدستور سنجیدہ تھا اور یہ ہی بات صائمہ کو کنفیوژ کر رہی تھی۔

"جی! دیا تھا۔" صائمہ نے انتہائی مختصر جواب دیا اور چل پڑی۔ ارسل کو لگا کہ بتانا ہی پڑے گا وگرنہ یہ کسی اور کے سپرد کر دے گی۔

"حد ہے دوست کہتی ہو اور پہچان نہیں پا رہیں۔ پچھلے بیس منٹ سے بکواس کر رہا ہوں اور تم ہو کے نا چائے کو پوچھا اور نا پانی کو۔" ارسل نے غصے سے کہا۔

"کون دوست؟" صائمہ اب غور سے دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ چونکہ دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہلے نہیں دیکھا تھا تو پہچان کہاں سے آتی؟

"جی مجھ حقیر فقیر پر تقصیر و ناچیز کو ارسل کہتے

ہیں۔'' ارسل نے سر جھکا کر ایسے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا جیسے کسی دربار میں کسی بادشاہ کو اپنا تعارف کروا رہا ہو۔

''گنگ کیا؟'' اور یہ سننا تھا کہ ارمین کی آنکھیں فرطِ حیرت سے مجبور ہو کر کانوں تک پھیلنے لگیں۔

''یہ تمہیں ہر بات پر کیا کہنے کی عادت بچپن سے ہے؟'' ارسل نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یعنی تم ارسل ہو؟ مم میرا مطلب ہے آپ ارسل ہو؟'' صائمہ ابھی تک حیران تھی۔

''نہیں پارسل ہوں۔ اف! ارے ارسل ہی ہوں یار نیٹ والا۔ جس سے تم ہر دوسرے دن بات کرتی ہو۔'' ارسل کو لگا اس سے پہلے کہ مکر جائے کہ پہچانتی ہی نہیں اسے چیٹ کا حوالہ دو۔

''اوہ! تو وہ آپ ہیں۔ پر جھوٹ کیوں بولا مجھے کہتے میں آپ کو اپنا جاننے والا کہہ کر بلا لیتی۔'' صائمہ نے کہا جو قدرے ہوش میں آ چکی تھی۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سے بنا جھوٹ کے بھی ملا جا سکتا ہے وگرنہ آتے ہی اعلان کروا دیتا کہ مس صائمہ سے شرف ملاقات کا متمنی ہوں، عین نوازش ہوگی۔'' ارسل نے منہ بنا کر کہا۔

''اوہ! سوری میں اس دن جلدی میں آپ کو بتا نہیں پائی۔'' صائمہ نے کہا۔

''نہیں اس طرح ملنا صحیح نہیں کیونکہ پھر شاید تم سے ہزاروں سوال کیے جاتے کہ کون ہے یہ لڑکا؟ کیوں آیا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ تو بھلا ہو کہ کوئی شیخ صاحب ہیں تو میری دال گل گئی۔''

''اچھا! رکیے میں آتی ہوں ابھی۔'' صائمہ نے کہا اور جس راہداری میں دونوں چل رہے تھے اس میں کئی کمرے تھے وہ جو پاس تھا اسی میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی۔

''کہاں گئی تھیں؟'' ارسل نے پوچھا۔

''وہ انٹر کام پر اپنی دوست کو بتایا ہے کہ میں ذرا مصروف ہوں تو تم سنبھال لینا۔'' صائمہ نے کہا۔

''شاید تم اس وقت کافی مصروف ہوتی ہو؟ مجھے پتا ہوتا تو میں کسی اور ٹائم آتا۔'' ارسل نے کہا۔

''نہیں ہم آپس میں مینج کر لیتے ہیں۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔'' صائمہ نے کہا۔

''تم سے اس طرح بات کرنے پر کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' ارسل نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ اس لیے کہ یہاں دن میں جانے کتنے لوگوں سے بات کرنی پڑتی ہے۔ ادھر آ جائیں۔'' صائمہ نے ایک خالی بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔'' ارسل بھی ریلکس ہو گیا یہ سن کر۔

''کیسے ظالم لوگ ہیں دنیا کا سب سے قیمتی اور بیش قیمت اثاثہ یہاں چھوڑ جاتے ہیں اپنے تھوڑے سے مفاد کی خاطر۔'' ارسل جب سے یہاں آیا تھا اسے بہت دکھ ہوا تھا یہاں بوڑھے لوگوں کو دیکھ کر جو کسی نہ کسی کے ماں باپ تھے اور ناخلف اولاد نے انھیں یہاں چھوڑ رکھا تھا۔

ان کی حالت اس مسافر کی سی نہیں لگتی جو گھر سے نکلتے وقت بہت امیر تھے مگر منزل تک پہنچے تو بدن پر صرف کپڑے تھے۔ باقی سب لٹ گیا اور لوٹنے والے بھی اپنے ہیں۔ جس وقت وہ چھوٹے تھے تو کس کس طرح ان لوگوں نے ان کی دیکھ بھال کی ہوگی۔ ان کا گند تک صاف کیا ہوگا اور جن کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا وہ اولاد آج انھیں اپنے گھر رکھنے کو بھی تیار نہیں۔ صرف اس لیے کہ کسی کا بیٹا نہیں مانتا۔ کسی بیٹے کی بیوی نہیں مانتی۔ ان کی وجہ سے گھر میں شور ہوتا ہے، روک ٹوک ہوتی ہے، ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیسی بدنصیبی ہے ان لوگوں کی جن کے یہ والدین ہیں۔ ارسل کا دل یہ سب دیکھ کر پسیج گیا تھا۔

''تو یہ ہے تمہاری لائف؟'' ارسل نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی یہ ہے میری زندگی۔'' صائمہ نے جواب دیا۔

''یہاں تم کیسے؟ مم میرا مطلب اس جگہ پر تم؟......... جاب تو نہیں کرتی؟'' ارسل نے پوچھا تو اس مسحور کن چہرے پر ایک دم سے پتھر جیسی سختی اور سنجیدگی آ گئی۔

''میرا کوئی نہیں میں اکیلی ہوں۔ جاب کرتی ہوں یہاں اور یہاں ہی رہتی ہوں۔'' صائمہ نے انتہائی تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ! سوری بس پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیسے ہو تم۔'' ارسل کو پوچھنے کے لیے مناسب الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

''حالات کی سواری پر زندگی کا سفر یہاں تک لے آیا ہے۔'' صائمہ نے جواب دیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیسے حالات؟'' ارسل نے پوچھا۔

''بڑی لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گی یہاں اتنا وقت نہیں ملے گا۔'' صائمہ نے کہا۔

''چلو پھر جنت میں سنا دینا۔'' ارسل نے کہا۔

''نہیں دنیا میں ہی سناؤں گی۔ میں نے کبھی خود کو بھی اپنی کہانی نہیں سنائی مگر جانے کیوں آپ کو بتاتے ہوئے کوئی خوف، کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔'' صائمہ نے کہا۔

''تو تم نہیں چاہتیں کہ یہاں اتنی لمبی سٹنگ تمہارے ساتھ کی جائے۔ اچھا ہے عزت احتیاط برتنے سے ہی بنتی ہے۔'' ارسل نے کہا۔

''تم کیا کرو گے میرا ماضی جان کر، میری کہانی سن کر؟'' صائمہ نے سوالیہ نظروں سے ارسل کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جو ماضی ہے اسے جان کر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ صائمہ! اندر کی گھٹن کا غبار شخصیت کے آئینے کو اتنا گرد آلود کر دیتا ہے کہ خود کی پہچان بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ تم دیکھنے میں اچھی خاص ہو مگر جانے کیوں تمہاری باتوں میں ایک اضطراب کی جھلک دکھتی ہے۔ ایک درد محسوس ہوتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ مل کر اس کیفیت سے تمہیں آزادی دلانا چاہتا ہوں۔ بخدا میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ میں جانتا ہوں ایک نیٹ دوست پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے میرے اصرار پر مجھ سے ملنے کی حامی بھری ہے اور اس ہامی میں بہت سے سوال بھی ہوں گے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اس دور میں کسی پر یقین کرنا ایسے ہی ہے جیسے زہر پینا۔ ان سب باتوں کے باوجود میں پھر بھی کہوں گا کہ ایک بار اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر کے دیکھو تمہارا درد ختم تو نہیں ہوگا مگر تمہیں مسکرانا ضرور آ جائے گا۔ زندگی نے کیا کچھ چھین لیا ہے مجھے نہیں پتا مگر آنے والے وقت کو مزید بے رحم ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ زندگی کو پھر سے کوئی روپ دے کر خوش گوار بنایا جا سکتا ہے۔ ایک بار کوشش تو کی جا سکتی ہے۔'' ارسل نے صائمہ کی طرف دیکھ کر منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں نہیں جانتی غلط ہے یا صحیح مگر بتاؤں گی، جلد بتاؤں گی۔'' صائمہ نے یوں کہا جیسے بہ مشکل فیصلہ کیا ہو۔

"جیسا تم بہتر سمجھتی ہو۔ چلو تم اپنا کام کرو میں چلتا ہوں۔ پھر ملتے ہیں جب تمہارا جی چاہے۔"

ارسل نے کہا اور سلام دعا کے بعد وہ چلا آیا۔ کبھی تو اسے لگتا کہ بلاوجہ اس کی زندگی میں مداخلت کر رہا ہے پھر اسے لگتا کہ دوست تو وہی ہے جو مشکل وقت میں کام آئے۔ کیا ہوا اگر میں نیٹ دوست ہی سہی' کیا ہوا جو اس دور میں اپنوں پر بھروسہ نہیں رہا مگر آج تک یہ ہی تو سیکھا ہے کہ خود کی کوشش سے اور اٹل نیت سے برائی میں بھی اچھائی کے راستے مل سکتے ہیں۔

☆......☆......

چیٹ پہ ہیلو ہائے ہوتی رہی ارسل کی مگر اس دن کے بعد ارسل نے ملنے کا نہیں کہا اسے لگتا تھا کہ جتنی وہ کوشش کر چکا وہ کافی ہے اب ملنے کا فیصلہ اس کا اپنا ہوگا تو ہی وہ خود سے سب کچھ بتا سکے گی۔

"یار! وہ دیکھنے میں اور بات کرنے میں فلرٹی بھی نہیں لگتا پھر تم کیوں نہیں ملتی اس سے صائمہ کی سب سے بہترین دوست راشدہ ہی تھی جس سے وہ اپنی ہر بات شیئر کرتی تھی۔

"راشدہ! تم جانتی ہو مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا تو کیا ملوں اور کیوں ملوں؟ کیا وہ میری گزری ہوئی زندگی کو پھر سے واپس لاسکتا ہے یا میری آنے والی زندگی کو خوش گوار کردے گا؟ کیا کرے گا وہ جو میں اس سے ملوں۔"

"اگر وہ کچھ نہیں کرسکتا تو پھر یہ دوستی کس لیے اور کیوں بلوایا تھا پھر اسے؟ ٹھیک ہے سب ختم کرو۔ توڑ دو یہ رشتہ اور کہہ دو کہ دوبارہ سے کسی رابطے کی کوشش نا کرے۔ پھر کیوں یہ سب بکھیڑا پال رکھا ہے؟" راشدہ کو غصہ آگیا۔

"بس وہ سب سے مختلف ہے' اچھا انسان ہے اچھا دوست ہے۔ وگرنہ تم جانتی ہو مجھے۔" صائمہ نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر وہ اچھا ہے اور بقول تمہارے مختلف ہے' سب سے تو کیوں نہیں مل لیتیں۔ ارے اگر کوئی اچھا انسان بھی ہوا اچھا دوست بھی ہو تو اس سے بڑی کیا بات ہوگی؟ ارے ایسے لوگوں کی ہی تو کمی ہے زندگی میں جو اپنی غرض سے نہیں ملتے۔ ایسا دوست ہو تو زندگی کی پوری روداد سنا کر بھی دل چاہتا ہے کہ بات ختم نہ ہو۔ کسی سے اس لیے اپنے دل کی بات نہیں کی جاتی کہ کوئی کچھ کرسکتا ہے بلکہ اس لیے کی جاتی ہے کہ دل ودماغ سے ایک بوجھ اترتا ہے' ہلکا پن محسوس ہوتا ہے۔ ایسے ہی نہیں بزرگ کہہ گئے ہیں کہ دل کی بات کہنے کو کوئی مناسب انسان نا ملے تو دیواروں سے کہہ دو تم تب بھی بہتر محسوس کرو گے اور تم ایک اچھے خاصے انسان سے بات کرنے پر تیار نہیں ہو۔" راشدہ نے اچھی طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یار! اسے بتا کر میں اسے بھی پریشان کروں گی بلاوجہ کی ہم دردی آجائے گی اس کے دل میں۔ وہ دوست ہے کافی ہے میرے لیے۔" صائمہ نے روکھے لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے رہو اسی طرح اپنے ماضی کی غلام بن کر۔ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" راشدہ نے غصے سے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ صائمہ اکیلی بیٹھ کر اپنی تخیل کی دنیا میں کھو جایا کرتی تھی سو چلی گئی۔

☆......☆......

مزید کچھ دن گزرتے گئے۔ پھر ایک دن رات کو جب دونوں چیٹ کر رہے تھے تو ارمن نے ارسل کو منگل کے دن صبح گیارہ بجے ماڈل کالونی کے پارک میں ملنے کو کہا۔ ارسل نے ہامی بھرلی اور آج

دونوں اسی پارک میں ملنے والے تھے۔ ارسل پارک میں پہنچ گیا تھا مگر صائمہ ابھی تک نہیں آئی تھی تو اس نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ تقریباً پندرہ یا بیس منٹ بعد صائمہ اسے آٹو سے اترتی نظر آئی۔

"خیریت تم لیٹ ہوگئیں؟" ارسل نے پوچھا۔

"ہاں! وہ ٹریفک کی وجہ سے۔" صائمہ نے کہا۔

گو کہ دونوں دوست تھے مگر ارسل دل ہی دل میں اس کے لباس کی سلیقہ مندی پر داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔

اکتوبر کے آخری دن چل رہے تھے تو گرمی اور سردی کا ملا جلا موسم تھا اور ان دونوں کے اندر کا موسم بھی ملا جلا تھا۔ صائمہ زندگی میں پہلی بار کسی انجان آدمی سے ملنے باہر آئی تھی اور یہ کتنی بڑی بات ہوتی ہے یہ ایک عورت زاد ہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔ چلتے چلتے کوئی دس منٹ گزر گئے مگر دونوں یوں خاموش تھے جیسے ڈاکٹر کی ہدایت ہو کہ بولنا منع ہے۔ آخر کار ارسل نے خاموشی کے اس جمود کو توڑا۔

"تم نے جوتی نئی لی ہے؟" ارسل نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ نن نہیں تو پرانی ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" سوال اتنا اچانک اور عجیب تھا کہ صائمہ بوکھلا گئی۔ ارسل کو صائمہ کا تم کہنا اچھا لگا تھا۔

"پہلے تو شکریہ کہ تم نے آپ کی بجائے تم کہا وگرنہ مجھے لگنے لگا تھا کہ میں کوئی چالیس سال کا انکل نما چیز ہوں اور نئی جوتی کا اس لیے کہا کہ جب سے پارک میں داخل ہوئے ہیں تم مسلسل چلی جارہی ہو جیسے تم نے نئی جوتی لی ہو اور بچوں کی طرح سب کو دکھانا چاہتی ہو کہ دیکھو میری نئی جوتی۔ تم نے آج ہی چیک کرنی ہے کہ ٹوٹتی ہے کہ نہیں۔" ارسل نے کہا تو صائمہ پہلی بار مسکرائی۔

"نہیں تو۔ شاید مہینوں بعد باہر نکلی ہوں تو ماحول بڑا اجنبی سا محسوس ہورہا ہے۔" صائمہ نے کہا۔

"ماحول سے مانوس رہو تو کبھی اجنبی نہیں ہوتا اور اگر دیکھنے والی نگاہ نا ہو تو پہچان مشکل ہو جایا کرتی ہے۔" ارسل نے کہا۔

"نگاہیں تو خود سے مانوس نہیں تو ماحول سے کیسے ہوسکتی ہیں؟" صائمہ نے کہا۔

"کیوں، ایسا کیوں؟" ارسل نے پوچھا۔

"میں نو سال کی تھی جب میرے ماں باپ اور میرا ایک بھائی کار ایکسیڈنٹ میں اللہ پاک کو پیارے ہوگئے۔ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتی مگر تقدیر پر کہاں اختیار ہوتا ہے کہ بدلی جاسکے۔ میری طبیعت بہت خراب تھی اور آپا جو ہمارے گھر میں ہوتی تھی اس نے ضد کی کہ اسے گھر میں ہی چھوڑ دیں بے بی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ جاؤ میں آج رات ادھر ہی رک جاتی ہوں۔ رات کو جب واپس آرہے تھے تو وہ حادثہ پیش آگیا اور تینوں مجھے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ کوئی رشتہ دار نہیں تھا سوائے خالہ اور چچا کے۔ چچا لندن میں تھے اور خالہ نے اظہار ہم دردی کے تحت مجھے پالنے کی ہامی بھری بس پالنے کی عوض بابا کی ساری جائیداد جھوٹ فریب اور کچھ مجھے بہلا پھسلا کر اپنے نام کروالی۔ اس وقت رویہ اتنا اچھا تھا میرے ساتھ کہ مجھے جلدی ہی محسوس ہونے لگا کہ میری ماں لوٹ آئی ہے مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ چند مہینے میری دیکھ بھال کی گئی مجھے راضی کیا گیا کہ یہاں رہنا ٹھیک نہیں فیصل آباد چلتے ہیں جہاں یہ لوگ رہتے تھے۔ میں مان گئی اور سب بیچ کر وہ لوگ مجھے لے کر اپنے گھر آگئے اور یہاں آتے ہی مجھے اپنی اوقات پتا چل گئی جو صرف ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں تھی۔ اپنی زندگی کے وہ سال جو ہر بچہ کھیل کود کر گزارتا ہے میں نے مار کھاتے گزارے ہیں۔ وہ ہاتھ جو بابا صبح شام چوما کرتے تھے کہ میری بیٹی

بہت قسمت والی ہے وہ ہاتھ دن بھر کبھی کپڑے دھوتے، جھوٹے برتن دھوتے اور کبھی صفائی کرتے رہتے تھے۔" صائمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار بہہ رہی تھی مگر ارسل کچھ نہیں بولا۔ یہ دریا سالوں سے بند تھا آج اس میں طغیانی تھی تو اسے روکنا ممکن یا صحیح نہیں تھا۔ اچھا ہے دکھ اور تکلیف کی یہ بستی تباہ ہو جائے۔

"خالہ کو جانے کس بات کا غصہ تھا، دن سے رات ہو جاتی مگر ان کے کام ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ رات ہوتی تو بہ مشکل سونے کو چھ گھنٹے مل جاتے اور اکثر تھکاوٹ اتنی ہوتی کہ نیند بھی آتے آتے وقت لیتی۔ نا تو دن ہی راس آتا تھا اور نا ہی رات کی کالی چادر اپنی آغوش میں لے کر کچھ پل کا سکون دے سکتی تھی۔ سارے دن کے کام کاج سے جسم اتنا بوجھل ہو جاتا کہ لیٹنا بھی ایک عذاب لگتا۔ مجھے یاد ہے بابا میرے لیے بہت نرم گدا لے کر آئے تھے صرف اس لیے کہ میں نے ایک دن شکایت کی تھی آپ کا بستر زیادہ نرم ہے۔" صائمہ اس بات پر مسکرا پڑی مگر اس مسکراہٹ میں درد کی تلخی کو وہ اپنے چہرے سے ہٹا نہیں پائی۔

"زندگی کے رنگ اور زندگی کے مفہوم کیسے یکسر بدل جاتے ہیں۔ خوشیوں کا موسم اتنا کم ہوگا کیا پتا تھا۔ روز روتی پھر خود ہی چپ ہو جاتی کہ کون تھا جو آنسو پونچھتا میرے اور میری اس ٹوٹی پھوٹی زندگی کے سوا۔ جانے کیجے برف ہو کر بھی اندر کی آگ بجھا نہیں پاتے۔" اس کی آنکھیں پھر سے اشک بار تھی ارسل جانتا تھا کہ اس نے صائمہ کی روح کے درد کو کریدا ہے جس پر کوئی مرہم کام نہیں کرتا سوائے ان آنسوؤں کے جو تسلسل اس کی آنکھوں سے اس کی جھولی میں گرتے جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آنسو گر گر سوال کر رہے ہوں کہ دکھتا دل ہے مگر ہمیں کیوں گرایا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک بچہ کھیلتا ہوا پارک میں گر گیا اور زور زور سے رونے لگا تو صائمہ جیسے ہوش میں آئی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"سوری۔" صائمہ نے نظریں جھکا کر کہا کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی اتنی چبھن تھی کہ صحیح سے دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

"اٹس او کے۔" ارسل نے بہ مشکل کہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھی مگر وہ رو کر صائمہ کا حوصلہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے؟ کبھی کبھی دل و دماغ بھی جذبات کے صفحات پر کچھ لکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ لفظوں کی مالا جیسے بڑے زور سے اور اس برے طریقے سے ٹوٹی تھی کہ ارسل ایک موتی بھی نہیں چن پایا۔ صائمہ خود ہی بولی۔

"ہر وقت کی مار پیٹ جو ہاتھ میں آیا وہ میرا نصیب مگر نشان جسم پر پڑتے تھے اور درد کہیں اندر ہوتا تھا جو میں کہیں بھی کسی کو دکھا نہیں سکتی تھی۔ اسی آگ میں جلتے جلتے اپنے وجود کی رعنایت چکی تھی میں مگر دکھ اس کے کھونے کا نہیں زندگی کا تھا جو مسلسل جلنے پر بضد تھی۔ امید تھی کے اچھا وقت آئے گا مگر اکثر میں بیٹھ کر سوچتی کہ میری حالت اس درخت کے جیسی ہے جو صحرا میں ہو اور جسے دو بوند پانی آسمان بھی دینے کو راضی نہ ہو اور اس پر یہ امید کہ یہ ایک دن پھل دے گا۔"

ہلکی ہلکی سرخ آنکھیں جو دور کہیں بہت دور اپنے ماضی کے اندوہناک حادثات کو دیکھ کر چپ رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ پھر سے اس کے چہرے پر تھی مگر اب کی بار اسے دیکھنا ارسل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے تقریباً اپنا چہرہ دوسری جانب کر رکھا تھا کہ صائمہ کی نظر نا پڑے۔ ارسل نے ہمت کر کے دیکھا تو دائیں جانب بیٹھی ہوئی صائمہ کے چہرے پر درخت کی ٹہنیوں سے چھن کر آتی ہوئی ایک کرن اس کے آنسوؤں کو موتی کی طرح چمکا رہی تھی جیسے یہ آنسو اس کے چہرے کا حسن ہوں۔ بہت دیر تک جب صائمہ نہیں بولی تو ارسل سے رہا نہیں گیا۔

"بس بھی کرو اور کتنا روؤ گی تم۔" ارسل کے پاس اور کوئی الفاظ نہیں تھے جو قدرے مناسب ہوں۔

"یہ آگ تو کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی اب تو صرف اس آگ کی تپش محسوس ہوتی تھی۔ آج نہ جانے کہاں سے کسی چنگاری کو ہوا مل گئی۔" صائمہ نے کہا اور اب شاید اس کا گلا بھی سوکھ گیا تھا کیوں کہ اس سے صحیح بات نہیں ہو پا رہی تھی، اس کے لفظ ٹوٹ رہے تھے۔ ارسل جلدی سے اٹھا اور تقریباً بھاگنے کے انداز میں چلتا ہوا دور ایک کینٹین پر گیا اور منرل واٹر کی بوتل خریدی اور پھر اسی انداز میں چلتا ہوا واپس آیا۔

"یہ لو، اسے پیو تمہارا گلا خشک ہو چکا ہے۔" ارسل نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے بوتل پکڑی اور چند گھونٹ پی کر بوتل کا ڈھکن واپس بند کیا اور بوتل ہاتھ میں پکڑ لی۔

"پھر کیا ہوا، یہاں تک کیسے پہنچی؟" ارسل نے پوچھا۔

"خالہ کا ایک بیٹا تھا۔ جس نے ماں کو دیکھ کر ماں ہی کا روپ اپنایا۔ اکثر دل چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں مگر نہیں کر پائی۔ پھر دل کرتا بھاگ جاؤں مگر بھاگ بھی نہیں سکی۔ اپنی زندگی کے اٹھارہ سال اسی خاموشی میں گزار دیے۔ کہتے ہیں نا کبھی کبھی جو ہوتا ہے وہ دیکھنے میں تو اچھا لگتا ہے مگر برا ہوتا ہے اور کبھی کبھی جو برا لگتا ہے دیکھنے میں وہ اچھا ہوتا ہے۔ خالہ کا بیٹا بہت دنوں سے مجھ پر نظریں رکھے ہوئے تھا اس کی ہوس بھری آنکھیں کسی پینڈولم کی طرح میرے وجود کے ارد گرد گھومتی رہتی تھیں۔ مجھے اپنی ملکیت تو وہ سمجھتا ہی تھا مگر اب وہ مجھ پر اپنی حاکمیت بھی جتانا چاہتا تھا۔ مگر خالہ کا غصہ وہ جانتا تھا۔ نیت میں فتور ہو تو شیطان نا بھی مدد کرے ہم خود اپنی مدد آپ کے تحت چل پڑتے ہیں اور ایک دن اس کی نیت اس کے خوف پر غالب آ گئی اور......" صائمہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئی جیسے اب بولنے کو کچھ نہیں رہا۔ ارسل سمجھ گیا اب اس کے لیے بولنا کیوں مشکل ہو رہا ہے کیونکہ برسوں سے خاموش یہ زبان لفظوں سے ناآشنا تھی مگر شرم و حیا سے نہیں۔ ایک اجنبی کے سامنے سب کہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ارسل کا دل چاہا کہ وہ کہے تم سب کچھ کہہ سکتی ہو صائمہ بولو رکو نہیں وگرنہ یہ خاموشی پھر سے تمہاری زندگی کی راہ میں حائل ہو جائے گی۔

جانتا ہوں یہ سب مجھ سے کہنا ضروری نہیں مگر کیسے کہوں کہ کسی اور سے کہہ دینا۔ دنیا تو عزتیں بکھیرنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے تمہاری بات کہاں سمجھے گی؟ مگر ارسل خاموش رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کے کانوں میں صائمہ کی آواز آئی۔

"پھر ایک دن موقع پا کر وہ میری جانب بڑھا۔ گھر میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا اور اس سے بہتر موقع اس کے لیے کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے خود کو بچانے کی بہت جدوجہد کی مگر ایک کمزور وجود کہاں تک لڑتا؟ اسی ہاتھا پائی میں دل ہی دل میں بے اختیار نکلا کہ اب تو ہی بتا اور کتنا صبر کرنا ہوگا دیکھ اب بات عزت تک آ گئی۔ یہ کہنا تھا کہ میرا ہاتھ میز

پر پڑے ہوئے گل دان سے ٹکرایا میں نے فوراً ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا وہ اٹھا کر اس کے سر پر اتنی زور سے مارا کہ اس کے سر سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا اور وہ بے ہوش گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب میرے ساتھ کیا ہو گا پس اس کے برعکس عزت کہیں زیادہ عزیز تھی۔ میں نے اس کے سر پر زور سے ایک کپڑا باندھا تاکہ خون بند ہو جائے اور خالہ کو فون کر کے سب بتا دیا اور خود جلدی سے ایک کمرے میں بند ہو گئی کہ کیا خبر یہ خالہ کے آنے سے پہلے ہوش میں نہ آجائے۔" صائمہ نے کہا اب وہ قدرے سنبھل چکی تھی بار بار بوتل سے پانی کے چند گھونٹ پی لیتی۔ آنسوؤں کا طوفان اب کافی تھم چکا تھا۔

"تم بھاگی کیوں نہیں؟ وہاں سے موقع اچھا تھا چلی جاتیں اس جہنم کو چھوڑ کر۔" ارسل سے رہا نہیں گیا تو صائمہ کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"موقع ایک نہیں کئی آئے مگر ایک لڑکی جسے گلی محلوں تک کا نہیں پتا' جسے خبر نہیں کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے اور پھر یہ بے رحم معاشرہ جو درندگی کے سب ہنر جانتا ہے۔ میں گھر میں محفوظ نہیں رہ سکی تو باہر کیا نکلتی؟ ابھی میں صرف نیٹ پر ہوں تو ہر کوئی گرل فرینڈ بنانا چاہتا ہے ہر کوئی اپنی باتوں کا فن دکھا کر مجھے اپنی شخصیت سے متاثر کرنا چاہتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے ہوں اور کیوں ہوں؟ کسی نے یہ سوال مجھ سے نہیں پوچھا۔ شاید تم وہ واحد انسان ہو جس نے مجھ سے چار دن کی دوستی کے بعد کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کی ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ نیٹ کی دنیا پر جذبات کو کس طرح روندھا جاتا ہے۔ ہر ایک کسی دوسرے سے کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف ہے یا پھر مجبوری اور غربت کے نام پر ایک دوسرے سے پیسے بٹورتے دیکھا ہے۔ فحاشی دیکھی ہے، وقت کا ضیاع دیکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اس نیٹ کو ہی بند کروا دوں جس سے یہ نئی نسل روز بہ روز بگڑتی جا رہی ہے۔" بات کرتے کرتے صائمہ کا پارہ ایک دم سے ہائی ہو گیا۔

"تم بتا رہی تھیں، پھر خالہ آئی تو کیا ہوا؟" صائمہ کا موڈ چینج کرنے کے لیے ارسل اسے پرانی بات پر لے آیا۔ کیوں کہ جو وہ کہہ رہی تھی وہ سب سچ تھا نیٹ واقعی میں اب ایسا ہی تھا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ادھوری کہانی پورے کر لے کیونکہ وقت کم تھا۔

"خالہ آئی سابقہ روایت کو برقرار رکھا ہاں پہلے میں بے ہوش نہیں ہوئی تھی کبھی مگر اس بار مار شاید میری اوقات سے اور میرے جسم کے صبر سے زیادہ تھی تو میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو کچھ دیر کے بعد خالہ نے کہا تم اب یہاں نہیں رہ سکتیں کیونکہ خالہ کو ڈر تھا جو ہوا وہ پھر سے کرنے کی کوشش کی گئی یا ان کا بیٹا مجھ پر عاشق ہو گیا تو خالہ تو گئی کام سے۔ خالہ نے میرے لیے پھر پہلے تو وہیں کا سوچا تھا مگر پھر ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ ان کا خون وہاں بھی رنگ نہ دکھا آئے تو پھر میرے لیے لاہور شہر منتخب ہوا اور میں یہاں آگئی۔" صائمہ میرے ساتھ بیٹھی تھی مگر اس کی نظریں خیالوں کی سرزمین پر بے چین سی چہل قدمی کر رہی تھیں اور اس کی بے چینی کا ثبوت وہ بوتل تھی جس کا ڈھکن وہ لاشعوری میں جانے کتنی بار بند کر چکی تھی اور کھول چکی تھی۔

پرندوں کے جھرمٹ نے شام کے ڈھلتے سائے کا اعلان کیا تو دونوں کو جیسے ہوش آیا کہ پچھلے چھ گھنٹوں سے وہ یہاں ہیں اور اب شام ہونے والی ہے۔

"ارسل! بہت دیر ہو گئی مجھے چلنا چاہیے۔"

صائمہ نے کہا۔

"ہاں چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔" ارسل نے کہا۔

"تم اتنی دیر باہر رہی ہو کوئی کچھ کہے گا تو نہیں؟" ارسل نے قدرے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں، جھوٹ کا سہارا لے کر جینے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ اب میں بھی تقریباً اس دنیا اور اس معاشرے کی ایک مہذب رکن بن چکی ہوں۔" صائمہ نے حالات پر طنز کیا اور ارسل مزید کچھ نہیں کہہ سکا اس کے جواب میں۔

صائمہ کو چھوڑنے کے بعد ارسل گھر آیا تو وہ ابھی تک ادھر ہی تھا جہاں صائمہ اپنی باتوں سے اسے چھوڑ گئی تھی۔ آخر کیسے کوئی اتنے صبر کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟ جب کہ زندگی رحم کرنے کو تیار ہی نہیں۔ اسے لگا کہ یہ کوئی سپنا ہے' کوئی کہانی ہے اتنے دکھ کے ساتھ اپنا ادھموا وجود کیسے اتنی دیر تک ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ بہت دیر تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ زندگی کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

☆......☆......

"بھائی اٹھ جاؤ کے خواب میں دیکھ رہے ہو؟ جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ ابھی جمیلہ اتنی دور نہیں گئی کہ آپ کو خوابوں کا سہارا لینا پڑے۔ ارے سب ٹھیک ہو جائے گا مگر اٹھو تو صحیح۔ ارے میں ہوں نا۔" ارمین نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا تو ارسل کی آنکھ کھلی۔ اس نے ٹائم دیکھا تو صبح کے نو بج چکے تھے۔ وہ بہت حیران ہوا کہ روز صبح نماز پڑھنے اور پھر واک کرنے والا آج نو بجے تک کیسے سویا رہا؟ اسے وجہ معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ رات دیر تک ہم کلامی اور تخیلات کے بھنور میں پھنسے رہنے کی وجہ سے نیند دیر سے آئی۔

"آرہا ہوں' آرہا ہوں۔ دروازہ توڑو گی کیا؟" ارسل نے وہیں سے چیخ کر کہا۔

"شکر ہے زندہ ہونے کا ثبوت تو ملا۔" ارمین کی وہی چہکتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فریش ہو کر باہر نکلا اور کچن کی طرف گیا۔ وہ جانتا تھا امی جان کھانا بنا کر نہیں رکھتیں۔ دیر ہو یا جلدی وہ کھانا تازہ ہی بنا کر دینے کی عادی تھیں۔

"السلام علیکم۔" ارسل نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ اسے معلوم تھا باقی سب ناشتا کر چکے ہیں اور اب وہ اکیلا ہی ناشتے کا طلب گار ہے۔

"وعلیکم السلام۔ اٹھ گئے جناب! کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" شمیم بیگم اس کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"ہاں بھائی! آپ اتنی دیر سے تو نہیں عام حالات میں نہیں اٹھتے۔" ارمین نے بھی محسوس کیا تو فوراً پوچھا۔

"نہیں۔ بس سر میں ہلکا سا درد تھا شاید رات دیر تک کام کرنے کی وجہ سے۔ وہ ایک دوست کو اپنی اسائنمنٹ سبمٹ کروانی تھی اور آج آخری تاریخ تھی اس لیے۔" ارسل نے جھوٹ بولا تو اسے فوراً صائمہ کی بات یاد آگئی۔ جھوٹ بولنے کا سہارا لے کر جینے کا سلیقہ آ گیا ہے مجھے۔

"بھائی کام ہی تھا یا سپنوں میں بیٹھے سوچتے رہے ہو کسی کو۔ میں نے پڑھا تھا کہ وقت پر اگر آنکھ نا کھلے تو دماغ کسی سہانے سپنے میں گم ہوتا ہے۔" ارمین نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں کام ہی تھا۔" ارسل نے مختصر جواب دیا۔ "آج اس کا بولنے کو من نہیں تھا اور یہ بات اس نے

خود بھی محسوس کی کہ دل اندر سے خوش نہ ہو تو کیسے خاموشی کا نقاب خود بہ خود چہرے کو باپردہ کر دیتا ہے۔ وگرنہ ارمین کی بات پر ایک گھنٹہ کی نوک جھونک تو پکی تھی۔

"بھائی تم نے دوائی لی مجھے تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ارمین اب سچ میں فکرمند تھی لڑائی اپنی جگہ مگر خیال بہت تھا دونوں کو ایک دوسرے کا۔

"ہاں سر ذرا بھاری سا ہے اور کچھ نہیں۔ اوئے باتوں میں لگا کر میرا ناشتا ٹھنڈا مت کرواؤ۔ تم سے امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ پھر سے گرم کر دو گی۔ پتا نہیں کیوں اتنی کام چور ہو تم۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا اور ارمین مسکرادی۔ مگر بولی کچھ نہیں کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ یہ مذاق صرف اسے بہلانے کے لیے تھا وگرنہ ارسل کا موڈ ٹھیک نہیں آج بولنے کا۔

ارسل نے ناشتا کیا اور آفس کے لیے نکل گیا۔ مگر دل بری طرح بے زار تھا۔ زندگی اس کی، حالات اس کے پر تم کس خوشی میں مجنوں بن رہے ہو؟ اندر کی آواز پر وہ بری طرح چونکا شاید اندر کے ارسل نے باہر کے ارسل کی چوری پکڑ لی تھی۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

صرف انسانیت یا کچھ اور بھی۔

نہیں، نہیں اور کچھ نہیں صرف انسانیت۔

آج سے پہلے تو کبھی نہیں جاگی یہ انسانیت روز ٹی وی پر ایسی خبریں آتی ہیں وہاں نہیں جاگی کبھی۔

اپنوں کے ساتھ زیادہ انس اور محبت ہوتی ہے اس لیے وگرنہ اور کوئی بات نہیں۔

سوچ لو ارسل میاں، اگر ایسا ہوا تو تمہارا شمار بھی ان لوگوں کی لسٹ میں ہو جائے گا جن کا کل تذکرہ تم سن چکے ہو۔ ایک اور جنگ اس کے دل و دماغ میں چھڑ چکی تھی اور اب وہ صحیح معنوں میں فکرمند ہو گیا تھا۔ اگر ایسا ہو گیا تو صائمہ کیا سوچے گی کہ میں بھی اسی طرح کا نکلا بلکہ ان سے بھی گرا ہوا جو ہمدردی کی آڑ لے کر اس کے پاس آیا۔ نہیں میں جانتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں پھر یہ بے ہودہ سوال کس لیے۔ ارسل نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

اسی شش و پنج میں جیسے تیسے وقت گزرا اور شام ہوئی۔ ارسل اپنے والد کے ساتھ گھر آ گیا۔ تھوڑا سا ہنسی مذاق کرنا مجبوری تھی وگرنہ پھر سے کوئی جھوٹ بولنا پڑتا۔ کھانے کے بعد جب ارسل اپنے کمرے میں آیا تو اس نے لیپ ٹاپ آن کیا کہ شاید صائمہ آن لائن ہو مگر وہ نہیں تھی تو وہ اپنی میلز چیک کرنے لگا۔ کافی دیر کے بعد صائمہ آن لائن ہوئی تو ارسل نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ؟ صائمہ نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ کیسی ہو؟" ارسل نے جواب دیا۔

"جی میں بھی ٹھیک ہوں۔" صائمہ نے کہا۔

کتنا کچھ تھا پوچھنے کو، کہنے کو مگر اب جب اس سے بات ہو رہی تھی تو ذہن کوئی بات زباں کو دینے پر تیار نہیں تھا۔ یوں جیسے صائمہ کی کہانی سے پیدا ہونے والے سوالوں کے حق میں دماغ سو گیا ہو۔

"تم ان حالات میں نیٹ اور چیٹ کیسے؟" آخرکار بڑے جوڑ کے بعد ارسل نے ایک سوال کر ہی دیا۔

"بس آ گئی۔ آپ کو کیا لگتا ہے کیسے پہنچی ہوں؟" صائمہ نے الٹا سوال کر دیا۔

"مجھے کیا پتا میں تھوڑی وہاں تھا۔" ارسل نے

کہا۔

"نہیں کچھ بولو کچھ کہو۔ دل میں مت رکھو۔" صائمہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا نا دل میں رکھوں؟ کیا کہہ رہی ہو؟" ارسل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی جو اکثر یہاں سوچتے ہیں کہ باس سے سیٹنگ ہو گی۔ جسم بیچا ہو گا وگرنہ ایک انجان لڑکی پر کوئی ایک سال میں اتنا مہربان کیسے ہو گیا کہ اسے رکارڈ روم میں کمپیوٹر پر بٹھا دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔" صائمہ نے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم۔ تمہارے دماغ میں یہ بے ہودہ سوال کیسے آیا؟ کیا اول فول بولے جا رہی ہو؟ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور تم بات کو کہاں لے گئی۔" ارسل کو واقعی بہت غصہ آیا تھا۔

"کسی کو میرے ماضی کا نہیں پتا پھر بھی لوگ ایسا کہتے ہیں اور آپ تو سب جانتے ہیں تو دماغ اس طرف تو ضرور گیا ہو گا۔" صائمہ نے کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا میں ایسا کیوں سوچوں گا۔" ارسل نے کہا۔

"نہیں پاگل نہیں ہوئی ایک بے سہارا لڑکی کے لیے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ خود سے پیدا کیے گئے مفروضوں سے ہم لوگ دوسرں کی تقدیر بنا ڈالتے ایک وہ بھی ایک منٹ میں۔ پھر زندگی کے چوبیس سال آزادی کا منہ نا دیکھا ہو اور اسے آزادی مل جائے اب یاں تو وہ بگڑ جائے گا یا پھر سدھر جائے گا۔ تو کیا سوچا آپ نے؟" صائمہ نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں تمہیں اس وقت میرے پاس ہونا چاہیے تھا تا کہ تمہارے سر پر کوئی چیز مار سکوں، شاید اس سے تمہارے ہوش ٹھکانے پر آ ئیں تم اتنا الٹا سوچتی ہو میرے بارے میں۔ پچھلے سات مہینوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، مل چکے ہیں، پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں ایسا سوچتا ہوں، اتنی گھٹیا سوچ رکھتا ہوں میں۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں ایسا سوچتا ہوں تو تمہیں یہ قصہ ادھر ہی ختم کر دینا چاہیئے۔ جہاں اعتماد کا رشتہ نہ ہو وہاں سب رشتے فضول اور بے معنی ہوتے ہیں۔" ارسل نے جواب دیا۔

"اعتماد کا رشتہ؟ اعتماد کے رشتوں نے ہی زندگی کا سودا کیا تھا اور بدلے میں کیا ملا صرف نفرت، غصہ اور تنہائی۔ احساس مر چکا تھا تو گالیاں بھی خاموشی سی سن لیا کرتی تھی مگر اب کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھائے سوال پوچھتا ہے تو اس کی چبھن رگ و پے میں اتر جاتی ہے۔" صائمہ نے کہا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم سمجھ رہی ہو۔ پھر بھی تمہیں برا لگا تو ریلی سوری۔" ارسل نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اوکے پھر بات کرتے ہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا، بائے اور اللہ حافظ۔" صائمہ نے لکھا اور بنا جواب لیے چلی گئی۔

کیا پاگل لڑکی ہے میری بات بھی نہیں سنی اور چلی گئی۔ آنے دو اب اسے۔ ارسل نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اسے واقعی بہت غصہ تھا۔

☆......☆......

پانچ دن گزر گئے صائمہ نہیں آئی نیٹ پر۔ یا تو وہ اس دن والی بات پر ناراض ہے یاں پھر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی۔ ارسل اسی طرح کب سے اس کے نا آنے کی وجوہات خود سے ہی تلاش کر رہا تھا مگر کوئی بھی وجہ اس کے لیے اطمینان بخش نہیں تھی۔ آخرکار اس نے پھر ہوسٹل جانے کا سوچا مگر پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا کیوں کہ وہاں خواتین

سے ملنا ہی بہت مشکل تھا اور اسے دیکھا بھی جا چکا تھا اس لیے اب دوبارہ شیخ صاحب والی ترکیب بالکل غلط تھی۔ اس کے ذہن میں ترکیب آئی اس نے سوچا کیوں نا ارمین سے کہا جائے۔ صائمہ سے مل کر یہ پتا کر سکتی ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے یا وہ ملنا نہیں چاہتی اب مجھ سے۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے ارمین کو آواز دی۔

"ارمین میری گڑیا رانی، میرے گھر کا زیور، میرے والدین کی آہ و پکار، اف کیا نکل گیا منہ سے، مم میرا مطلب ہے وقار، کہاں ہو؟" ارسل نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی لمبی سی صدا لگا ڈالی۔

"کیا کہا آہ و پکار ہوں میں۔ سن لیا سب میں نے۔" ارمین جوس پی رہی تھی جو اس نے غصہ کی وجہ سے ایک ہی سانس میں پی ڈالا اور پھر جلدی سے بولی۔

"ارے کک کس نے تمہیں آہ و پکار کہا ارے میں نے تو وقار کہا تھا وقار۔ دیکھو غصہ ٹھنڈا کرو ورنہ جوس مشین خراب ہو جائے گی۔" ارسل نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب! غصہ کا مشین خراب ہو جانے سے کیا لینا دینا؟" ارمین ایک دم غصہ بھول کر حیران ہو گئی۔

"جس طرح تم نے غصے میں ایک گلاس پیا ہے اگر یہ غصہ اسی طرح تم پر حاوی رہا تو تم کم از کم پچیس سے تیس گلاس تو پی جاؤ گی اور جوس مشین ایک وقت میں اتنی چلے گی تو خراب تو ہو ہی جائے گی۔" ارسل نے گلاسوں کا یوں حساب کتاب لگایا جیسے غلط ہو گیا تو اس کی نوکری ختم ہو جائے گی۔ ارمین کا پارہ اب واقعی چڑھ گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ ان کی تو تو میں میں شروع ہو جاتی کہ ارسل ایک دم پھر بولا۔

"کچھ مت بولنا۔ ریلیکس ہو جاؤ۔ میں سوچ رہا تھا کہ مال پلازہ سے جو تم نے سوٹ لیا ہے وہاں پر ایک اور سوٹ آیا ہے بڑا ہی کمال کا ہے تم پر کافی اچھا لگے گا۔ تو کیوں نا وہ میں تمہیں گفٹ کروں پر تم غصہ ہو رہی ہو۔" ارسل نے یوں کہا جیسے بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔

"ارے کون سا غصہ بھائی بہت کچھ کہتے ہیں بہنوں کو اس میں کیا ہے۔ بھائی جان آپ حکم کرو کوئی کام تھا آپ کو؟" ارمین سوٹ پر یوں لائن بدلی تھی کہ ارسل اس کی ایکٹنگ پر بے اختیار مسکرا دیا۔

"واہ بہن ہو تو ایسی۔" ارسل نے مسکرا کر کہا۔

"شکریہ بھائی جان۔" ارمین نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔

"اچھا تو ارمین غور سے سنو، مجھے ایک بہت ضروری کام ہے تم سے، پر خیال رکھنا کسی کو پتا نا چلے۔" ارسل نے ذرا آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ فکر نا کرو ارمین اپنی جان پر کھیل جائے گی مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گی۔" ارمین نے سر اونچا کر کے فخر سے کہا۔

"تمہیں ایک اولڈ ہوم میں جانا ہے۔ وہاں ایک لڑکی نوکری کرتی ہے اس سے ملنا ہے۔ اس کا نام صائمہ ہے وہ وہاں رکارڈ روم میں ہوتی ہے۔ تم اس سے جا کر ملو گی اور اسے کسی بھی طرح باہر لے کر آؤ گی۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" ارسل نے مختصراً کہا۔

"اس لڑکی سے آپ کو بات کرنی ہے، کون سی ضروری بات کرنی ہے اور کیوں کرنی ہے؟ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" ارسل کی بات ختم ہوتے ہی ارمین نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"اف! اتنے سوال وہ بھی ایک سانس میں۔ تمہیں سوٹ چاہیے نا کہ نہیں۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا۔

"سوٹ کیا ابھی دیکھنا کیا کچھ آتا ہے۔ ذرا رکو ابھی امی اور ابو کو بتا کر آتی ہوں۔ غضب خدا کا میں بھی کہوں آخر جمیلہ میں کیا برائی تھی۔ اب پتا چلا۔" ارمین نہ صرف پٹڑی سے اتر گئی تھی بلکہ اس نے جو امی ابو کو بتانے کی دھمکی تھی اس سے تو ارسل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"ارے پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ایسا کچھ مت کرنا ورنہ وہ بھی ایسا ہی سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایسا کچھ نہیں جیسا تم سوچ رہی ہو اور خبردار جو کسی کو کچھ بتایا۔" ارسل نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"چکر کیا ہے پہلے پوری بات تو بتاؤ نہ ذرا۔" ارمین نے گہری نظروں سے ارسل کی طرف دیکھ کر کہا کیونکہ ارسل نے ایسے کبھی منت نہیں کی تھی۔

"ارے کچھ نہیں میں بس اس کا ایک اچھے دوست ہونے کی حثیت سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں بس اور کچھ نہیں۔" ارسل نے گول مول سا جواب دیا۔

"خود کی مدد تو آج تک کر نہیں پائے دوسروں کی خاک کرو گے۔ کھل کر بتاؤ تا کہ بات سمجھی جا سکے ورنہ دوسری صورت میں کیس عدالت میں جائے گا۔" ارمین نے ایک کہا اور منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"ہاں ہاں بتاتا ہوں میری ماں، سنو۔" اور جواب میں ارسل نے سیاق و سباق بتا دیا۔

"بھائی آپ چاہے اچھا کرنے کی کوشش کر رہے ہو مگر زمانہ بہت تیز ہے۔ ضروری نہیں اس نے جو آپ سے کہا وہ سچ ہو۔ وہ سب جھوٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔ آج کل تو رواج ہے جھوٹ کا سہارا لے کر دوسروں سے ہمدردی حاصل کرنا اور پیسے بٹورنا۔" آپ کیوں اس چکر میں پڑھ رہے ہیں۔" ارمین نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ارمین! میرا دل کہتا ہے کہ وہ سب سچ ہے۔ اداکاری سے آنسو تو آ سکتے ہیں، چہرے پے ظلم سہے جانے کی ادا آ سکتی ہے، معصومیت آ سکتی ہے مگر ہچکیوں اور سسکیوں میں درد کا تانا بانا نہیں بنا جا سکتا۔ میں اس سے ملا ہوں اور میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔" ارسل نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

"کک کیا! آپ اس سے ملے ہو؟" ارمین کی تو جیسے آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔

"ہاں ملا ہوں اسی دن اس نے یہ سب بتایا۔" ارسل نے کہا۔

"پر آپ کرو گے کیا اس سے مل کر؟ اب وہ اپنی زندگی میں مگن ہے اسے رہنے دو۔ آپ اس سے مل کر اس کی کرب میں ڈوبی ہوئی زندگی واپس تو نہیں لا سکتے نا تو پھر ملنے کی وجہ کچھ سمجھ نہیں آ رہی؟ کہیں آپ......؟" ارمین کا مطلب محبت سے تھا اور ارسل سمجھ گیا تھا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میرا یقین کرو۔" ارسل نے ارمین کا شک دور کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی مگر میں پھر کہوں گی یہ بے وجہ کی نیکی گلے پڑ سکتی ہے۔" ارمین نے کہا۔

"میں صرف انسانیت کے ناتے چاہتا ہوں کہ اس کی کھوئی ہوئی زندگی تو دوبارہ نہیں مل سکتی مگر جو باقی ہے اسے تو آباد کیا جا سکتا ہے۔ گزرے ہوئے پل اگر خوشی نہیں دے پائے تو آنے والے پلوں

سے تو خوشی کا حق مانگا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں اس میں کامیاب ہو جاؤں تو۔" ارسل نے جواب دیا۔

"او کے میں جاؤں گی اگر وہ آنے پر رضا مند نہیں ہوتی اس کا میں کچھ نہیں کرسکتی۔" ارمین نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" ارسل نے جواب دیا۔

"میں جاؤں گی مگر......" ارمین بات کرتے کرتے ایک دم رک گئی۔

"مگر کیا؟" ارسل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں کوئی اتنی خاص بات نہیں بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ اگر سوٹ دو ہو جاتے تو اچھا تھا۔ وہ کیا ہے نا کام کافی خطرناک ہے۔" ارمین نے یوں کہا جیسے کسی ملک کی جاسوسی کرنی ہو۔

"کیا؟" یہ سن کر ارسل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"منہ تو بند کرو دو سوٹ ہی تو ہیں۔ بہن کو دیتے ہوئے دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ باہر نیکی کرنے کا بڑا شوق ہے گھر میں بہن پر دو روپے کی نیکی کرتے ہوئے جان کیوں نکل رہی ہے۔" ارمین نے گھورتے ہوئے کہا۔

"صحیح کہا تھا تم نے اس دور میں نیکی واقعی گلے پڑتی ہے۔" ارسل نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھلا میں نے کبھی غلط کہا ہے۔" ارمین نے کالر ذرا اوپر کو اٹھاتے ہوئے فخر سے کہا۔

"غلط انسان غلط کہہ بھی کیسے سکتا ہے۔" ارسل نے منہ میں ہی بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کچھ کہا کیا آپ نے؟" ارمین نے پوچھا۔

"نن نہیں تو۔ میں تو سوچ رہا تھا کس دن جایا جائے۔" ارسل نے چونکتے ہوئے بات کو بدل دیا۔

"ہاں جس دن جانا ہو بتا دینا بس اتنا یاد رکھنا زیادہ دیر تک سوٹ رہتے نہیں وہ کیا ہے نا لوگ لے جاتے ہیں تو میں سوچ رہی تھی کیوں نا ایک دن پہلے جا کر ہم خریداری کر لیتے۔" ارمین نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

"خریداری کر لیتے۔ ہونہہ۔ ارسل نے منہ چڑا کر اس کی بات کو دہرایا۔

"کچھ کہا کیا۔" ارمین کی مسکراتی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"ہاں میں کہہ رہا تھا واقعی ایک دن پہلے پلازہ ہو آنا چاہیے۔" ارسل نے معصوم سے لہجے میں کہا تو ارمین کی ہنسی نکل گئی سن تو اس نے بھی لیا تھا بس تنگ کرنے کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ارسل بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

ارسل نے جمعے کو ارمین کے ساتھ شاپنگ کی پھر ہفتے کی صبح صائمہ سے ملنے کا پروگرام رکھا۔ ارمین بہت سٹ پٹائی کے اتوار کا دن رکھو کیونکہ اسے ہفتے کو کالج سے چھٹی کرنی پڑی تھی اور ارسل اتوار کا دن رکھ نہیں رہا تھا کیونکہ اتوار کے دن وہاں کافی رش ہوتا تھا تو ملنا ذرا مشکل ہو جاتا۔ گیٹ پر پہنچ کر ارسل باہر رکا اور ارمین اندر گئی۔ تھوڑی ہی جانچ پڑتال کے بعد ارمین نے نہ صرف صائمہ کو تلاش کر لیا بلکہ وہ اسے باہر بھی لے آئی۔ ارسل انہیں آتا ہوا دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ جانے ارمین نے کیسے راضی کیا ہوگا؟ اتنے میں دونوں گاڑی کے پاس پہنچ گئیں۔

"چلو تمہیں پہلے گھر چھوڑ دوں۔" ارسل نے رسمی سلام دعا کے بعد ارمین سے کہا۔

"نہیں آپ لوگ جاؤ اور واپسی پر مجھے شمائلہ کے گھر سے پک کر لینا۔" ارمین نے کہا۔

"ٹھیک ہے اللہ حافظ۔" ارسل نے کہا۔ اتنے

میں صائمہ بیٹھ گئی تھی اور ارسل نے گاڑی اسی پارک کی طرف موڑ لی جہاں پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ ارسل نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور پھر دونوں پارک میں داخل ہو گئے مگر دونوں بدستور خاموش تھے۔

"اگر تمہیں بات نہیں کرنی تو بے شک نا کرو میں چلا جاتا ہوں بس مجھے ۱۷۳۵ روپے دے دو۔" ارسل نے انتہائی سنجیدگی سے صائمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا! ۱۷۳۵ روپے؟ مم مگر کس بات کے؟" صائمہ نے انتہائی حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارمین کو ساتھ لانے پر منایا اور اس کے لیے دو سوٹ دیے اور پھر وہاں شاپنگ پر اس نے آئس کریم کی بھی ڈیمانڈ کر دی وہ بھی کھلانی پڑی اور تقریباً اس سارے کام پر اور یہاں تک آنے میں دو لیٹر پیٹرول لگا اور ۳۵۰ روپے میری تکلیف کے جو میں نے اٹھائی تو کل ملا کر ہوئے ۱۷۳۵ روپے۔" ارسل نے چہرے پر گہری سنجیدگی سے پورا حساب کتاب کر کے بتا دیا۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا کہ یہ سب کرو بلا وجہ تکلیف کی تم نے۔" صائمہ نے روکھے سے لہجے میں کہا مگر صائمہ کا موڈ قدرے بہتر تھا جو ارسل سے چھپ نہیں سکا۔

"تم نے ہی کہا تھا۔ تم میرے خواب میں آئیں اور کہا ارسل سوری میں اپ سیٹ تھی اس لیے میں چلی گئی۔ میں جانتی ہوں تمہیں بہت برا لگا ہوگا۔ اس پر میں نے سوچا چلو دو سوٹ اور کچھ تکلیف اٹھا کر تمہیں سوری کہنے کا موقع دیا جائے۔ کب تک خود کو تنہائی میں ملامت کرتی رہو گی کہ ہائے کتنا شریف لڑکا تھا بلاوجہ اس سے لڑائی کی میں نے۔ دوستی کی تاریخ میں شرمندگی کا تاثر میرے کردار سے ہمیشہ کے لیے جڑ جائے گا۔ یہ سب دیکھا تو دل چاہا کہ تمہیں اس ندامت کی قید سے رہائی دلواؤں اور موصوفہ کو دیکھو احسان فراموش۔ ہونہہ۔" ارسل نے ساری بات کہہ کر آخر میں بالکل عورتوں کی طرح ہونہہ کیا تو صائمہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"اوہ! تم ہنستی بھی ہو۔ مجھے لگا یہ منہ صرف غبارے کی طرح پھولنے کے لیے ہے اور تمہارے دانت ہاتھی والے ہیں۔" ارسل نے مسکراتے ہوئے تجزیہ کیا۔

"ہاتھی والے مطلب؟" صائمہ کی ہنسی ایک دم غائب ہو گئی تھی یہ سن کر۔

"ارے وہ محاورہ ہے نا" ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور" تو مجھے لگ رہا تھا جو دانت تمہارے منہ میں ہیں تم ان سے صرف کھانے کا کام لیتی ہو اور ہنسنے کے لیے شاید تمہارے پرس میں کوئی الگ سے بتیسی ہو۔" ارسل نے کہا تو صائمہ ضبط کرنے کے باوجود پھر ہنس پڑی۔

"حد ہے پتا نہیں یہ الٹی سیدھی باتیں تمہارے دماغ میں آتی کہاں سے ہیں۔" صائمہ نے مسکرا کر کہا۔

"ارے یہ ذہانت کی نشانی ہے جو الٹا اور سیدھا دونوں پر سوچتے ہیں۔ کم عقل لوگ صرف الٹا ہی سوچتے ہیں۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا۔ ارسل اس دن والی بات پر چوٹ کی تھی جس کا غلط مطلب صائمہ نے لیا تھا۔

"سوری ارسل! میں اس دن واقعی نا جانے کیا کیا بول گئی۔ میری دوست نے بھی میری خوب کلاس لی اس بات پر اس نے بھی کافی لعن طعن کی۔ مجھے واقعی ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ پھر اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ تمہیں مل یا میسج ہی کردوں۔" صائمہ نے نظریں

چڑا کر شرمندگی سے کہا۔

"ارے میں مذاق کر رہا تھا میں نے بالکل برا نہیں منایا بس دل چاہا تھا کہ تمہیں شوٹ کر دوں یا پھر تمہارا سر پکڑ کے دیوار میں زور سے ماروں یا تمہاری ٹانگیں توڑ دوں۔ مگر یقین کرو برا بالکل بھی نہیں مانا۔" ارسل نے کہا تو صائمہ پھر ہنس پڑی۔

"شکر ہے تم نے برا نہیں مانا اور داد دینی چاہیے تمہاری اس فراخ دلی پر۔" صائمہ نے مسکرا کر کہا تو ارسل بھی ہنس پڑا۔

"شکریہ۔ ویسے بتایا تم نے پھر بھی نہیں کہ یہاں تک کیسے پہنچیں؟" وہ دونوں بیٹھ چکے تھے تو ارسل نے کوٹ کی جیب سے چپس کا پیکٹ نکال کر درمیان میں رکھ کر یوں کہا جیسے بچے کو ٹافی دے کر پوچھا جاتا ہے۔

"میری انگلش اچھی تھی کیونکہ انگلش میڈیم سکول میں پڑھی تھی۔ اتنے عرصہ دور رہنے کے بعد کچھ یاد تو نہیں رہتا مگر میری جو ہیڈ ہیں انھوں نے میری مدد کی تو کافی کچھ ذہن کے نہاں کھاتوں سے نکل کر سامنے آتا گیا۔ چاہے دن رات مار ہی کھائی تھی مگر تہذیب باقی تھی اور بات کرنے کا سلیقہ بھی۔ تو میری ہیڈ نے مجھے کمپیوٹر آپریٹنگ پروگرام سکھایا۔ ذہن بند تھا مگر ناکارہ نہیں سو محنت کے ساتھ جلد سیکھ گئی تو انھوں نے مجھے ریکارڈ روم میں رکھ لیا اپنے ساتھ اور میں تقریباً ان کی سیکرٹری بن گئی۔ فارغ وقت میں ان کا کام کرتی اور ڈیوٹی ٹائم میں اپنا کام۔ پھر ان کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور وہ یہ ادارہ چھوڑ گئیں تو اللہ پاک نے عزت دی اور مجھے یہاں کا کام سونپ دیا گیا۔ گو کہ میں ان کی طرح ہیڈ تو نہیں مگر کام سارا وہی ہے۔ ہمیں اپنا سارا ریکارڈ مینٹین کرنا ہوتا ہے اور پھر اپنی ہیڈ برانچ کو ڈیلی ڈیٹا بھیجنا بھی ہوتا ہے تو نیٹ بھی اسی لیے لگا ہوا ہے۔" ارمین نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا تھا تم چپس دیکھ کر اتنے آرام سے سب بتا دوگی ورنہ اس دن دو پیکٹ بھیج کر پوچھتا۔" ارسل نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اکیلے رہ کر گھنٹوں خلاء میں گھورنا جانے عادت بن چکی تھی یا مشغلہ نہیں پتا، مگر میری ہیڈ نے مجھے نیٹ پر بات کرنے کو کہا کہ کچھ دوست بنیں گے تو اچھا محسوس کروگی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجھے اس نیٹ کی دنیا کی سب خرافات بھی بتا دیے۔ الغرض انھوں نے میری بہت مدد کی ارسل! یہ سب کچھ انھی کی وجہ سے ہے۔" صائمہ کا لہجہ پرتشکرانہ تھا۔

"اور تمہیں پتا ہے انھوں نے ہی کہا تھا تو تم سے بات شروع ہوئی تھی۔" صائمہ نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ! شکریہ ادا کرنا میری طرف سے اس احسان عظیم کا۔" ارسل نے کہا تو صائمہ اس انداز پہ ہنس پڑی۔ کیونکہ لہجہ بڑا عجیب تھا ارسل کا۔

"تم بات بات پر چڑتے کیوں ہو؟" صائمہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں عادت سی ہو گئی ہے ایسے بات کرنے کی۔ گھر میں میرا اور ارمین کا ایسے ہی تماشا لگا رہتا ہے۔" ارسل نے جواب دیا۔

"ارسل ایک بات کہوں غلط مت سمجھنا۔ اس دن تمہارے ساتھ بیٹھ کر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ یوں جیسے سکون سا مل گیا ہو۔" صائمہ نے کہا۔

"صائمہ بات کرنے سے دل کی بات زبان پر لانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ جو ماہر نفسیات ہوتے ہیں ان کے پاس جب کوئی مریض آتا ہے تو وہ کچھ چھپاتا نہیں اور سب کچھ کہہ ڈالتا ہے اور سب کہنے پر وہ پچاس فیصد تو ویسے ہی صحیح ہو جاتا ہے اور پھر کچھ انسٹرکشن اس میں مزید بہتری لاتے ہیں۔ ہر انسان کو کوئی ایسا اپنا ضرور چاہیے ہوتا ہے جس سے وہ بے جھجک ہو کر سب کہہ سکے۔ وہ اپنا کچھ نہ بھی کہے صرف پوری نیک نیتی کے ساتھ اس کی بات سن لے اس کی دل جوئی کر لے یہ بھی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔" ارسل نے کہا۔

"مجھے لگتا تھا میری آنکھوں کے سمندر خشک ہو چکے ہیں مگر اس دن معلوم ہوا کہ وہ درد سے خاموش تھے سوکھے نہیں تھے۔" صائمہ نے کہا۔

"صائمہ! آنکھوں کی بھی عجیب کہانی ہے جب کوئی نہیں ہوتا تو جلد صبر کر کے خاموش ہو جاتی ہیں مگر جب کوئی اپنا یا کوئی ایسا ملتا ہے جو یہ آنسو پونچھ سکے تو اور شدت سے بہتی ہیں۔ اندر کی خاموشی چاہے کیسی بھی ہو انسان کو اندر ہی اندر کھاتی ہے اور یہ سکوت تب ہی ٹوٹ سکتا ہے جب کوئی اپنا ہونے کا ثبوت دے جیسے ہی دل کو کسی اپنے کے ہونے کا احساس ہوتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ پھر سب کچھ بتا دے۔ جیسے خوشبو ہوا میں سما جاتی ہے اسی طرح سب راز انسان کسی اپنے کو بتا کر پرسکون ہو جاتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کوئی اپنا نہیں ملتا۔ کبھی کبھی وہ دکھ سکھ جو انسان بانٹتا ہے وہ اس کے زخموں کا مداوا بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ ہی باتیں اس کی کمزوری۔" ارسل نے کہا۔

"زخموں پر اختیار کہاں ہوتا ہے ارسل!" صائمہ نے درد بھری مسکراہٹ سے کہا۔

"ہوتا ہے صائمہ ہوتا ہے۔ تقدیر ان کی بنتی ہے جو تقدیر کے بننے کا انتظار نہیں کرتے۔ جو اپنے زخموں کو اپنی زندگی کا ناسور نہیں بناتے۔ وہ جب گرتے ہیں تو پھر سے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ اٹھتے ہیں اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں، کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ تقدیر کا اختیار ایسے ہی انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔" ارسل نے جواب دیا۔

"کیسا اختیار؟ میں نے تو آج تک سب اختیار ان کے پاس ہی دیکھے ہیں جنہیں زندگی بچپن سے ہی گلے لگا کر ملتی ہے نا کہ ان لوگوں کے پاس جو جیتے تو ہیں مگر انھیں احساس ہی نہیں کہ کیا کرنا ہے؟ تو اختیار ایک جیسا کیوں نہیں ہوتا سب کے پاس؟ انسانوں کی تو تقسیم ہو چکی اب یہ اختیار بھی تقسیم ہو چکا ہے۔ یہ سب کتابی باتیں ہیں ارسل! وگرنہ اگر اختیار ہوتا تو گزرے برسوں میں ایک بار تو اس کا چہرہ دیکھا ہوتا۔" صائمہ کو جیسے غصہ آ گیا تھا۔

"دیکھو صائمہ! حادثات ہماری تقدیر کا حصہ ہوتے ہیں مگر اسی ایک حصہ کو زندگی بنا کر جینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ تمہارے حادثات تمہاری تقدیر کا حصہ تھے وہ آئے اور چلے گئے مگر تم میں ابھی زندگی باقی ہے احساس باقی ہے ابھی کچھ ایسا نہیں جو ختم ہو چکا ہو۔ گزرے ہوئے وقت نے اگر اختیار چھین لیے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم آنے والے کل کو بھی ایک قیدی کی طرح گزار دو۔ تمہارے پاس تمہارے اختیار واپس آ چکے ہیں اب ان کا استعمال کرو۔ اب کھل کر جیو جیسا تم جینا چاہتی ہو۔" ارسل نے کہا مگر صائمہ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموش ہو گئی تھی اور اپنی خالی نظروں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ جینے کی اب بھی کوئی وجہ ہو گی کیا؟

"دیکھو میں مانتا ہوں کہنا آسان ہوتا ہے اور سمجھنا مشکل، مگر میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اب اگر

وہ حالات نہیں تو ان حالات کا ماتم اپنے چہرے پر سجا کر تمہیں نہیں جینا چاہیئے۔ خود کو بدلو زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ زندگی کو پھر سے اپنا کر دیکھو ابھی بہت کچھ ہے جو کرنے والا ہے۔" ارسل نے صائمہ کی زندگی میں امنگ جگاتے ہوئے کہا کہ شاید کوئی آرزو اسے پھر سے جینے پر رضامند کرلے۔

"ہاں کوشش کر رہی ہوں۔" صائمہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا کوشش کر رہی ہو۔ تمہاری شکل جس پر نہ جانے کب سے بارہ بجے ہیں اگر اس وقت تمہاری تصویر اتار کر میں امریکہ اور بین الاقوامی N.G.O کو بھجوا دوں تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بنا کسی شرط کے امداد دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔" ارسل نے منہ بنا کر کہا اور صائمہ اس بات کے ساتھ ساتھ ارسل کے سٹائل پر بے اختیار مسکرا دی۔ ارسل چاہتا تھا کہ ماحول زیادہ دیر تک سنجیدہ نا رہے ورنہ صائمہ زچ ہو جائے گی باتوں سے اور پھر اسے کچھ بھی کہنا اور سمجھانا فضول ہوگا۔

"ارسل! تمہیں لگتا ہے کہ مجھے ایسے رہنا اچھا لگتا ہے ایسا نہیں میں بہت کوشش کرتی ہوں۔ خود کو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگا کر رکھتی ہوں تا کہ ماضی کا کوئی دریچہ میرے ذہن میں پھر سے نہ کھل سکے مگر سوچ کے کینوس پر نا چاہتے ہوئے بھی خیال کوئی نہ کوئی ماضی کا عکس بنا دیتا ہے اور میں پھر سے مجبور ہو جاتی ہوں۔" صائمہ نے انتہائی مایوس لہجے میں کہا۔

"ایسا ہوتا رہے گا اور تب تک ہوتا رہے گا جب تک تم خود پر اپنے ماضی کے دروازے بند نہیں کرتیں۔ تم ایک طرف ان دروازوں کو کھول کر بھی رکھتی ہو اور یہ بھی چاہتی ہو کہ ان دروازوں کے پار تمہیں کچھ دکھائی نہ دے۔ ایسا نہیں ہوسکتا انھیں بند کرو اور مستقبل کے دروازوں کو خود پر کھولو تا کہ ان دروازوں سے زندگی ایک نئی تازگی لے سکے، نئی امنگیں لے سکے، نئی سوچ لے سکے ورنہ تمہاری سب کوششیں بے کار ہوتی جائیں گی۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کچھ لوگ زندگی کو گزارتے ہیں اور کچھ لوگوں کو زندگی گزارتی ہے تم خود سے زندگی گزارو زندگی کو خود سے مت گزارنے دو۔" ارسل نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"شاید تم اپنی جگہ صحیح کہہ رہے ہو۔" صائمہ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

"شکر ہے تم مانیں تو کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ویسے شرم کرو مجھے باتوں میں لگا کر خود ساری چپس ختم کر ڈالی۔" ارسل نے مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کہا اور صائمہ مسکرا دی جب کہ ختم کرنے والا وہ خود تھا۔

"اب آگے سے مسکراؤ مت۔ خود تو کچھ کھلاتی نہیں ہو اور میری بھی چپس ختم کر دی اور بجائے اس کے کہ شرمندہ ہو دانت نکال رہی ہو۔" ارسل اسی انداز میں کہا۔

"سوری میں کچھ کھلا نہیں سکتی۔ مجھے تنخواہ نہیں ملتی۔ کھانے پینے کا اور رہنے کا سارا انتظام انہیں کا ہوتا ہے اس لیے......" صائمہ واقعی میں ایسے لگ رہی تھی جیسے اسے بہت شرمندگی ہوئی ہے ارسل کی بات سن کر۔

"اف! ارے میں مذاق کر رہا تھا تم تو سیریس ہوگئیں۔ ارے میں جانتا ہوں بس تمہیں تنگ کر رہا تھا مگر تم تو بات پر بات ایسے سیریس ہو جاتی ہو جیسے میرے استاد بچپن میں میرے سبق یاد نہ کرنے پار سیریس ہوتے تھے۔" ارسل نے ماتھا پکڑ کر کہا تو صائمہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"پتا نہیں کیا کھاتے ہو۔ جانے کہاں سے اتنی باتیں تمہارے ذہن میں آتی ہیں؟ کہاں کی کہاں بات لے جاتے ہو۔" صائمہ نے کہا۔

"جھوٹ کیوں بولتی ہو دیکھو بس تین یا بہ مشکل چار انچ کی ہوگی میری کھوپڑی کہو تو دکھاؤں۔" ارسل نے معصوم سا منہ بنا کر کہا۔

"تم سچ میں پاگل ہو۔" صائمہ واقعی میں پوری طرح سے زچ ہو چکی تھی۔

"اسے پاگل پن نہیں انصاف پسندی کہتے ہیں۔ جو ہے وہ مانوں جو نہیں ہے وہ کیوں مانوں اور ویسے بھی......" ارسل پھر سے وضاحت دے ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دیکھا ارمین کا فون تھا۔

"ارے کیا ہوا؟ اتنی جلدی تنگ آ گئے شمائلہ کے گھر والے۔ ارے ان کو بتانا تھا پچھلے چوبیس سال سے ہم بھی جھیل رہے ہیں۔" ارسل نے فون اٹینڈ کرتے ہی کہا اور ساتھ بیٹھی ہوئی صائمہ کی پھر سے دبی دبی ہنسی نکل گئی اور ارسل بھی مسکرا پڑا۔

"یہ تو میں گھر آ کر بتاتی ہوں ابھی اگر آپ خود کو پروفیسر ثابت کر چکے ہوں تو آجاؤ گھر چلیں۔" ارسل نے صائمہ کو جواب سنانے کے لیے لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کر دیا تھا۔ ارمین کا جواب سننا تھا کہ صائمہ کی پروفیسر والی بات پر ہنسی چھوٹ گئی اور ارسل بے اختیار سر کھجانے لگا۔

"آ رہا ہوں، آ رہا ہوں۔" اور اسے کوئی بات نہیں آئی تو آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

"ویسے جواب کافی اچھا دیا ہے اس نے۔" صائمہ ابھی تک ارمین کی بات سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"ہاں میرے خلاف جو تھا اچھا تو لگے گا تمہیں۔ پوری دنیا ہی میری دشمن ہے۔ چلو چلیں۔" ارسل نے

جھلا کر کہا۔ تو صائمہ نے جلدی سے اپنا بیگ پکڑا اور کھڑی ہو گئی اور دونوں گاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔

☆......☆......

"صائمہ! تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں دوست ہی سمجھتا ہے۔" صائمہ کی دوست راشدہ نے پوچھا؟

"ہاں! وہ صرف دوست ہی سمجھتا ہے اور میں بھی دوست ہی سمجھتی ہوں۔ اب مزید فالتو کی بکواس نہیں کرو۔ صائمہ رات کو کام سے فارغ ہوئی تو اس نے راشدہ کو پوری تفصیل بتائی کیونکہ راشدہ جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھی اور جب سے اس نے پوری بات سنی تھی تب سے اسے شک ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

"میرا نہیں خیال، مجھے لگتا ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" راشدہ نے آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

"ایسا کچھ نہیں بس دل کا اچھا ہے۔ خیال کرنا جانتا ہے دوست ہونے کا حق ادا کرنا چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔ تم اپنے ذہن پر اتنا زور نہ ڈالو ورنہ مزید الٹا سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب کیا ہوا پھر؟" راشدہ کی سوئی ابھی تک وہی اٹکی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں اور اگر اس کی نیت میں ذرا بھی فتور ہوتا تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"نیت میں فتور کیسا تمہیں چاہنا گناہ ہے کیا؟" راشدہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"راشدہ! بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو کسی دوسرے کو اپنی غرض سے نہیں بلکہ اسی کی غرض سے ملتے ہیں اور اچھا دوست شاید اسی کو کہتے ہیں اور رہی بات میری تو مجھے پسند کرنا واقعی گناہ ہے کیونکہ میں کسی کو بھی اپنانے کے لیے بالکل تیار نہیں۔" صائمہ نے دو ٹوک بات کی تاکہ راشدہ کا دماغ مزید نہ گھومے۔

"حد ہے۔ وہ شریف ہے اچھا انسان ہے۔ کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ تو پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کیوں نہیں اپناؤ گی؟ ارے ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ کیوں پاگل پن کر رہی ہو۔" راشدہ نے کہا۔

"کوئی تکلیف نہیں بس کہا نا کہ نہیں کرنی شادی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تمہیں کرنی ہے تو بتا دو۔" صائمہ نے جھلا کر جواب دیا۔

"ارے سمجھو یار! ذرا غور کرو۔ گاڑی ہے تو گھر بھی اچھا ہو گا۔ تربیت سے لگتا ہے کہ والدین بھی اچھے ہوں گے اور اگر نا بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے بوڑھے ہیں کب تک جئیں گے۔ بہن کی منگنی ہو چکی ہے۔ کچھ دن کے بعد شادی بھی ہو جائے گی اور پھر گھر پر تمہارا راج ہو گا صائمہ! تمہارا راج۔ تم سچ میں عیش کرو گی عیش۔" راشدہ نے دو منٹ میں پورا نقشہ کھینچ ڈالا تھا۔ دل کی بری نہیں تھی بس جو منہ میں آتا تھا کہہ دیتی تھی پھر اچھا ہو یا برا اس کی بلا سے۔

"کتنی اچھی سوچ ہے تمہاری۔ دل کرتا ہے کوئی چیز اٹھا کر تمہارے سر کے شایان شان کروں۔" صائمہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں صائمہ! ارے گزرے ہوئے حالات کو دیکھو اور ارسل سے شادی کے بعد والے حالات دیکھو۔ زمین اور آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے اور تم جانے کیوں سمجھ نہیں رہیں۔" راشدہ کی سوئی اب بھی وہیں کی وہیں تھی۔

"تم چاہتی ہو کہ اپنی ماضی کی تلخیوں کا ازالہ میں اس انسان کے دل سے کھیل کر کروں جو مجھے زندگی

کی طرف واپس لانا چاہتا ہے صرف اس غرض سے کہ وہ دل کا اچھا ہے۔ عیش و عشرت مل جائے بدلے میں کوئی جان سے جاتا ہے تو بھلے جائے۔ یہ انسانیت ہے؟ میں نے کہا نہ اب اس پر کوئی بات نہ کرنا پلیز۔" صائمہ کو غصہ آ گیا تھا۔

"یہ ہی دنیا ہے اور ایسے ہی اس کے دستور ہیں اگر اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرنی ہیں تو اس دور میں یہ راستا کسی اور کی خوشیوں کے خون سے ہو کر جاتا ہے۔ جیسے تمہاری خالہ نے کیا تھا۔" راشدہ نے بھی غصے سے کہا مگر غصے میں وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گئی اور یہ سن کر صائمہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا قسم سے۔" راشدہ اٹھی اور اس نے اپنی عادت کے مطابق جلدی سے اپنی غلطی تسلیم کر کے فوراً معافی مانگی۔

"اچھا سوری۔ اب کوئی بات نہیں کروں گی۔ جیسا تم چاہتی ہو ویسا کرو۔ میں بالکل نہیں بولوں گی۔ پلیز معاف کر دو۔" راشدہ کی حالت اس سے بھی خراب ہو رہی تھی۔

"ارے کوئی غصہ نہیں کیا میں نے۔ چل سو جا بہت دیر ہو گئی ہے۔" صائمہ نے جبراً مسکرا کر کہا اور راشدہ بھی جلدی سے اٹھ گئی شاید نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

"ہاں تو بھی سو جا اب بہت دیر ہو گئی ہے۔" راشدہ نے کہا اور وہ اپنے بستر پر چلی گئی اور صائمہ کی آنکھوں میں پھر سے وہ سب منظر گھوم گئے جن کو نہ سوچنے کا وعدہ وہ اکثر خود سے کرتی تھی۔ ماضی کی تلخیاں کتنی وفاداری سے مرتے دم تک ساتھ نبھاتی ہیں۔

☆......☆......

"بھائی! سچ سچ بتاؤ آپ دل ہی دل میں اسے پسند کرنے لگے ہو نا؟ مذاق مت کرنا مجھے سنجیدگی سے جواب دو اس بات کا۔" ارمین ارسل کے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے کافی دنوں سے احساس ہو رہا تھا کہ ارسل کے دل میں کوئی اور کہانی جنم لے چکی ہے اور اس دن صائمہ کو دیکھ کر جس طرح اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی تھی وہ ارمین سے چھپی نہ رہ سکی۔ تو آج اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ارسل سے سب پوچھ کر ہی دم لے گی اور بات مذاق میں نہیں اڑنے دے گی۔

"ارمین دل میں اکثر ایسے بھی سوال ہوتے ہیں جن کا جواب دل کے پاس ہوتا ہے مگر وہ انجان سا بن کر ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں بھی اس پر نہیں سوچنا چاہتا کیونکہ مجھے واقعی نہیں پتا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں یا نہیں۔ یہ پتا ہے کہ اس سے بات کرتا ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ وہ ہنستی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی تیر مار لیا ہو۔ اس کو مسکراتا ہوا دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اس سے مل کر سکون ملتا ہے مگر یہ نہیں پتا کہ اسے پسند بھی کرتا ہوں یا نہیں؟" ارسل نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو پتا نہ ہو جب کہ ساری باتیں کسی کو چاہنا ہی ثابت کرتی ہیں۔" ارمین نے باقاعدہ دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں کرتی ہیں مگر میں نے کہا نہ کہ میں اس پر سوچنا نہیں چاہتا ہر سوال کا جواب ملنا اچھا نہیں ہوتا کچھ سوال ان کہے رہ جائیں تو اپنے پیدا کردہ مفروضات سے دل کو تسکین ملتی رہتی ہے۔" ارسل نے جواب دیا۔

"بھائی! پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہو میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ موم ڈیڈ سے بات کرو تو وہ

باخوشی مان جائیں گے۔" ارمین نے کہا۔
"نہیں کہا نا میں ایسا نہیں چاہتا ارمین! میرا دل نہیں چاہتا کہ میں ایسا کروں۔" ارسل نے جواب دیا۔
"کیوں دل جب ساتھ رہنے پر خوش ہے بات کرنے پر خوش ہے تو پھر یہ سب کیوں نہیں ہوسکتا؟" ارمین نے پوچھا۔
"انسان کبھی کبھی اپنے ہی دل کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے میں نے اکثر دل سے پوچھا ہے وہ خاموش ہے جیسے وہ بھی چاہتا ہے کہ اس بات کا جواب اس سے نا پوچھا جائے اور دماغ سے پوچھتا ہوں تو دماغ کہتا ہے کہ تم نے اچھا دوست بن کر اسے زندگی دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب یہ پیار محبت کے کھیل سے اس کا اعتماد مت توڑو۔ برسوں کے بعد اسے کوئی اپنا ملا ہے اسے پھر سے اکیلا مت کرو۔ اگر یہ محبت ہے تو اسے اپنے تک رکھو اور اگر یہ دوستی ہے تو اسے اچھے برے وقت میں ساتھ نبھانے کے لیے قائم رکھو اسے تمہاری ضرورت ہے۔ اب میں کس کی سنوں۔" ارسل نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
"تو یہ کام تو آپ اسے اپنا کر مزید بہتر طریقے سے کر سکتے ہو شادی اسے بھی کرنی ہے شادی آپ کو بھی کرنی ہے وہ آپ کے ساتھ خوش ہے۔ آپ اس کے ساتھ خوش ہو پھر یہ اتنا الجھاؤ کس لیے پیدا کر رہے ہو۔" ارمین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ارسل چاہتا کیا ہے؟
"میں نے وہ خوشی دوست بن کر دی ہے اب محبت کا روپ دے کر وہ خوشی ختم نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ بھی مجھے اچھا دوست ہی سمجھتی ہے اور کچھ نہیں۔ اپنی خوشی کی خاطر میں اسے پھر سے اسی گرداب میں نہیں چھوڑنا چاہتا جہاں سے میں اسے نکالنے کے لیے کوشش کرتا رہا ہوں۔" ارسل نے جواب دیا۔
"تو وہ آپ کو دوست سمجھتی ہے اور آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ ٹھیک کہا نہ میں نے۔" ارمین نے پوچھا؟
"نہیں۔ ارمین! میں نے کہا نا کہ میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا کہ میں اسے کیا سمجھتا ہوں بس مجھے اتنا پتا ہے کہ میں دوست رہوں تو اچھا ہوگا اس کے لیے بھی اور شاید میرے لیے بھی۔" ارسل نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔
"تو آپ انکار سے ڈرتے ہیں؟" ارمین نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا؟
"نہیں انکار سے تو تب ڈروں جب اقرار کی کوئی صورت ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ دل کی خاموشی اور دماغ کا الجھاؤ یہ چاہتا ہے کہ جو رشتہ بنا ہے وہ ہی بنا رہے تو اچھا ہے اور میں اس فیصلے پر متفق ہوں۔" ارسل نے یوں کہا جیسے وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا ہو۔
"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی مگر یاد رکھنا بعد میں اس پر کوئی پچھتاوا مت کرنا۔ آج وقت آپ کے ہاتھ میں ہے کل کو شاید نا رہے؟" ارمین نے قائل کرنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں پچھتاوا وہاں ہوتا ہے جہاں فیصلہ رضامندی سے طے نا ہو اور مجھے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔" ارسل نے مسکرا کر کہا۔
"ٹھیک ہے جیسے آپ خوش۔ پھر بھی اگر آپ کا فیصلہ بدلے تو اتنا یاد رکھنا کہ مجھے خوشی ہوگی کیونکہ مجھے خود وہ بہت اچھی لگی ہے۔" ارمین نے مسکراتے ہوئے کہا اور ارسل بھی مسکرا دیا۔
"او کے میں چلتی ہوں۔ گڈ نائٹ اینڈ بیسٹ

آف لک۔" ارمین نے کہا اور کمرے سے چلی گئی اور ارسل نے بھی خیالوں کو زیادہ وقت نہیں دیا کہ اس کے فیصلے کو متزلزل کر سکیں اور وہ بھی سو گیا۔

☆......☆......

ادھر صائمہ کا بھی تقریباً ایسا ہی حال تھا جو ارسل کا تھا۔ وقت ساتھ گزارنا دونوں کو ہی اچھا لگتا تھا مگر وقت کو سمجھنا شاید دونوں ہی نہیں چاہتے تھے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود کبھی کبھی ہم اندھا بننا پسند کرتے ہیں بلکل اس کبوتر کی طرح جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے یہ سوچ کر کہ بلی نہیں ہے۔ دونوں ہی اپنے رشتۂ دوستی کو بچانا چاہتے تھے اس بات سے بے خبر کہ ان کی زندگی داؤ پر لگ چکی ہے جس رشتے کو وہ بچانا چاہتے تھے وہ تو اور مضبوط ہوسکتا تھا۔ دونوں نے جب بات کا آغاز کیا تھا تو دونوں کا یہ موقف تھا کہ یہ صرف ایک اچھی فرنیڈ شپ ہوگی اور کچھ نہیں اور اگر کوئی اس سے آگے گیا تو رشتہ ختم۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی مگر اب دونوں کو اپنی بات کا بھرم رکھنا تھا۔ ان کی حالت کچھ کچھ اس شعر کی طرح لگ رہی تھی۔

انجام وفا دیکھا تو چاہت کا اقرار کبھی نہ کر سکے
میں بھی کچھ خائف تھا دل بھی کچھ کچھ ڈرتا تھا

صائمہ کو بھی لگتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کچھ سوچا تو ارسل کو یہ لگے گا کہ میں اس کی ہمدردی کو محبت سمجھنے لگی ہوں اور اس نے تو میرے ساتھ نیکی کرنے کا سوچا تھا اور میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ جس انسان نے میرے لیے اتنا کچھ کیا اب اس کے سر پر مزید احسان کا ٹوکرا رکھ دوں یہ کہہ کر تم سے بہتر کوئی نہیں سمجھے گا۔ نہیں یہ غلط ہے بالکل غلط ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اس کی زندگی خراب کروں اس کا اعتماد اس طرح توڑنا ناانصافی ہے۔ وہ مجھے اچھا دوست سمجھتا ہے اور میں اسے کیا سمجھ رہی ہوں خود کو کتنا گرا ہوا محسوس کروں گی جب وہ یہ کہے گا کہ صائمہ میں نے تو صرف دوست ہونے کے ناتے اپنا فرض ادا کیا اور تم کیا سمجھنے لگیں۔ تم دوستی کے نام کو بدنام کر رہی ہو۔ نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ دل و دماغ کی جنگ میں جیت کسی کی بھی ہو ہار پھر بھی اپنے ہی حصے میں آتی ہے۔
آخرکار صائمہ نے بھی فیصلہ کر لیا کہ ہم اچھے دوست ہی رہیں تو اچھا ہے۔ رات کو جب صائمہ فارغ ہوئی تو اس نے مینیجر سائن ان کیا تو ارسل آن لائن تھا۔ دونوں کی چار یا پانچ دن کے بعد ملاقات ہو رہی تھی کیونکہ دونوں ہی اسی اضطراب میں تھے کہ اس رشتے کو اب کیا نام دیا جائے اور دونوں ہی آن لائن نہیں ہو سکے تھے۔ سلام دعا کے بعد ارسل نے پوچھا۔
"سوری میں ذرا مصروف تھا تو کچھ دنوں سے آن لائن نہیں آسکا۔" ارسل نے کہا۔
"اوہ سوری کی کوئی ضرورت نہیں میں بھی کام کے لوڈ کی وجہ سے نہیں آسکی تھی پچھلے چار دنوں سے۔" صائمہ نے جواب دیا۔
"اوہ اچھا۔ تو کیا ارادہ ہے اب آگے کا؟ کیا کرنے کا سوچا تم نے؟" ارسل نے پوچھا۔
"میں نے سوچا ہے کہ اب میں یہاں ہی کام کروں گی۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے یہاں کام کر کے۔ کہیں تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی میرے ماضی کی وجہ سے ہے یا میں اداس ہوں۔ بلکہ میں نے سوچا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کام ہوگا۔ اصل عبادت تو یہ ہی ہے کہ انسان کسی انسان کے کام آسکے اور میں تو یہ کام بہت آرام سے کر سکتی ہوں اس لیے کہ کوئی

آگے ہے اور نا کوئی پیچھے۔ اسی کام کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس میں مزید بہتری لاؤں گی کچھ ایسا کرنے کا اب شوق ہے کہ یہاں جو لوگ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں ان کے باقی ماندہ دن خوشیوں سے بھروں۔ کچھ ایسا کرنے کو دل کرتا ہے اب اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ شکریہ کہ تم نے کچھ کرنے کا جذبہ دلایا مجھے۔" صائمہ نے کہا۔

"نہیں شکریہ کیسا یہ میرا فرض تھا اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے کچھ کرنے کا سوچا۔ واقعی اس سے بڑھ کر کون سا کام ہو سکتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ان میں اپنے والدین نظر آتے ہیں اسی لیے تم اب یہاں رہ کر ان کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو جو تقریباً اچھا ہی ہے مگر مزید بہتری لائی جا سکتی ہے۔ اچھا ہے سوچو اور جہاں تک بس چلے کر گزرو اور میری جہاں بھی تمہیں ضرورت محسوس ہو میسنجر کے چراغ کو رگڑنا میں جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔" صائمہ اس بات پر مسکرا دی اور اسے خوشی بھی ہوئی اس بات پر۔

"ہاں! شاید تم نے صحیح کہا مجھے واقعی ان میں اپنے والدین دکھائی دیتے ہیں اور پھر تمہیں نہیں بلاؤں گی تو اور کیسے بلاؤں گی۔ میرا اب یہاں اپنی دوست راشدہ اور تمہارے علاوہ ہے ہی کون۔" صائمہ نے کہا۔

"بس اتنا یاد رکھنا اب کی بار جب بھی آؤں گا تو تمہیں ٹریٹ دینی پڑے گی۔ اب کی بار فری میں کچھ نہیں ہوگا۔" ارسل نے کہا۔

"ہاں بابا دوں گی جو کہو گے ٹریٹ دوں گی۔" صائمہ کا دل چاہا کہ لکھ دے تم کہو تو سہی ایک بار میں تو اپنا آپ تک دینے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے روکے رکھا خود کو کیونکہ فیصلہ بہرحال ہو چکا تھا۔ جو ممکن نہیں اس کی حسرت دل میں پالنا خود کو اذیت دینے کے مترادف تھا۔

کاش کسی ناول کی طرح کوئی ہمیں ملا سکے۔ مگر اصل زندگی میں تقدیر کسی کی کہاں سنتی ہے کہ بدلی جا سکے۔ صائمہ نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

جب دو دل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اظہار بھی نا ہو پائے تو آہستہ آہستہ یہ رشتہ تکلیف دینے لگتا ہے۔ آئے دن کی ملاقات پھر سے وہی سُر چھیڑنے لگتی ہے جسے گنگنانے پر سوز کے سوا کچھ نہیں ملتا ہے، دل میں پھر سے خواہش جاگ اٹھتی ہے، ملنے کی تڑپ جاگ اٹھتی ہے، کبھی جذبے جاگ اٹھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمت والوں کی جب تک ہمت ساتھ دے وہ بھی ساتھ رہتے ہیں مگر جہاں کمزور دل ہوں وہاں کچھ بعید نہیں ہوتا کہ کسی دن سب فیصلوں اور رشتوں کو توڑ کر دل اپنی من مانی کرنے پر تل جائے۔ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے

آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا

تمناؤں کا یہ سفر زندگی کے سمندر میں راستے بدلتا رہتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی جو سفر ہم اپنی طرف سے ختم کر لیتے ہیں وہ پھر سے کسی نئی طرز میں کسی نئے انداز میں شروع کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہ ہی زندگی ہے جسے سمجھنا مشکل ہے جسے پڑھنا مشکل ہے۔ جسے گزارنا مشکل ہے۔

ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر اب ایک نئی تلخی سے جینا ہوگا۔ واہ رے زندگی۔ صائمہ نے چیٹ کلوز کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں خود کلامی کی۔

منزل پر پہنچے تو یہ احساس ہوا
تھی آرزو جس کی یہ وہ جگہ نہیں

☐